سلسلۂ ندوۃ المصنفین دہلی
(۱۱۶)

مآثر و معارف

یعنی

پچیس ۲۵ مقالات کا مجموعہ

جن میں تدوین حدیث و علوم حدیث کی تاریخ ۔ کتب حدیث و فقہ کا تعارف ۔ اسلامی علوم کا تعلیمی ارتقاء ۔ مسلمانوں کی علمی سرگرمی ۔ یورپ میں اسلامی علوم و فنون کی ترویج اور کئی اسلامی شخصیات اور علمی کتابوں کا حال وغیرہ مستند طریقے پر درج ہے

از
مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

ندوۃ المصنفین جامع مسجد دھلی ۶

سلسلہ ندوۃ المصنفین دہلی ۶

(۱۱۶)

مآثر و معارف

(یعنی پچیس ۲۵ مقالات کا مجموعہ)

جن میں تدوینِ حدیث و علومِ حدیث کی تاریخ، کتبِ حدیث و فقہ کا تعارف، اسلامی علوم کا تعلیمی ارتقاء، مسلمانوں کی علمی سرگرمی، یورپ میں اسلامی علوم و فنون کی ترویج اور کئی اسلامی شخصیات اور علمی کتابوں کا حال وغیرہ

مستند طریقے پر درج ہے

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

مؤلف کا شجرہ نسب = (دیکھو ص ۳۶۱ کتاب ہذا)

ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

محرم الحرام ۱۳۹۱ھ
مطابق
مارچ ۱۹۷۱ء

قیمت مجلد ______ نو روپے
قیمت غیر مجلد ______ دس روپے
15/-

کتابت ______ وجیہہ کتابت بورڈ رامپور
مطبوعہ ______ یونین پریس دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

مآثر و معارف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

"ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" "عرب وہند عہدِ رسالت میں اور" اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ" کے بعد قاضی صاحب کی یہ چوتھی تالیف ہے جو "ندوۃ المصنفین" سے شائع ہورہی ہے، عام رواج کے مطابق کسی مؤلف کے متفرق مضامین کی یکجا اشاعت کا اہتمام اُس وقت کیا جاتا ہے جب وہ تصنیف وتالیف کے دشوار گزار مرحلوں سے گزر کر بحیثیت مصنّف شہرتِ عام کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے، اس لحاظ سے دیگر خصوصیات کے علاوہ جنابِ مؤلف کی یہ خصوصیت بھی غیر معمولی بلکہ لائقِ رشک ہے کہ ان کے مقالات کا مجموعہ جن کی تحریر کی ابتدا ارشاید ۱۹۴۹ء سے ہوئی ہے، "ندوۃ المصنفین" جیسے بلند پایہ علمی ادارے سے شائع ہورہا ہے۔ غالباً یہ ان کے قلم کی برکت اور خلوص کا نتیجہ ہے۔ اس مجموعے کا نام "مآثر و معارف" بھی نہایت ہی موزوں اور دل پذیر ہے، اس میں محترم مؤلف کے پچیس ۲۵ علمی اور دینی مقالات ہیں جو محتاط اور مکمل نظرِ ثانی کے بعد کتاب کی صورت میں مرتب ہوکر سامنے آرہے ہیں مقالوں میں ہر مقالہ اپنی خاص نوعیت کے اعتبار سے قیمتی معلومات کا خزانہ ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد فراہم ہوجائے۔

میں نے معمول کے مطابق ان مقالات پر سرسری اور اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی ہے، زندگی کے روزانہ کے معمولات اور مشاغل کچھ ایسے ہوگئے ہیں کہ نہ توجم کر کچھ لکھنے کی توفیق ہوتی ہے اور نہ اطمینان سے کچھ پڑھنے کی، رواروی میں جو کام ہوجائے مغتنم معلوم ہوتا ہے، چنانچہ یہ چند سطور بھی قاضی صاحب کی تعمیلِ حکم اور وضعِ قدیم کو باقی رکھنے کے لیے لکھی گئی ہیں، کہ یہ کتاب بھی میرے مختصر تعارف سے کیوں خالی رہے۔

ان مضامین کے جستہ جستہ حصّوں کے مطالعے کے بعد قلب نے جو بات محسوس کی وہ یہ ہے کہ انشاء اللہ اس علمی اور دینی ذخیرے سے اہلِ علم بھی بھرپور نفع اٹھائیں گے اور عام اصحابِ ذوق بھی، اسی احساس کا اثر ہے کہ یہ مجموعہ اس مشکل وقت میں اس قدر جلد شائع ہو رہا ہے۔

مقالات میں "تدوینِ حدیث کے چار ادوار" "اسلامی تعلیم کا مکی مرکز دارِ ارقم" اور "ہر طبقے اور ہر پیشے میں علم اور علماء" خاص طور پر لائقِ مطالعہ ہیں، "تدوینِ حدیث" کے موضوع پر بے شمار مضامین اور ضخیم ضخیم کتابیں شائع ہوئی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں جن کے مقابلہ میں اس چھوٹے سے مقالے کی (نسبت) وہی ہے جو قطرے اور سمندر میں ہوتی ہے لیکن مقالہ نگار نے دریا کو جس کاوش اور سلیقے سے کوزے میں بند کرنے کی سعی کی ہے اس کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں۔ جنھوں نے اس مسئلے کی تلاش و جستجو میں بڑی بڑی کتابوں کی خاک چھانی ہے۔

"اسلامی تعلیم کا مکی مرکز دارِ ارقم" مختلف حیثیتوں سے ایک معلوماتی اور دلچسپ تاریخی مقالہ ہے جس کو پڑھ کر اس مقام کی دینی اور تاریخی عظمت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

"اور ہر طبقے اور ہر پیشے میں علم اور علماء" تو ایسا بصیرت افروز مقالہ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے فرمانے کے مطابق "اس کو پڑھ کر اچھے اچھے پڑھے لکھوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں"

یہ مقالہ اس لائق ہے کہ صنعت و حرفت کی انقلاب انگیز توسیع و ترقی کے اس دور میں مختلف جدید اور ترقی یافتہ زبانوں میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔ ساتھ ہی ساتھ ہمارے علماء کو بھی اس کا بار بار مطالعہ کرنا چاہیے جو علمی مشیخت میں گم ہو کر زندگی کے اس عملی میدان سے بے تعلق ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

ندوۃ المصنفین، اردو بازار دہلی ۶

۳ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ مطابق ۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ سیدنا ونبینا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین!۔

مقدمہ

پچیس مقالات کا یہ مجموعہ جو "مآثر و معارف" کے نام سے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اُن دینی، علمی، تاریخی اور تحقیقی مقالات و مضامین کا انتخاب ہے جو بیس سال کی مدت میں ۱۳۶۸ھ سے ۱۳۸۸ھ (۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۹ء) تک لکھے گئے اور ان میں سے اکثر مجلات و رسائل میں شایع ہو کر ارباب علم و تحقیق اور اہلِ نقد و نظر کی بارگاہ میں مقبول ہوئے۔

یہ مجموعہ زیادہ تر دینی اور علمی مقالات پر مشتمل ہے، ان میں اکثر مضامین پر نظر ثانی کر کے ان کو جدید اضافات و معلومات سے مفید تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے، ابتدا کے تین مقالے علم حدیث کی تدوین اور علومِ حدیث کی تاریخ سے متعلق ہیں جو علامہ عبدالعزیز خولی مصری کی تاریخ علوم حدیث کو ماخذ قرار دے کر مرتب کیے گئے ہیں اور بہت سی باتیں حذف کر کے ضروری اضافے کیے گئے ہیں اس طرح یہ مقالات سعی مشترک کا نتیجہ ہیں، اسی طرح استشراق اور مستشرقین اور بعض دیگر مضامین سعیِ مشترک کا ثمرہ ہیں۔

بعض مقالات پر بعد میں استدراک اور تعاقب شائع ہوئے تھے جن کو بلا کسی تردد اور بغیر کسی تعرض کے مضمون کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، تاکہ ناقدین و مستدرکین کا نقطۂ نظر بھی معلوم ہو اور تحقیق کا یہ پہلو بھی سامنے رہے، علم و تحقیق میں یہ بات بہت اچھی ہے، اس مجموعہ میں احادیث

رسولِ اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے علوم وفنون کے بارے میں کافی معلومات ہیں جو انشاء اللہ مفید ثابت ہوں گی۔ دوسرے مقالات ومضامین بھی علم وفن ہی سے متعلق ہیں، شاید دو ایک ایسے مضامین ہوں جو اس دائرہ سے باہر ہوں۔

میرے ان ہی مضامین ومقالات میں سے اسلامی ہند سے متعلق آٹھ مقالات کا ایک مجموعہ "اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ" کے نام سے گزشتہ سال ندوۃ المصنفین دہلی سے شایع ہو چکا ہے۔ پیش نظر مجموعۂ مقالات کے بارے میں جب میں نے حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو لکھا تو آپ نے بڑے انشراح وانبساط سے اس کی اشاعت کا فوری انتظام فرمایا، اور ساتھ ہی ہمت افزائی اور قدردانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلم میں برکت عطا فرمائی ہے اور خلوص بھی"۔ مولانا کی اس ہمت افزائی اور قدردانی کا نتیجہ ہے کہ میری یہ چوتھی کتاب ندوۃ المصنفین دہلی سے اعلیٰ معیار پر شایع ہو رہی ہے۔

وَاللّٰهُ يُوَفِّقُنَا لِمَا يُحِبُّ وَيَرْضٰى۔

قاضی اطہر مبارکپوری

بمبئی ۱۰ محرم ۱۳۹۰ھ

۱۹ مارچ ۱۹۷۰ء

(۱)

تدوین حدیث کے چار ادوار

پہلا دور

صحابہؓ اور اکابر تابعینؒ کا عہد

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دورِ حیات خیر القرون تھا اور آپ جب تک دنیا میں رہے، اسلام کے چلتے پھرتے مدرسہ رہے، پھر بھی آپؐ نے صحابہ کرامؓ کے مختلف حلقے بنا دیئے تھے جو عموماً محلّوں کی مسجدوں میں قائم ہوتے تھے، اور ان میں کتاب وسنّت کی تعلیم ہوتی تھی، اس زمانے میں احادیثِ رسولؐ کی خدمت اس نوعیت سے ہوتی تھی کہ ایک صحابی دوسرے صحابی سے قرآنِ حکیم کے ساتھ آپ کے اقوال و احوال کو بھی معلوم کرتے تھے، اور ان کو سینوں میں محفوظ کر لیتے تھے، آپؐ کے مقدس دور کے بعد صحابہ اور تابعین کا دور آیا، اور اس میں بھی عام طور سے یہی طریقہ رائج رہا کہ احادیث کو سینوں میں اور قرآن کو صحیفوں میں محفوظ کیا جاتا تھا، مگر عہدِ رسالت اور اس کے بعد کچھ نہ کچھ احادیث کا سرمایہ جمع ہو گیا تھا۔ عہدِ رسالت میں احادیث کے جمع وتدوین کے بارے میں صحابہ کے دو گروہ تھے، ایک وہ حضرات جو صرف قرآن کو لکھنا ضروری سمجھتے تھے، ان کی رائے میں احادیث کو لکھنا قرآن و حدیث میں اشتباہ کا سبب بن سکتا تھا، نیز یہ خطرہ تھا کہ احادیث کے مقابلے میں قرآن سے بے اعتنائی ہو جائے گی، کیونکہ ان کے سامنے یہود و نصاریٰ کے دو گروہ موجود تھے، جنہوں نے اپنے بزرگوں کے اقوال و ملفوظات اور ان کی داستانوں میں پڑ کر تورات اور انجیل کو پسِ پشت ڈال دیا تھا اور فروعی باتوں کو اصل

دین قرار دے چکے تھے، نیز ابتدا میں اسی خطرے کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ قرآن کے علاوہ میری کسی بات کو نہ لکھا جائے، مگر بعد میں جب لوگ قرآن وحدیث کے مقام و مرتبہ کو سمجھنے لگے تو آپؐ نے صحابہؓ کی خواہش پر احادیث لکھنے کی اجازت دیدی اور جن صحابہ کو اس بارے میں اپنے اوپر اعتماد ہوتا تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے احادیث لکھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح احادیث کی کتابت کا معاملہ انفرادی رہا اور عام صحابہ اس کے مکلف نہیں تھے، بلکہ عام طور سے لوگ قرآن وحدیث میں بعد میں اشتباہ کے خیال سے احادیث نہیں لکھتے تھے۔

عہد رسالت کے چند تحریری سرمائے

اس طرح عہد رسالت میں انفرادی طور پر احادیث کی کتابت کا رواج ہوگیا تھا اور صحابہ اپنے طور پر ان کو جمع کرنے لگے تھے، بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے علاوہ کسی کے پاس مجھ سے زیادہ نہیں تھیں، وجہ یہ تھی کہ وہ احادیث لکھ لیا کرتے تھے، اور میں زبانی یاد کرلیا کرتا تھا، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتابت حدیث کی اجازت لے لی تھی، خود عبداللہ بن عمروؓ کا بیان ہے کہ میں جس قدر احادیث سن لیتا تھا ان کو لکھ لیا کرتا تھا، ایک مرتبہ اہل قریش نے مجھے یہ کہکر روکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں، بہت سی باتیں غصے میں کہہ دیتے ہوں گے، اس لیے تم حدیثیں نہ لکھو، میں ان کے اس کہنے پر رک گیا، مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا تم ان کو لکھ لیا کرو۔ اس زبان سے کسی حالت میں ناحق بات نہیں نکل سکتی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پاس احادیث کا ایک مجموعہ تیار ہوگیا جس کا نام انھوں نے "الصادقہ" رکھا تھا۔ دیگر صحابہ بھی احادیث کو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا بیان ہے کہ نحن حول رسول اللہ نکتب یعنی ہم لوگ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھ کر حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متعدد صحابہ آپ سے حدیثیں لکھا کرتے تھے، حضرت رافع بن خدیج رضی نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ اگر اجازت ہو تو ہم آپ کی حدیث لکھ لیا کریں، آپ نے فرمایا، کوئی مضائقہ نہیں ہے، ایک انصاری صحابی نے آپ سے عرض کیا تھا کہ مجھ کو حدیث یاد نہیں رہتی، آپ نے فرمایا لکھ لیا کرو۔ عہد رسالت میں احادیث کے یہ انفرادی مجموعے اور دربار نبوی کے احکام و فرامین جو باہر روانہ کیے جاتے تھے، تدوین حدیث کے نقش اوّل تھے، اور ان کی بنیادوں پر بعد کے ادوار میں کام ہوا۔

الصادقہ یہاں ہم عہد رسالت کے چند تحریری مدونات کا تذکرہ کرتے ہیں جن کو تدوین حدیث کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ الصادقہ ان احادیث کا مجموعہ تھا جنہیں عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہ کر جمع کیا کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صرف امثال ایک ہزار کی تعداد میں سنے ہیں، اس قول سے الصادقہ کے حجم و ضخامت کا اندازہ ہو سکتا ہے، عبداللہ بن عمرو رضی اس مجموعۂ احادیث کو اپنی زندگی کی متاع عزیز سمجھتے تھے، ان کا قول ہے کہ ما یرغبنی فی الحیاۃ الا الصادقۃ یعنی یہی کتاب الصادقہ مجھے زندگی کا لطف دے رہی ہے۔ ان کو کسی حال میں اس کی مفارقت گوارا نہ تھی، اور اس پر بہت ناز تھا، فخریہ انداز میں کہا کرتے تھے کہ فاما الصادقۃ فصحیفۃ کتبتہا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی صادقہ کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر لکھا ہے، کتب احادیث میں عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے جو حدیث آئی ہے وہ اسی مجموعہ الصادقہ کی ہوتی ہے۔

کتاب عمرو بن حزم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض و سنن اور دیات کے مسائل پر مشتمل ایک تحریر لکھوا کر عمرو بن حزم صحابی رضی کے ساتھ اہل یمن کے پاس بھیجی تھی، اس نوشتہ کے جستہ جستہ ٹکڑے احادیث و سیر کی کتابوں میں ملتے ہیں، مستدرک حاکم میں اس

کتاب کی ۲۷۶ حدیثیں منقول ہیں، اس کے علاوہ ایک نوشتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ یمن کے نام روانہ فرمایا تھا جس کی حدیثیں مصنف ابن ابی شیبہؒ میں امام شعبیؒ سے مروی ہیں۔

کتاب الصدقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاتِ طیبہ کے آخر میں باہر کے عاملوں کے لیے ایک مجموعہ کتاب الصدقہ کے عنوان سے مرتب کرایا تھا، جس میں جانوروں کی زکوٰۃ سے متعلق احادیث درج تھیں، لیکن اس کی روانگی سے پہلے ہی آپ کا وصال ہو گیا اور حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں اس پر عمل درآمد ہوا۔

صحیفۂ علیؓ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں دیت و قصاص اور قیدیوں کی رہائی کے مسائل درج تھے، نیز اس میں مختلف احکام کی احادیث تھیں جو کتبِ احادیث میں مناسب مقام پر موجود ہیں۔

خطبۂ فتح مکہ

فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا تھا، جب آپ خطبہ سے فارغ ہوئے تو ایک صحابی ابوشاہ یمنی نے اُٹھ کر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھے لکھ کر عنایت ہو، چنانچہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اکتبوا لابی شاہ یعنی یہ خطبہ ابوشاہ کے لیے لکھ دو۔ یہ خطبہ بھی کتبِ احادیث میں موجود ہے۔

احادیث کے ان تحریری سرمایوں کے علاوہ احادیث و سیر اور تاریخ کی کتابوں میں بہت سے ایسے تحریری احکام و فرامین کا تذکرہ پایا جاتا ہے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل اور عمال کے پاس روانہ فرمایا تھا، یہ تحریریں اُن کے پاس محفوظ رہیں، اور بعد میں جب احادیث کی باقاعدہ تدوین کا دور آیا تو ان کی حدیثیں مدونات میں داخل کر لی گئیں۔

عہدِ صحابہ میں احادیث کا تحریری سرمایہ

صحابہ کرام میں سے جو حضرات عہدِ رسالت میں احادیث کو قلمبند کیا کرتے تھے ان کے پاس ان کی احادیث کا تحریری مجموعہ اور صحیفہ موجود تھا اور ان کے تلامذہ ان صحائف سے روایت کرتے تھے، ہر صحابی کا مجموعہ روایات الگ ہوتا تھا اور ان کے شاگرد بھی اس کو الگ ہی لکھتے تھے، اور ایسے صحیفوں کو بڑی حفاظت

سے رکھتے تھے۔

صحیفہ ابوبکرؓ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تھا مگر اسے یہ کہکر ضایع کر دیا کہ اس کی تمام حدیثیں میں نے براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی ہیں، بلکہ اس میں دوسروں کی روایت کردہ احادیث بھی ہیں، ممکن ہے کہ راوی نے بیان کرنے میں غلطی کی ہو، اور میں نے اسے صحیح سمجھ کر اس صحیفہ میں رکھدیا ہو۔

صحف عبد اللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما (م ۶۸ھ) کے پاس احادیث کے چند صحیفے تھے، جس زمانہ میں آپ کی بینائی کمزور ہو گئی تھی طائف سے کچھ لوگ آئے اور ان صحیفوں کو آپ کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آپ ہمیں ان کی احادیث کو سنا دیں، آپ نے فرمایا، کہ تم لوگ خود ہی ان کو پڑھ کر مجھے سنا دو، تمہارا سنانا اور میرا پڑھنا دونوں ہی روایت میں برابر ہیں۔

سعید بن جبیرؒ کی کتابیں مشہور تابعی حضرت سعید بن جُبیرؒ کا بیان ہے کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ (م ۷۳ھ) سے احادیث سنتا تھا اور ان کو لکھ لیا کرتا تھا نیز سعید بن جبیرؒ حضرت عبداللہ بن عباس سے حدیثیں لکھا کرتے تھے، جب کاغذ بھر جاتا تھا تو کسی دوسری چیز پر لکھ لیا کرتے تھے۔

مجموعہ ابو بُردہ اشعریؒ حضرت ابو بُردہ اشعریؒ کے پاس ایک مجموعہ احادیث تھا جسے انھوں نے اپنے والد حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے سن کر مرتب کیا تھا، ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اس مجموعہ کو منگا کر پڑھوایا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سنا ہے، پھر بھی ممکن ہے کہ اس میں کچھ کمی بیشی ہو گئی ہو۔

الصادقہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کا مجموعہ احادیث الصادقہ عہدِ رسالت میں مرتب کیا گیا تھا مگر یہ دوسری صدی تک ان کے خاندان میں موجود رہا اور بعد میں اس کی احادیث کو خاندان والوں نے روایت کیا، عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ

سند والی احادیث اسی الصادقہ کی ہیں۔

دیگر صحائف

اسی طرح دوسرے کئی صحابہ کے پاس ان کے مجموعے تھے جن سے ان کے تلامذہ روا[یت] کرتے تھے، یا ان کی روایات کو تلامذہ مدوّن کر لیتے تھے، چنانچہ مشہور تابعی ابان [کا] قاعدہ تھا کہ حضرت انس رضؓ کے پاس بیٹھ کر سا گوان کی تختیوں پر حدیثیں لکھا کرتے تھے، عبداللہ بن [محمد] بن عقیلؒ کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت جابرؓ (م ۷۸ھ) کی خدمت میں حاضر ہو کر رسول اللہ صلی [اللہ] علیہ وسلم کی احادیث حاصل کرتے اور ان کو لکھ لیا کرتے تھے، عبداللہ بن حنشؒ کا بیان ہے کہ [میں نے] حضرت براءؓ (م ۷۲ھ) کی مجلس میں لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی اپنی ہتھیلیوں پر احادیث لکھتے [تھے]۔

کبار تابعین کے عہد میں تدوین حدیث

عہدِ صحابہؓ کے بعد جس قدر ضرورت بڑھتی گئی احا[دیث] نبویہ کی تدوین و کتابت میں اضافہ ہوتا گیا، ہر تا[بعی] عالم کے پاس اپنے صحابی استاد کی روایات و مرویات کا مجموعہ موجود رہتا تھا بلکہ بعض تابعین کے پاس متعدد مجموعے تھے، ان کے یہ مجموعے وفات نبوی کے سو سال کے اندر اندر کے ہیں اور کچھ اس کے بعد کے بھی ہیں۔ سالم بن ابی جعد (م ۱۰۱ھ) حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ امام زہریؒ (م ۱۲۴ھ) اپنے ساتھ تختیاں اور کاغذ لیے رہتے تھے اور اپنے اساتذہ و شیوخ سے جو کچھ سنتے تھے لکھ لیا کر[تے] تھے، عطاء بن ابی رباح (م ۱۱۴ھ) سے لوگ علمی سوالات کرتے اور ان کے جوابات ان کے سا[منے] ہی لکھ لیتے تھے۔ نافع مولیٰ ابن عمر (م ۱۱۷ھ) احادیث بولتے جاتے اور لوگ لکھتے جاتے تھے، اما[م] حسن بصری (م ۱۱۰ھ) کے پاس ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ آپ کی روایت کردہ احادیث لکھی ہوئی ہیں، کیا آپ مجھے ان کی روایت کی اجازت دیتے ہیں؟ آپ نے کہا ہاں اجازت ہے، ہشا[م] بن عروہؒ (م ۱۴۶ھ) کی خدمت میں ابن جریجؒ ایک کتاب لے کر پہنچے اور کہا کہ یہ آپ کی مرویا[ت] ہیں، کیا میں ان کو دوسروں سے بیان کروں؟ ہشام نے کہا کہ ہاں اجازت ہے، ابو قلا[بہ] (م ۱۰۴ھ) نے انتقال کے وقت اپنی کتابوں کے بارے میں ایوب سختیانیؒ کو وصیت کی چنانچہ ابو قلابہ کی کتابیں ملک شام سے اونٹ پر لاد کر لائی گئیں اور بارہ چودہ درہم ان کا کرا[یہ]

کیا گیا، الغرض کبار تابعین کے دور میں احادیث کی بہت سی کتابیں مرتب ہو چکی تھیں مگر ان کی حیثیت ذاتی یادداشت کی تھی، امام زہری کی حدیثوں کے دفاتر اونٹوں پر لادے جاتے تھے، امام حسن بصری، ہشام بن عروہ، رجاء بن حیوۃ وغیرہ کی احادیث کے مدونات موجود تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کا ایک مجموعہ ان کے تلمیذ ہمام بن منبہ نے ۵۸ھ میں مرتب کیا تھا جو چند سال ہوئے صحیفہ ہمام بن منبہ کے نام سے شایع ہو چکا ہے، اس صحیفہ کی اکثر احادیث صحیح مسلم میں موجود ہیں، عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہؒ (م ۹۸ھ) اور قاسم بن محمد بن ابوبکرؒ (م ۱۲۰ھ) کے پاس بھی احادیث کے تحریری ذخیرے موجود تھے جن کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے "قاضی مدینہ ابوبکر بن محمد بن حزمؒ نے حاصل کر لیا تھا۔

روایات میں شدتِ احتیاط اور حفظ و مذاکرہ

حضرات صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہ کو عقل سلیم اور طبع مستقیم کے ساتھ حفظ قویم عطا فرمایا تھا اور ان صفاتِ عالیہ کی وجہ سے انھوں نے احادیثِ رسولؐ کے حفظ و روایت اور کتابت و تدوین میں شدت احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس امانت کو من وعن ہم تک پہنچایا، جس کی بدولت ہم دُنیا کی تمام اگلی پچھلی امتوں میں اپنے دینی آثار و روایات میں بے مثل و بے نظیر ہیں، اور کوئی قوم ہماری ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی،

صحابہ اور تابعین کتاب و سنت کے مخاطب اول تھے، ان دونوں کے حامل و عالم تھے، ان کے اوامر و نواہی پر پورے طور سے کاربند تھے۔ ساتھ ہی ان کو یہ بھی خیال تھا علمِ دین کا چھپانا بہت بڑا گناہ ہے، اور ان کے شاہد کو تاکید ہے کہ غائب تک اسے پہنچا دے، ان کو جہاں کسی سے حدیث ملی فوراً اسے حاصل کر کے محفوظ کیا، اس پر عامل ہوئے، اور دوسروں تک پہنچایا، اس صورتِ حال کی وجہ سے عوام میں احادیث کا چرچا تھا، اور اس وقت کا ہر عالم تقریباً ہر حدیث سے واقف رہتا تھا، اگر ایک بھول جاتا تھا تو دوسرا یاد دلا دیتا تھا، ذیل کے بیان سے معلوم ہوگا کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام احادیث کی روایت و تحقیق میں کس قدر شدت اور احتیاط سے کام لیتے تھے۔

صحابہ کرام کی تحدیث میں شدت احتیاط

حضرت ابوبکرؓ کی حدیث میں شدت احتیاط کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ جدّہ کی میراث کے بارے میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جدہ کو سُدس حصہ دیا کرتے تھے، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ اس حدیث پر کوئی دوسرا شخص تمہارا ہمنوا ہے؟ جب حضرت محمد بن مسلمہ نے بھی اس کی شہادت دی تو آپ نے جدّہ کو سُدس میراث دینے کا حکم فرمایا، حضرت عمر بن خطاب نے حدیث کی روایت میں تثبیت وتحقیق کو بڑی سختی سے رواج دیا، ایک مرتبہ حضرت ابوموسٰی اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو دروازے کے باہر سے تین بار سلام کیا مگر جب اندر آنے کی اجازت نہیں ملی تو ابوموسٰیؓ واپس چلے گئے، جب حضرت عمرؓ کو اس کی خبر لگی تو ان کو واپس بلایا اور کہا کہ آپ کیوں واپس چلے گئے؟ ابوموسٰیؓ نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم اپنے بھائی کو تین مرتبہ سلام کرو، اور وہ جواب نہ دے سکے تو واپس چلے آؤ۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس حدیث پر گواہ لاؤ ورنہ میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش آؤں گا، راوی کا بیان ہے کہ ہم لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے ابوموسٰی ڈرتے کانپتے ہمارے پاس آئے اور واقعہ بیان کرکے پوچھا کہ یہ حدیث آپ لوگوں میں سے کوئی جانتا ہے، ہم نے کہا کہ ہاں یہ حدیث ہم سب جانتے ہیں اور ایک شخص کو حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا اس کی تصدیق کرادی۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ اگر ہم لوگ حضرت عمرؓ کے زمانے میں یوں بے دھڑک احادیث بیان کرتے تو وہ ہم پر دُرّے اٹھاتے حضرت علیؓ کا اصول تھا کہ جب کوئی شخص ان کے سامنے حدیث بیان کرتا تو اس سے قسم لے کر تصدیق کراتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو حدیث کی روایت کے بارے میں بڑا تشدد تھا، اور اس معاملہ میں وہ بے حد محتاط تھے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے شاگردوں کو تاکید کیا کرتے تھے کہ تم لوگ حدیث بیان کرنے سے پہلے خود تین مرتبہ دُہرا لیا کرو، حضرت زید بن ارقمؓ بڑھاپے میں حدیث بیان نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہم لوگ بوڑھے ہوگئے ہیں اور احادیث بیان کرنا بڑا مشکل اور ذمہ داری کا کام ہے حضرات صحابہ کی حدیث میں شدت حزم واحتیاط کے سیکڑوں واقعات طبقات ورجال کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں۔

تابعینِ عظام کی تحدیث میں شدتِ احتیاط

تابعینِ عظام میں شدتِ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حدیث کے الفاظ میں زیر و زبر اور نقطے شوشے کا بھی فرق جائز نہیں سمجھتے تھے، جو حدیث جس طرح اپنے اساتذہ و مشائخ سے سنتے تھے، بعینہٖ اسی طرح روایت کرتے تھے محمد بن سیرین، قاسم بن محمد اور رجاء بن حیوۃ کا یہی مسلک تھا، ایسے لوگوں سے حدیث کی روایت نہیں کرتے تھے جو خود حدیث کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، کیونکہ اس صورت میں فتنہ کا احتمال تھا، ابو قلابہ کا قول ہے کہ تم ایسے شخص سے حدیث نہ بیان کرو جسے تم نہیں جانتے ہو اور وہ تمہارے نزدیک مجہول الحال ہے۔ عبیدہ بن عمر سلمانی بہت احتیاط سے کام لیتے تھے، سعید بن مسیب ایک ایک حدیث کی تحقیق و جستجو میں کئی کئی دن کا سفر کیا کرتے تھے،

الغرض تدوینِ حدیث سے پہلے کا دور جو پہلی صدی کے خاتمہ تک ہے، اس میں احادیث کے باب میں نہایت احتیاط اور بہت ہی تحقیق و تلاش سے کام لیا جاتا تھا اگر اس دور میں شدت اور حزم و احتیاط کا طریقہ اختیار نہ کیا گیا ہوتا تو آج ہم مسلمانوں کے پاس علمِ حدیث کا وہ صاف ستھرا عظیم الشان ذخیرہ نہ ہوتا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور مرضیات اس طرح موجود ہیں جیسے آپ ہمارے سامنے ہیں۔

عہدِ صحابہ و تابعین میں حفظِ حدیث

صحابہ کرام میں احادیث رسولؐ کے زبانی یاد کرنے کا عام رواج تھا، اور وہ اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے، اور اپنے تلامذہ کو اس کی تاکید کرتے تھے حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ حدیثوں کا آپس میں زبانی دور کیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تمہارے قابو سے باہر ہو جائیں، نیز فرماتے تھے کہ حدیث کو دہرایا کرو اور اسے یاد کیا کرو، ورنہ جاتی رہیں گی، حضرت ابو سعید خدریؓ بھی مذاکرہ حدیث کی تاکید فرمایا کرتے تھے بلکہ اگر تلامذہ احادیث لکھوانے کی تمنا کرتے تو یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کرتے تھے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر زبانی یاد کیا ہے، تم لوگ بھی زبانی یاد کرو، حضرت علیؓ اپنے تلامذہ سے فرماتے تھے کہ تم لوگ حدیثوں کا باہم مذاکرہ کیا کرو، اس سے غفلت کرو گے تو احادیث

مٹ جائیں گی، احادیث کے حاصل کرنے والے تلامذہ اپنے اساتذہ کی ان باتوں کا پورا پورا خیال رکھتے چنانچہ عطاء بن ابی رباح کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت جابرؓ سے حدیثوں کو سن کر آتے تو آپس میں ان کا مذاکرہ کیا کرتے تھے ہماری جماعت میں ابوزبیر کا حافظہ بہت اچھا تھا، ان کو سب سے زیادہ احادیث بہت جلد یاد ہو جاتی تھیں، ابن بریدہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ نماز کے بعد مسجد ہی میں بیٹھ کر حدیث کا زبانی دور کیا کرتے تھے، ابن شہاب زہری عشاء کے بعد سے صبح تک احادیث کا مذاکرہ کرتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کوفہ میں درس دیا کرتے تھے اور اپنے شاگردوں سے دریافت کرتے تھے کہ تم لوگ کسی جگہ باہم مل کر حدیث کا مذاکرہ کرتے ہو یا نہیں؟ تو تلامذہ جواب دیتے تھے کہ ہماری جماعت کا کوئی فرد مذاکرہ سے غیر حاضر نہیں ہوتا اور کوفہ کے تمام طلبہ خواہ وہ کسی حصۂ شہر میں رہتے ہوں سب ایک مقام پر جمع ہو جاتے ہیں صحابہ کرامؓ کے بعد تابعینؒ کا دور آیا تو انھوں نے صحابہ کے نقش قدم پر چل کر حفظِ حدیث اور مذاکرہ کا پورا اہتمام کیا، چنانچہ حارث بن یزید عکلی قعقاع بن یزید اور فضیل عشاء کی نماز پڑھ کر مذاکرۂ حدیث کے لیے بیٹھ جاتے تھے اور صبح کو اٹھتے تھے، یونس کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ حسن بصری کے یہاں سے سبق پڑھ کر آتے تھے تو مذاکرہ کے لیے بیٹھ جاتے تھے اسمٰعیل بن — کا دستور تھا کہ جب کوئی ہم جماعت نہیں ملتا تھا تو مکتب کے طلبہ کو جمع کر کے حدیثیں بیان کرتے تاکہ مشق و مذاکرہ میں ناغہ نہ ہو۔

صحابہ اور تابعین کی قوت حافظہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حافظہ کا یہ حال تھا کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا ایک حرف بھی نہیں بھولتا تھا حضرت قتادہ کی نسبت امام احمد کا قول ہے کہ قتادہ جو کچھ سن لیتے ہیں ان کو یاد ہو جاتا ہے، ایک دفعہ ان کے سامنے حضرت جابرؓ کی مرویات و احادیث کا مجموعہ پڑھا گیا اور ان کو بالکل یاد ہو گیا خود حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ میں نے کبھی اپنے استاد سے حدیث دہرانے کی تمنا نہ کی، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی بات میرے کان میں آئی ہو اور دل میں نہ بیٹھ گئی ہو، امام شعبیؒ کے حافظہ کا یہ حال تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ باوجودیکہ میں غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ہمراہ رہتا تھا مگر شعبی کو غزوات کے واقعات مجھ سے زیادہ ازبر ہیں، خود شعبی کا بیان ہے کہ میں نے اپنے حافظہ پر اعتماد کی وجہ سے کوئی چیز نہیں لکھی اور نہ ہی استاد سے حدیث دُہرانے کی خواہش کی باوجودیکہ مجھے اشعار بہت کم یاد ہیں لیکن ان کو سُنانا شروع کر دوں تو ایک مہینہ تک زبانی سنا سکتا ہوں، امام مکحول شامیؒ کا بیان ہے میں نے جو بات اپنے سینے میں رکھ لی، جب چاہا اسے موجود پایا، امام زہریؒ کا بیان ہے کہ میں نے جو علم اپنے سینے میں رکھ لیا اسے فراموش نہیں کیا۔ ایک مرتبہ امام زہری نے ایک شخص کو چار سو حدیثیں لکھوائیں، ایک ماہ کے بعد اس نے آکر کہا کہ چار سو احادیث کا وہ مجموعہ گم ہو گیا، امام زہری نے پھر اُسے زبانی لکھوا دیا، اور دونوں مجموعوں میں ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔ امام زہری نے صرف اسّی راتوں میں پورا قرآن حفظ کر لیا تھا، اور اسی طرح ابو وائل شقیق بن سلمہؒ نے صرف دو ماہ میں پورا قرآن حفظ کر لیا تھا۔

یہی حضرات احادیثِ رسولؐ کے حاملینِ اولین ہیں جنہوں نے اپنی اپنی احادیث کو اپنے تلامذہ تک پہنچایا اور انھوں نے ان کو قلم بند کر لیا قوتِ حافظہ کا یہ حال، روایت میں شدتِ احتیاط اور پھر اللہ و رسولؐ کے دین کے لیے نصیحت و خیر خواہی کا جذبہ، ان سب چیزوں کی وجہ سے احادیث کی تدوین و تالیف میں بڑی ذمہ داری برتی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک قول و عمل پورے ثبوت کے ساتھ ہم تک پہنچا۔

دُوسرا دَور

تدوینِ حدیث کی ابتداء

ایک طرف آفتابِ اسلام کی کرنیں حدودِ عرب سے نکل کر کائنات کے در و دیوار سے ٹکرائیں اور اسلامی علوم و معارف اور ان کے رجال مکہ، مدینہ، بصرہ، کوفہ، شام، اور مصر وغیرہ سے باہر نکل کر ایشیا، افریقہ اور حدود یورپ میں داخل ہوئے اور دوسری طرف صحابہ کرام جو

درحقیقت اسلام کے چلتے پھرتے مدرسے، اور اسلامی تعلیمات کی جیتی جاگتی تصویر تھے، دنیا سے اٹھنے لگے اور شمعِ رسالت سے براہ راست کسبِ نور کرنے والے پروانوں کی کمی ہونے لگی تو ضرورت محسوس کی گئی کہ اسلام کے اصول و فروع اور اس کے تشریعی احکام اور تشریحی تعلیمات یعنی احادیث وسنن کو باقاعدہ مدون و منضبط کیا جائے، اور ان کی جگہ سینوں کے بجائے سفینوں میں بنائی جائے۔ یوں تو بعض صحابہ اور تابعین نے انفرادی طور پر احادیث وسنن کے جمع و ترتیب کا کام پہلے سے جاری کر رکھا تھا اور جیسا کہ معلوم ہوا عہدِ صحابہ اور عہدِ رسالت میں احادیث کے متعدد صحیفے اور مجموعے موجود تھے مگر خلافت کی طرف سے احادیث وسنن کے باقاعدہ مدوّن و مرتب کرنے کا احساس سب سے پہلے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ (م ۱۰۱ھ) کو ہوا۔

آپ نے پہلی صدی کے خاتمے پر مدینہ منورہ کے عامل و قاضی ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزمؒ کے نام یہ خط تحریر فرمایا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علم اور علماء کا زمانہ ختم ہونیوالا ہے، مجھے ڈر ہے کہ رفتہ رفتہ علمِ دین ختم نہ ہو جائے، لہٰذا تم پتہ لگاؤ جہاں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ملیں انھیں لکھ لو، نیز آپ نے ابوبکر بن حزم کو وصیت کی کہ عمرۃ بنت عبد الرحمن انصاریہؒ (۹۸ھ) اور قاسم بن محمد بن ابوبکرؒ (۱۲۰ھ) کے پاس جو ذخیرۂ حدیث ہے اسے بھی لکھ لو۔

اسی طرح حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے خلافتِ اسلامیہ کے تمام عمال و قضاۃ کو جمع احادیث کے سلسلے میں تاکیدی خطوط لکھے، اور حجاز و شام کے امام محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن شہاب زہری مدنی (۱۲۴ھ) کے نام بھی اسی مضمون کا خط لکھا اس کے نتیجہ میں ہر ملک کے امیروں اور قاضیوں نے اپنے اپنے حلقہ سے تلاش و جستجو کے بعد احادیث کے مجموعے تیار کیے اور ان کو دربارِ خلافت میں پیش کیا، باقاعدہ تدوین حدیث کی یہ تحریک خلافت کی طرف سے پہلی صدی کی آخری دہائی کے آخر میں ہوئی اور دوسری صدی کے ربع اوّل میں اس کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا حتیٰ کہ ۱۴۱ھ اور ۱۵۰ھ کے درمیان میں عالم اسلام کے درمیان تمام مرکزی شہروں میں احادیث کے مجموعے مدوّن و مرتب

ہو گئے اور یہ کام علمائے امت کے اس طبقہ میں شروع ہوا تھا جو امام زہریؒ وغیرہ کے بعد تھا دوسری صدی کے وسط تک ان مقامات پر ان ائمہ نے تدوین حدیث کی ابتدا کی۔

(۱) مکہ مکرمہ میں ابن جریجؒ ۱۵۰ھ (۲) مدینہ منورہ میں ابن اسحٰق ۱۵۱ھ یا امام مالکؒ ۱۷۹ھ (۳) بصرہ میں ربیع بن صبیح بصریؒ ۱۶۰ھ (آپ ہندوستان میں فوت ہوئے) یا سعید بن ابی عروبہ ۱۵۶ھ یا حماد بن سلمہ ۱۷۶ھ (۴) کوفہ میں سفیان ثوری ۱۶۱ھ (۵) شام میں امام اوزاعی ۱۵۶ھ (۶) واسط میں ہشیم ۱۸۸ھ (۷) یمن میں معمر ۱۵۳ھ (۸) رے میں جریر بن عبدالحمید ۱۸۸ھ (۹) خراسان میں عبداللہ بن مبارک ۱۸۱ھ۔

اس دور کی خصوصیت اور مشہور کتابیں

یہ تمام حضرات دوسری صدی کے وسط میں موجود تھے، جیسا کہ ان کے سنین وفیات سے معلوم ہوتا ہے اور اسی دور میں انھوں نے اپنی اپنی کتابیں لکھیں، اس دور کی تصنیفات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں صرف احادیث رسول ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان کے ساتھ صحابہ کرام کے اقوال اور تابعین عظام کے فتاوی بھی درج کیے گئے اس طرح گویا ہر امام کی کتاب اس کے فقہی مسلک کی آئینہ دار تھی، دوسری صدی کی مدونات میں مشہور کتابیں یہ ہیں (۱) موطا امام مالک ۱۷۹ھ (۲) مصنف شعبہ بن حجاج ۱۶۰ھ (۳) مصنف لیث بن سعد مصری ۱۷۵ھ (۴) مصنف سفیان بن عیینہ ۱۹۸ھ (۵) مسند امام شافعی ۲۰۴ھ (۶) مختلف الحدیث امام شافعی، (۷) مصنف عبدالرزاق بن ہشام صنعانی ۲۱۱ھ (۸) کتاب الآثار امام محمد بن حسن شیبانی ۱۸۹ھ (۹) کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ امام محمد (۱۰) کتاب الآثار امام ابو یوسف ۱۸۲ھ، ان کتابوں کے علاوہ اور بہت سی تصنیفات ہیں جو اس دور کے ائمہ سنن اور حفاظ احادیث نے تحریر فرمائیں۔

تیسرا دور

حدیث کی مستقل تدوین

تیسری صدی جملہ اسلامی علوم کے شباب کا دور ہے، اندلس سے حدودِ ہند تک ہر شہر وقریہ علما رو فقہا، محدثین، مفسرین اور ارباب دین ودیانت سے آباد تھا اور اسلامی علوم وفنون کے جمع وتدوین اور اشاعت کا سلسلہ جاری تھا، بڑے بڑے نقاد حدیث، ائمۂ فن اور مقتدر مصنفین بکثرت موجود تھے، حقیقت یہ ہے کہ تیسری صدی کے خاتمہ تک علمائے اسلام نے جس موضوع پر جو کچھ لکھدیا وہی بعد میں آنے والے علما ر و مصنفین کا سرمایۂ علم وفن ٹھہرا یہ ضرور ہوا کہ بعد میں تہذیب وتنقیح اور تحقیق کے الگ الگ شعبے قائم ہوئے اور اجمال کی تفصیل کی گئی مگر ان سرگرمیوں کا محور تیسری صدی کی یہی تصنیفات تھیں۔

اس دور کی تدوینی خصوصیت تیسری صدی کی ابتدار میں رواۃِ حدیث ومحدثین نے احادیث کی تدوین کے سلسلے میں ایک نئی راہ اختیار کی، اس سے پہلے احادیث رسول کے ساتھ اقوالِ صحابہ اور فتاوی تابعین بھی مدوّن ہوا کرتے تھے، اور ہر کتاب گویا مصنف کے مختار مسلک کی ترجمانی کرتی تھی، لیکن تیسری صدی میں حدیث میں تہذیب وتنقیح سے کام لیتے ہوئے صحابہ کے اقوال اور تابعین کے فتاوے کتبِ احادیث سے علیحدہ کردیئے گئے اور صرف احادیث رسول کی تدوین کا رواج ہوا۔

صحاح اور غیر صحاح کی تدوین تدوین حدیث میں اس نقطۂ نظر کے بعد پھر محدثین ومولفین کے مختلف گروہ ہوگئے، بعض ائمہ نے اپنے مصنف میں ہر قسم کی احادیث جمع کیں، اور اس سے بالکل تعرض نہیں کیا وہ صحیح وسقیم ہیں، بعضوں نے یہ التزام کیا کہ صرف صحیح احادیث کو جمع کیا جائے اس دوسرے گروہ کے سرخیل امام المحدثین، امیر المؤمنین

فی الحدیث محمد بن اسمٰعیل بخاری (۲۵۶ھ) ہیں، آپ نے اپنی مشہور کتاب میں وہی حدیثیں لکھی ہیں جو آپ کی تحقیق میں صحیح ہیں۔

امام بخاری سے پہلے اگرچہ احادیثِ رسول کو اقوالِ صحابہ اور فتاویٰ تابعین سے جدا کرنے کا رواج ہو گیا تھا لیکن صحیح و سقیم احادیث کے جمع کرنے میں تمیز نہیں تھی اور اس دور میں ہر قسم کی حدیثوں کو محدثین نے جمع کر دیا تھا، اس لیے یہ بہت مشکل تھا کہ کسی حدیث کے صحیح ہونے کا قطعی فیصلہ کسی کتاب سے کیا جا سکے، بلکہ بحث و تمحیص اور کد و کاوش کے بعد کوئی رائے قائم کی جا سکتی تھی، ان کتابوں کا پڑھنے والا حدیث کے ذوق سے خالی ہوتا تو احادیث اس کے نزدیک مجہول رہتی تھیں اور وہ اپنی مرویات کے بارے میں خود کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا تھا، مگر امام بخاریؒ نے اپنی کتاب لکھ کر بڑی حد تک اس کمی کو پورا کر دیا اور ان کی کتاب کے ہر پڑھنے والے کے لیے آسان ہو گیا کہ صحیح حدیث کے متعلق قطعی رائے قائم کرے، امام بخاری کے بعد ان کے شاگرد امام مسلم بن حجاج قشیری (۲۶۱ھ) نے بھی وہی طریقہ اختیار فرمایا اور صحیح مسلم لکھی، ان دونوں حضرات کے بعد بہت سے علمائے حدیث نے ان کا اتباع کیا اور اپنی اپنی "صحیح" لکھی۔

احادیث کی تدوین فقہی ابواب پر

حدیث کی اس انفرادی تدوین کے سلسلے میں علماء نے عموماً دو طریقے اختیار کیے ہیں، ایک احادیث کی تدوین ابواب پر، اس کا مطلب یہ ہے کہ احادیث کی ترتیب فقہی ابواب و فصول پر رکھی جائے، اور ہر باب میں وہی حدیثیں لائی جائیں جو اس سے متعلق ہیں، مثلاً نماز سے متعلق حدیثیں کتاب الصلوٰۃ کے تحت بیان کی جائیں، اور روزہ سے متعلق جو احادیث ہیں ان کو کتاب الصوم میں رکھا جائے پھر اس میں بعض حضرات نے صرف صحاح کا التزام کیا جیسے امام بخاری اور امام مسلم ہیں، اور بعض ائمہ نے صحیح احادیث ہی پر اقتصار نہیں کیا بلکہ ان کے علاوہ دوسری احادیث کو درج کیا جیسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی وغیرہ نے کیا ہے۔

مسانید کی تدوین

دوسرا طریقہ مسانید کی تدوین تھا، یعنی مصنف نے ہر صحابی کے ذکر میں اس

کی ساری مرویات کو جمع کردے، خواہ وہ حدیثیں صحیح ہوں خواہ غیر صحیح، ان سب کو ایک مستقل عنوان سے جمع کردے، اس صورت میں مختلف احکام وابواب کی احادیث جو ایک صحابی سے مروی ہیں یکجا کردی جاتی ہیں، پھر اس طریقہ کے بعض مصنفین نے صحابہ کے نام حروف معجم کی ترتیب پر جمع کیے جیسے امام طبرانی نے المعجم الکبیر میں اور ضیاء مقدسی نے المختارۃ میں اسی طریقے سے کام لیا ہے یہ طریقہ دیگر طرق سے آسان ہے۔ اور بعض نے صحابہ کے ناموں کی ترتیب میں ان کے اسلام لانے کے تقدم وتاخر کو معیار بنایا ہے، چنانچہ پہلے عشرۂ مبشرہ کو بیان کیا پھر اہلِ بدر کو، پھر اہلِ حدیبیہ کو، پھر ان صحابہ کو جنہوں نے اسلام قبول کر کے صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان ہجرت کی پھر ان حضرات کو جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے، پھر صغیر السّن صحابہ کو، پھر عورتوں کے ذکر پر اپنی مسند ختم کی۔

اقسام پر تدوین و ترتیب

ان دو طریقوں کے علاوہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں ایک تیسرا طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی انھوں نے اپنی کتاب کو پانچ قسموں پر تقسیم کیا ہے۔ (۱) اوامر (۲) نواہی (۳) اخبار، (۴) اباحات (۵) افعالِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر ان پانچوں میں بہت سی انواع بیان کی ہیں، اس طرزِ تدوین کی وجہ سے صحیح ابن حبان میں حدیث کی تلاش میں بہت مشکل تھی اس لیے بعض متاخرین نے اسے فقہی ابواب پر مرتب کیا اور حافظ ابوالفضل عراقی نے اسے اطراف پر جمع کیا، نیز حافظ ابوالحسن ہیثمی نے صحیح ابن حبان کی ان تمام احادیث کو جو صحیحین (بخاری ومسلم) سے زائد تھیں دو جلدوں میں الگ جمع کیا۔

حروف معجم پر ترتیب

ان طرق تدوین وتالیف کے علاوہ محدثین نے کتب حدیث میں چند اور طریقے بھی استعمال کیے ہیں چنانچہ بعض نے حروف معجم پر احادیث کو مرتب کیا مثلاً اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات والی حدیث کو حرف الالف میں ذکر کیا۔ ابو منصور دیلمی نے مسند الفردوس میں ابن طاہر نے ابن عدی کی کتاب الکامل کی احادیث میں اور سیوطی نے جامع صغیر میں اختیار کیا ہے، حسن بن محمد صغانی لاہوری نے مشارق الانوار کو حروف معجم کی ترتیب پر مرتب

کتاب ہے، مگر عجیب جدت کے ساتھ بارہ ابواب قائم کیے ہیں (۱) پہلا باب ان احادیث ہیں جو مَن موصولہ یا مَن استفہامیہ سے شروع ہوتی ہیں (۲) جو اِنَّ سے شروع ہوتی ہیں (۳) لا (۴) اذا اور اذا (۵) ما مع انواعہ ویا مع انواعہ (۶) قل، لو، بلین وغیرہ (۷) مبتدا و معرف وغیرہ (۸) — (۹) عدد وغیرہ (۱۰) فعل ماضی (۱۱) لام ابتدار (۱۲) احادیث قدسیہ۔

اطراف پر تدوین و ترتیب بعض مصنفین نے احادیث کو اطراف پر جمع کیا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی حدیث کا ٹکڑا ذکر کر کے اس کی تمام سندوں کو جمع کر دیا جائے کسی خاص کتاب کی پابندی ہو یا نہ ہو، یہ طریقہ ابو العباس احمد بن ثابت عراقی نے اطراف الکتب الخمسہ میں اختیار کیا ہے۔ بعد میں مزی نے تحفۃ الاشراف لکھی جس میں یہی طریقہ اختیار کیا۔

معلّل مسانید حدیث کے طرقِ تصنیف میں سب سے اعلیٰ طریقہ احادیث معلّل کا جمع کرنا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ ہر حدیث کو اس کے طرق اور اختلاف رُواۃ کے ساتھ بیان کیا جائے۔ احادیث کے علل کا علم حدیث کے بہترین اور اہم علوم میں سے ہے، اس سے احادیث کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے، بعض محدثین نے علل کے ساتھ اپنی کتاب فقہی ابواب پر مرتب کی ہے، جیسے امام ابن ابی حاتم نے کیا۔ یہ طریقہ بہت آسان اور سہل الحصول ہے، بعض نے علل کے ساتھ مسانید کا طریقہ پسند کیا، جیسے حافظ یعقوب بن شیبہ (۲۶۲ھ) نے ایک مسند معلّل لکھی۔ لیکن افسوس کہ یہ مسند مکمل نہ ہو سکی، صرف عشرہ مبشرہ، عباس، عبداللہ بن مسعود، عتبہ بن غزوان، عمار اور بعض موالی کی مسانید تک ہے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی صرف مسند علی رضی اللہ عنہ پانچ جلدوں میں تھی، ان کے مکان میں چالیس لحاف رکھے رہتے تھے، تاکہ اس کے وراقوں اور کاتبوں کے کام آئیں، جتنی لکھی جا سکی اس پر دس ہزار دینار خرچ ہوئے، اگر یہ کتاب مکمل ہو جاتی تو تقریباً دو سو جلدوں میں ہوتی۔ بعض مشائخ کا قول ہے کہ کوئی مسند معلّل مکمل نہ ہو سکی۔

ایک باب یا شیخ، یا ترجمہ پر مستقل تصنیف اس دور کے محدثین کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ کسی ایک باب یا طرق و شیوخ اور تراجم میں سے ایک

پر حدیثوں کو یکجا کر دیا جائے۔ ایک باب پر مستقل کتاب کا رواج پرانا ہے، چنانچہ امام بخاری (۲۵۱
نے کتاب "رفع یدین فی الصلوٰۃ" اور امام دارقطنی (۳۸۵) نے "باب القضاء بالیمین مع الشا
کے نام سے مستقل کتاب تصنیف کی ہے، اسی طرح بہت سے محدثین نے کسی ایک شیخ کی احادیث ا
کیں مثلاً اسماعیلی نے امام اعمش کی احادیث کو اور امام فضیل بن عیاض کی احادیث کو جمع کیا، نیز
احادیث ایک ترجمہ سے آئیں ان کو علیحدہ جمع کیا گیا، جیسے مالک عن نافع عن ابن عمر" اور سہیل
بن ابی صالح عن ابیہ، عن ابی ہریرہؓ " اور " عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ" بعض احادیث کے
طرق ہی کو مستقل کتاب میں جمع کر دیا گیا، جیسے حدیث قبض العلم کے طرق کو طوسی نے اور حدیث
مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا کے طرق کو امام طبرانی نے جمع کیا ہے۔

تیسری صدی کی مشہور کتب احادیث

اس دور میں احادیث کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے چند اہم کتابوں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:۔

صحیح بخاری (۲۵۶ھ) صحیح مسلم (۲۶۱ھ) سنن ابی داؤد (۲۷۵ھ) سنن نسائی (۳۰۳ھ) جامع
ترمذی (۲۷۹ھ) سنن ابن ماجہ (۲۷۳ھ) مسند امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) المنتقی فی الاحکام ابن
الجارود (۳۰۷ھ) مصنف ابن ابی شیبہ (۲۳۵ھ) کتاب محمد بن نصر مروزی (۲۹۴ھ) مصنف
سعید بن منصور (۲۲۷ھ) تہذیب الآثار محمد بن جریر طبری (۳۱۰ھ) یہ امام طبری کی بہترین تصنیف
ہے، اس میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی مرویات کو ذکر کیا ہے اور ہر حدیث کے ضمن میں اس
علت، طرق، فقہ، اختلاف علماء حجج اور لغت پر کلام کیا ہے، اسی طرح عشرہ مبشرہ، اہل بیت
اور موالی کے مسانید اور مسند ابن عباس کا کچھ حصہ بیان کیا ہے، مسند کبیر بقی بن مخلد (۲۷۶
امام بقی بن مخلد نے اس مسند کو صحابہ کے نام پر ترتیب دیا ہے، اور تقریباً تیرہ سو صحابہ سے روایت کی ہر ساتھ
ہر صحابی کی مسند کو فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے، یہ کتاب بہت اہم ہے، مسند عبید اللہ بن موسیٰ (۲۱۳ھ) مسند اسحٰ
بن راہویہ (۲۳۸ھ) مسند عبد بن حمید (۲۴۹ھ) مسند دارمی (۲۵۵ھ) مسند ابی یعلیٰ موصلی (۳۰۷ھ) مسند ابن ابی
اسامہ حارث بن محمد تمیمی (۲۸۲ھ) مسند ابن ابی عاصم احمد بن عمر شیبانی (۲۸۷ھ) اس میں تقریباً ۵۰ ہزار احادیث موجو

مسند ابن ابی عمر محمد بن یحییٰ عدنی (م۲۴۳ھ) مسند ابی ہریرہ لابراہیم بن عسکری (م۲۸۲ھ) مسند امام علی بن احمد بن شعیب نسائی (م۳۰۳ھ) مسند العنبری لابراہیم بن اسمٰعیل طوسی (م۲۸۰ھ) مسند کبیر امام بخاری، مسند مسدد بن مسرہد (م۲۲۸ھ) مسند محمد بن مہدی (م۲۷۲ھ) مسند حمیدی (م۲۱۹ھ) مسند ابراہیم بن معقل نسفی (م۲۹۵ھ) مسند ابراہیم بن یوسف ہنجانی (م۳۰۱ھ) مسند مالک لاحمد بن شعیب نسائی (م۳۰۳ھ) مسند کبیر حسن بن سفیان (م۳۰۳ھ) مسند معلل ابوبکر بزار (م۲۹۲ھ) مسند ابن سنجر (م۲۵۸ھ) مسند کبیر یعقوب بن شیبہ (م۲۶۲ھ) مسند علی بن مدینی (م۲۳۴ھ) مسند ابن ابی عزرہ احمد بن حازم (م۲۷۶ھ) مسند عثمان بن ابی شیبہ (م۲۳۹ھ) وغیرہ وغیرہ۔

مسانید کا درجہ سنن سے کم ہے، کیونکہ مسانید میں صحیح وسقیم ہر قسم کی حدیثیں جو ایک صحابی سے مروی ہوتی ہیں درج کی جاتی ہیں اس لیے تمام مسانید سے احتجاج صحیح نہیں ہے، البتہ بعض ائمہ نے مسند امام احمد کو سنن کے درجے میں مان کر اس کی احادیث سے احتجاج کیا ہے یعنی ان کو حجت مانا ہے، اس میں کل چالیس ہزار احادیث ہیں جن میں مکررات دس ہزار ہیں اور تین سو سے زائد احادیث ثلاثیۃ الاسناد ہیں یعنی ان کے راوی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین راوی ہیں، ابن جوزی نے موضوعات میں مسند امام احمد کی پندرہ احادیث میں وضع کا خیال ظاہر کیا ہے، اور حافظ عراقی نے ان کی تعداد صرف نو بتائی ہے، لیکن حافظ ابن حجر نے "القول المسدد فی الذب عن المسند" میں صرف تین یا چار احادیث کو بے اصل قرار دیا ہے۔

مسند امام احمد کا درجہ

چوتھا دور

علم حدیث کی تنقیح وتہذیب

جیسا کہ معلوم ہوا تیسری صدی کا زمانہ علوم اسلامیہ کی تدوین وتالیف کے حق میں دورِ شباب تھا یہی زمانہ محدثین ورواۃِ حدیث کے طبقۂ متقدمین اور طبقۂ متاخرین میں حد فاصل ہے اور اس کے بعد جو حضرات آئے انھوں نے اپنے پیش رووں کی خوشہ چینی کی اور ایسے ائمہ ومحدثین بہت کم

پیدا ہوئے جنھوں نے من حیث الفن فنِ حدیث میں کوئی اضافہ کیا ہو، متقدمین نے جو کچھ کیا تھا دوسرں کی تقلید میں نہیں کیا بلکہ خود اپنی تحقیق کی بنا پر کیا اور متاخرین نے بھی بہت کچھ کیا مگر ان کے نقش قدم پر چل کر یہ کام کیا، انھوں نے دوسری اور تیسری صدی کی کتابوں کی طرف مراجعت کر کے کتب احادیث کی تدوین و ترتیب اور جمع و تالیف میں اور احادیث و رجال کی تحقیق میں بہت بڑا کارنامہ انجام دیا اس دور میں ہر حدیث پر مفصل کلام کیا گیا، ہر بات کی تنقیح کی گئی، اور ہر مسئلے کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی، یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تصنیفات مفصل ہونے کے ساتھ منقح و مہذب ہیں۔

چوتھی صدی کی مشہور کتب احادیث چوتھی صدی میں حدیث کی جو کتابیں لکھی گئیں ان میں یہ قابلِ ذکر ہیں، المعجم الکبیر، المعجم الاوسط، اور المعجم الصغیر امام سلیمان بن احمد طبرانی (۳۶۰ھ) معجم کبیر کو طبرانی نے حروف کے اعتبار سے صحابہ کے نام پر مرتب کیا اس میں تقریباً ساڑھے بیس ہزار احادیث ہیں اور معجم اوسط اور معجم صغیر کو حروف کے اعتبار سے اپنے شیوخ پر ترتیب دیا۔ اور بعد میں معجم کبیر کو علاء الدین علی بن بلبان فارسی (۷۳۹ھ) نے بہتر طریقے پر مرتب کیا، کتاب السنن دار قطنی (۳۸۵ھ) صحیح ابی حاتم محمد بن حبان بستی (۳۵۴ھ) صحیح ابی عوانہ یعقوب بن اسحاق (۳۱۶ھ) صحیح ابن خزیمہ محمد بن اسحاق (۳۱۱ھ) صحیح المنتقی السکن سعید بن عثمان بغدادی (۳۵۳ھ) المنتقی لقاسم بن اصبغ اندلسی (۳۴۰ھ) معانی الآثار لابی جعفر الطحاوی (۳۲۱ھ) مسند ابن جمیع محمد بن احمد (۴۰۲ھ) مسند محمد ابن اسحاق (۳۱۳ھ) مسند الخوارزمی (۴۲۵ھ) مسند ابی اسحاق بن نصر رازی (۳۸۵ھ) وغیرہ وغیرہ۔

سنن و احادیث کی جمع و ترتیب، رُواۃ حدیث کی جرح و تعدیل، اور علل حدیث کی تشریح و توضیح کا کام چوتھی صدی تک قریب قریب مکمل ہوگیا۔ دینی معاملات و مسائل میں اس وقت اجتہاد کی ضرورت ختم ہو گئی اور امت مسلمہ میں تقلید و اتباع کا مسلک رائج ہو گیا اور اسی کے ساتھ ساتھ کتب احادیث کے لکھنے کا رنگ بھی بدل گیا، اس دور میں عموماً کتب احادیث و سنن تہذیب و تنقیح شرح و توضیح۔ اور حل الفاظ و لغات کے شعبوں میں منقسم ہو گئیں، کسی مصنف نے طرز بیان بدل دیا

کسی نے جداگانہ ترتیب قائم کی، کسی نے ایجاز و اختصار سے کام لیا، اور کسی نے حدیث و فقہ میں ہم آہنگی پیدا کی، البتہ مسانید میں قدماء ہی کی پیروی کی گئی، اور ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

دورِ تہذیب کی جامع کتبِ احادیث

اس دور میں بہت سے علماء نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیثوں کو یکجا کیا اور اس سلسلہ میں یہ حضرات زیادہ مشہور ہیں، محمد بن عبداللہ جوزقی (۳۸۸ھ) اسمٰعیل بن احمد المعروف بابن الفرات (۴۱۴ھ)، محمد بن ابی نصر حمیدی اندلسی (۴۸۸ھ)، انھوں نے اپنی کتاب میں کچھ ایسی احادیث کا اضافہ بھی کیا جو صحیح ہیں مگر صحیحین میں نہیں ہیں، حسین مسعود بغوی (۵۱۶ھ) محمد بن عبدالحق اشبیلی ۵۸۲ھ احمد بن محمد قرطبی المعروف بابن ابی حجہ ۶۴۲ھ۔

صحاح ستہ کی صحیح احادیث کے جامعین میں یہ مصنفین مشہور رہے ہیں، عبدالحق بن عبدالرحمٰن اشبیلی المعروف بابن الخراط ۵۸۲ھ، قطب الدین محمد بن علاء الدین مکی ۹۹۰ھ ان کی کتاب بہت مہذب و مرتب ہے۔

ابوالحسن احمد بن رزین بن معاویہ عبدری قرطبی ۵۳۵ھ نے تجرید الصحاح کے نام سے صحاح کی حدیثوں کو جمع کیا، مگر یہ کتاب ترتیب و تہذیب کے اعتبار سے قابل توجہ تھی، نیز انھوں نے صحاح ستہ کی بعض صحیح احادیث کو چھوڑ دیا تھا، اس لیے ابوالسعادات مبارک بن محمد المعروف بابن اثیر جزری شافعی ۶۰۶ھ نے اسے فقہی ابواب پر مرتب کیا، اور جو صحیح حدیثیں رہ گئی تھیں، ان کو داخل کیا، غریب الفاظ اور مشکل اعراب کی شرح و توضیح کی، سندوں کو حذف کر کے حدیث کے رواۃ میں صرف تابعی یا صحابی کا نام رکھا، تابعین اور ائمہ کے اقوال کو بہت کم ذکر کیا۔ ابواب کی ترتیب حروفِ معجم پر دی، اور اس کا نام "جامع الاصول لاحادیث الرسول" رکھا، چنانچہ یہ کتاب جامعیت ترتیب اور شرح کے اعتبار سے حدیث کی منفرد کتاب ثابت ہوئی۔ بعد میں بہت سے محدثین نے اس جامع الاصول کا اختصار کیا جن میں یہ حضرات زیادہ مشہور رہیں، محمد [illegible] (۶۹۲ھ) [illegible] ہبۃ اللہ بن عبدالرحیم حموی (۷۱۸ھ)، عبدالرحمٰن بن علی المعروف بابن الدیبع شیبانی زبیدی (۹۴۴ھ) [illegible]

کتاب جامع الاصول کے مختصرات میں سب سے اچھی ہے، مصر میں تین جلدوں میں چھپ چکی ہے، ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی ۸۱۷ھ نے "تسہیل الوصول الی الاحادیث الزائدة علی جامع الاصول" لکھی، جس میں ان صحیح احادیث کو درج کیا جو جامع الاصول میں نہیں ہیں۔

اس دور کی عام جوامع

(۱) جامع المسانید والالقاب، امام ابوالفرج عبدالرحمن بن علی جوزی ۵۹۷ھ نے اس کتاب میں صحیحین، مسند امام احمد، اور جامع ترمذی کی حدیثوں کو جمع کیا ہے، اور احمد بن عبداللہ مکی ۶۹۴ھ نے اسے باقاعدہ ترتیب دیا ہے۔

(۲) جامع المسانید والسنن، الہادی لاقوم سنن، حافظ اسمٰعیل بن عمر قرشی دمشقی المعروف بابن کثیر ۷۷۴ھ نے اس کتاب میں صحیحین، نسائی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، مسند ابی یعلی اور معجم کبیر طبرانی کی حدیثوں کو جمع کیا ہے۔

(۳) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، حافظ ابوالحسن علی بن ابی بکر شافعی ہیثمی ۸۰۷ھ نے اس کتاب میں مسند احمد، مسند ابویعلی، مسند بزار اور طبرانی کی معجم کبیر، معجم اوسط اور معجم صغیر سے زائد صحیح[1] حدیثوں کو ذکر کیا ہے۔

(۴) مصابیح السنة، امام حسین بن مسعود بغوی ۵۱۶ھ نے اس میں ۴۴۸۴ صحاح وحسان احادیث کو جمع کیا ہے، بغوی کی مراد صحاح سے وہ حدیثیں ہیں جو بخاری ومسلم میں ہیں، اور حسان سے مراد وہ حدیثیں ہیں جو ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں ہیں، اگر اس میں ضعیف یا غریب حدیث آگئی تو امام بغوی نے اسے ظاہر کردیا ہے اور منکر یا موضوع حدیث کو نہیں ذکر کیا ہے، علماء نے مصابیح السنة کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کی بہت سی شرحیں لکھی ہیں، امام محمد بن خطیب ۷۳۷ھ نے مصابیح السنة کی تکمیل کی ہے اور ابواب[2] کا عنوان قائم کیا ہے، ہر حدیث کے صحابی راوی کا نام اور اس کتاب کا حوالہ دیا ہے جس میں یہ حدیث موجود ہے، مصابیح السنة کے ابواب میں صحاح اور حسان کے علاوہ ایک تیسرا باب قائم کرکے اپنی طرف سے سنن وجوامع کی حدیثوں کا اضافہ کیا، اور مہذب ومرتب کرکے اس مجموعہ کا نام مشکاة المصابیح رکھا، جو مشکوٰة کے نام سے مشہور ہے۔

[1] اس میں صرف صحیح احادیث کو جمع نہیں کیا بلکہ ضعاف بھی موجود ہیں۔

[2] ابواب نہیں بلکہ تیسری فصل کا اس میں اضافہ کیا ہے

مشکاة

اس کتاب کو بھی طبقۂ علماء میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔

(۵) جمع الجوامع فی الحدیث، امام جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابوبکر سیوطی ۹۱۱ھ نے اس کتاب میں صحاح ستہ وغیرہ کی احادیث کو جمع کیا ہے، امام سیوطی کا ارادہ تھا کہ اس کتاب میں تمام احادیث نبویہ جمع کر دی جائیں۔ مگر بقول مناوی اس کی تکمیل سے پہلے ہی سیوطی کا وصال ہو گیا۔ اس میں بہت سی ضعیف بلکہ موضوع احادیث تک آگئی ہیں، بعد میں امام علاء الدین علی بن حسام الہندی المعروف بعلی متقی جونپوری برہان پوری مکی ۹۷۵ھ نے اس کی ترتیب دی اور تنقیح و تہذیب کے بعد اس کا نام "کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال" رکھا۔ سیوطی نے اپنی کتاب جمع الجوامع کا اختصار الجامع الصغیر کے نام سے کیا ہے۔

(۶) اتحاف الخیرۃ بزوائد المسانید العشرہ، احمد بن ابوبکر بوصیری ۸۴۰ھ نے اس میں ان تمام احادیث کو جو صحاح ستہ سے زائد ہیں کتب ذیل سے جمع کیا ہے، مسند ابوداؤد طیالسی، مسند حمیدی، مسند مسدد بن مسرہد، مسند ابن ابی عمر، مسند اسحاق بن راہویہ، مسند ابن ابی شیبہ، مسند احمد بن منیع، مسند عبد بن حمید، مسند حارث بن محمد بن ابی اسامہ، اور مسند ابویعلی، یہ کتاب ایک سو جلدوں پر مرتب ہوئی ہے۔

(۷) بحر الاسانید حافظ حسن بن احمد سمرقندی ۴۹۱ھ نے اس کتاب میں ایک لاکھ احادیث کو مہذب و مرتب طریقے پر جمع کیا ہے کہا جاتا ہے کہ اسلام میں اس کے مانند کوئی دوسری کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

احادیث کے احکام کی جامع کتابیں

(۱) الامام فی احادیث الاحکام، ابن دقیق العید ۷۰۲ھ نے اس کتاب میں پہلے احکام کے متون کو جمع کیا، پھر اس کی خود ہی شرح لکھی جس کا نام الامام ہے، افسوس کہ یہ شرح مکمل نہ ہو سکی، کہا جاتا ہے کہ اس باب میں اس سے بڑی کتاب تصنیف نہیں کی گئی۔

(۲) دلائل الاحکام من احادیث النبی علیہ السلام، ابن شداد حلبی نے یہ کتاب دو جلدوں میں لکھی ہے۔ اس میں ان احادیث پر کلام کیا گیا ہے جن سے فقہ کے فروعی احکام مستنبط ہوتے ہیں۔

(۳) منتقی الاخبار فی الاحکام، حافظ مجد الدین ابو البرکات عبد السلام بن عبد اللہ بن ابو القاسم حرانی المعروف بابن تیمیہ حنبلی ۶۵۲ھ نے یہ کتاب صحیحین، مسند امام احمد، جامع ترمذی، سنن نسائی ابو داؤد، ابن ماجہ سے منتخب کر کے مرتب کی ہے، ماخذ کے ظاہر کر دینے کے بعد اسانید کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی اس لیے اسانید کو حذف کر دیا ہے، صاحب البدر المنیر نے لکھا ہے کہ یہ نہایت بہتر کتاب ہے البتہ امام ابن تیمیہ نے بہت سی احادیث کو ائمہ حدیث کی طرف منسوب کر کے چھوڑ دیا ہے اور ان کی تحسین تضعیف نہیں کی ہے، مثلاً صرف رواہ احمد، رواہ دار قطنی، رواہ ابو داؤد لکھ دیتے ہیں، حالانکہ وہ حدیث ضعیف ہوتی ہے، بلکہ مزید براں یہ ہے کہ امام ترمذی نے جس حدیث کی صاف تضعیف کی ہے اسے امام ابن تیمیہ صرف رواہ الترمذی لکھ دیتے ہیں اور اس کے ضعف کو بیان نہیں کرتے ہیں حالانکہ ان کو یہ بھی بیان کرنا چاہیے، اور ان باتوں کو کتاب کے حاشیہ پر لکھا یا کسی دوسری کتاب میں بیان کیا جو مکمل نہ ہو سکی، مشہور یمنی عالم و محدث علامہ محمد بن شوکانی ۱۲۵۰ھ نے نیل الاوطار کے نام سے منتقی الاخبار کی مفصل شرح آٹھ جلدوں میں لکھی ہے۔

(۴) بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام، حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ کی یہ کتاب چودہ سو احادیث احکام پر مشتمل ہے، اس کتاب کی بہت سی شرحیں لکھی جا چکی ہیں،

(۵) السنن الکبریٰ، امام احمد بن حسین بیہقی ۴۵۸ھ کی اس کتاب کے بارے میں ابن صلاح کی رائے ہے کہ کتب احادیث میں ادلہ کی جامعیت کے اعتبار سے کوئی کتاب سنن کبری بیہقی سے زیادہ مکمل نہیں ہے، گویا اس کتاب میں بیہقی نے روئے زمین کی تمام احادیث کو جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

(۶) سنن الدار قطنی، حافظ ابو الحسن علی بن عمر بن احمد بغدادی دار قطنی ۳۸۵ھ کی یہ کتاب بہت مشہور ہے چھپ چکی ہے۔

(۷) عمدۃ الاحکام، حافظ عبد الغنی بن عبد الواحد مقدسی دمشقی ۶۰۰ھ نے اس میں احکام کی ان احادیث کو جمع کیا ہے جن میں بخاری و مسلم کا اتفاق ہے اس کی شرح ابن دقیق العید

نے کی ہے، چار جلدوں میں چھپی ہے۔

(۸) احکام الصغریٰ، حافظ ابو محمد عبدالحق بن عبدالرحمٰن المعروف بابن الخراط ازدی اشبیلی ۵۸۱ھ نے لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب میں ان احادیث کو امام مالک، امام بخاری، امام مسلم کی کتابوں اور بقیہ صحاح وسنن سے جمع کیا ہے جو لوازم شرع مثلاً احکام، حلال، حرام، ترغیب و ترہیب وغیرہ کے بارے میں ہیں۔

صحیح حدیث کی سات قسمیں

جمہور محدثین نے صحت کے احوال و اوصاف کے اعتبار سے صحیح حدیث کی سات قسمیں قرار دی ہیں، اور ان میں ہر پہلی قسم دوسری قسم سے صحت میں بڑھی ہوتی ہے۔ (۱) وہ حدیث جسے بخاری و مسلم نے بیان کیا ہے، اسے متفق علیہ کہتے ہیں، (۲) جسے صرف امام بخاری نے بیان کیا ہے (۳) جسے صرف امام مسلم نے بیان کیا ہے (۴) وہ حدیث جو علی شرط الصحیحین ہو، یعنی بخاری و مسلم کے معیار کے مطابق ہو لیکن ان دونوں اماموں میں سے کسی نے اسے اپنی کتاب میں بیان نہ کیا ہو۔ (۵) وہ حدیث جو بخاری کی شرط پر ہو لیکن بخاری نے اسے بیان نہ کیا ہو (۶) وہ حدیث جو مسلم کی شرط پر ہو لیکن مسلم نے اسے بیان نہ کیا ہو۔ (۷) وہ حدیث جس کی تصحیح کسی معتمد اور ثقہ امام نے کی ہو، ان اقسام سبعہ میں سے ہر پہلی قسم دوسری قسم سے فی الجملہ زیادہ صحیح ہوتی ہے، یعنی ہو سکتا ہے کہ کسی وجہ سے مسلم کی کوئی حدیث بخاری کی حدیث پر صحت کے اعتبار سے مرجح قرار دے دی جائے۔

صحت کے اعتبار سے کتب حدیث کی ترتیب

احادیث کی بے شمار کتابوں میں صحت کی ترتیب پر مختلف رائیں ہیں، امام ابن حزم اندلسی (۴۵۶ھ) نے اس بارے میں اپنی کتاب مراتب الدیانۃ میں ایک طویل بحث کی ہے، امام سیوطی نے اس کا خلاصہ کیا ہے جو درج ذیل ہے۔

امام ابن حزم کے نزدیک کتب احادیث کی ترتیب صحت کے اعتبار سے یہ ہے: صحیح بخاریؒ، صحیح مسلمؒ، صحیح سعید بن سکنؒ، المنتقیٰ ابن جارودؒ، المنتقیٰ قاسم بن اصبغ، ان کتابوں کے بعد ابوداؤد،

نسائی، مصنف قاسم بن اصبغ، مصنف طحاوی ۳۲۱ھ، مسند احمد[11]، مسند بزار ۲۹۲ھ، مسند ابی بکر ۲۳۵ھ، مسند عثمان[13] ۲۳۹ھ، مسند ابن ابی شیبہ[14]، مسند ابن راہویہ[15] ۲۳۸ھ، مسند طیالسی[16] ۲۰۴ھ، مسند حسن بن سفیان[17] ۳۰۳ھ، مستدرک حاکم[18] ۴۰۵ھ، کتاب ابن سحر[19] ۲۵۸ھ، یعقوب بن شیبہ[20] ۲۶۲ھ، علی بن مدینی[21] ۲۳۴ھ، ابن ابی عزرہ[22] ۲۷۶ھ اور اسی قسم کی کتب احادیث جو کتب مذکورہ کی صف میں شمار ہوتی ہیں اور صرف احادیث نبویہ پر لکھی گئی ہیں۔

اس کے بعد ان کتابوں کا درجہ ہے جن میں احادیث رسول کے ساتھ دوسروں کے اقوال اور فتاوے بھی ہیں، پھر ان کتابوں کا درجہ ہے جن میں صحیح احادیث ہیں، جیسے مصنف عبد الرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف بقی بن مخلد قرطبی، کتاب محمد بن نصر مروزی، کتاب ابن المنذر، اس کے بعد مصنف حماد بن سلمہ ۱۶۷ھ، مصنف سعید بن منصور ۲۲۷ھ، مصنف وکیع بن جراح ۱۹۷ھ مصنف رزبانی، موطا امام مالک، موطا ابن ابی ذئب ۱۵۹ھ موطا ابن وہب ۱۹۷ھ، مسائل احمد بن حنبل، فقہ ابی عبید ۲۲۴ھ فقہ ابی ثور ۲۴۰ھ نیز وہ کتابیں جو اس معیار کی مشہور ہیں جیسے حدیث شعبہ ۱۶۰ھ وسفیان ۱۹۸ھ ولیث بن سعد ۱۷۵ھ واوزاعی ۱۵۶ھ و حمیدی ۲۱۹ھ وابن مہدی ۱۹۸ھ، ومسدد ۲۲۸ھ۔

یہ سب کتابیں موطا امام مالک کے ہم پایہ ہیں اور صحت کے اعتبار سے بعض موطا سے زیادہ جامع ہیں، بعض اس کے مثل ہیں اور بعض اس سے کم درجہ کی ہیں، حدیث شعبہ میں ۸۰۰ صحیح اور ۲۰۰ سے زائد مسند اور مرسل حدیثیں ہیں، موطا امام مالک اور حدیث سفیان بن عیینہ میں سے ایک میں ۵۰۰ سے زائد مسند اور ۳۰۰ سے کچھ زائد مرسل احادیث ہیں، موطا امام مالک میں ستر سے کچھ زائد وہ احادیث ہیں جن پر خود امام مالک کا عمل نہیں تھا، کچھ ایسی حدیثیں بھی ہیں جن کو جمہور محدثین نے ضعیف بتایا ہے۔

کتب حدیث کے چار طبقات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ۱۱۷۶ھ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کتب حدیث کے طبقات و درجات کے بارے میں

مفصل بحث کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث کی کتابوں کے چار طبقے ہیں۔

(۱) پہلے طبقہ میں تحقیق کے بعد میں موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم شامل ہے۔

(۲) دوسرے طبقہ میں وہ کتابیں شامل ہیں جو موطا اور صحیحین کے درجہ کی تو نہیں ہیں لیکن ان ہی کے قریب قریب ہیں، اور جن کے مصنفین ثقاہت، عدالت، حفظ اور علم حدیث کے تبحر میں مشہور ہیں، اور انہوں نے جمع احادیث میں تساہل سے کام نہ لیا ہو، اور بعد کے فقہار اور محدثین نے ان کی کتابوں کو مقبول و معتبر قرار دیا ہو۔ اور عام طور سے وہ کتابیں دائر و سائر ہوں، جیسے سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، مجتبیٰ نسائی، یہ کتابیں صحت و حجت میں طبقہ اولیٰ میں شریک ہیں، رزین بن معاویہ عبدری سرقسطی نے تجرید الصحاح میں اور ابن اثیر نے جامع الاصول میں ان کتابوں کو یہی حیثیت دی ہے۔ اور مسند امام احمد بھی قریب قریب طبقہ اولیٰ میں شمار ہوتی ہے،

(۳) تیسرے طبقہ میں وہ جوامع و مسانید اور مصنفات ہیں جو بخاری و مسلم سے پہلے یا ان کے زمانے میں یا پھر ان کے تھوڑے بعد تصنیف ہوئیں، جن میں صحیح، حسن، ضعیف، معروف، منکر، غریب شاذ، خطا، صواب، ثابت اور مقلوب ہر قسم کی حدیثیں موجود ہیں، اور بخاری و مسلم کی کتابوں کی طرح فقہا و محدثین میں مشہور نہ ہوں، نہ ان کے متفردات کو فقہار نے بہت زیادہ قبولیت بخشی ہو نہ ان کے ضعف و صحت کو محدثین نے پورے تلاش و تفحص کے ساتھ ظاہر کیا ہو، نہ ان کے غریب الفاظ کی شرح کسی مستند امام لغت نے کی ہو، نہ کسی فقیہ نے ان کی حدیثوں کو سلف کے مسلک پر تطبیق دی ہو۔ نہ کسی محدث نے ان کے مشکلات کو بیان کیا ہو۔ اور نہ ہی کسی مورخ اور تذکرہ نویس نے ان کے رجال کا ذکر کیا ہو۔ ان وجوہ سے قدمار کی یہ کتابیں شہرت نہ پا سکیں اور نہ محدثین کے زمرے میں ان کو مقبولیت حاصل ہو سکی، مسند ابو یعلیٰ، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابی بکر بن شیبہ، مسند عبد بن حمید، مسند طیالسی، کتب بیہقی، کتب طحاوی، اور کتب طبرانی وغیرہ اسی قسم کی کتابیں، ان کے مصنفین کا مقصد ایسی تمام احادیث کو جمع کر دینا تھا جو ان کو ملیں، وہ ان کی تہذیب و تلخیص اور تحقیق کے درپے نہ ہوئے ——

(۴) چوتھے طبقہ میں وہ کتب احادیث جن کے مصنفین نے حدیث کی تدوین وتالیف کے عہدِ شباب کے صدیوں بعد ان حدیثوں کو جمع کیا جو پہلے اور دوسرے طبقہ کے مصنفین سے رہ گئی تھیں، مگر مختلف مجموعوں اور مسندوں میں موجود تھیں، یا یہ صحابہ، تابعین اور متقدمین حکمار و واعظین کے اقوال و آثار تھے، جنہیں قصداً یا سہواً راویوں نے احادیث نبویہ میں خلط ملط کردیا تھا، یا یہ روایات قرآن کے محتملات اور احادیث صحیحہ کے ہم معنی تھیں اور پاک باطن لوگوں نے جو روایت کے اصول سے ناآشنا تھے، ان کو روایت بالمعنی کردیا۔ یا جو باتیں قرآن و حدیث کے اشاروں سے مفہوم ہوتی تھیں ان کو حدیث کے نام سے روایت کردیا ۔ حدیث کے مختلف ٹکڑے جو کتب حدیث میں منتشر تھے ان کو یکجا کرکے ایک مستقل حدیث بنادیا، اس قسم کے جامع اور راوی زیادہ تر واعظ، قاصّ، ضعفار اور اہل ہوا ہیں، ایسی حدیثیں کتاب الضعفار ابن حبان، الکامل ابن عدی، اور خطیب بغدادی، ابونعیم اصفہانی، جوزقانی، ابن عساکر، ابن نجار، اور دیلمی کی کتابوں میں زیادہ ملتی ہیں، مسند خوارزمی بھی ان ہی کتابوں کے قریب ہے۔

اس طبقہ کی حدیثوں میں معتمد احادیث وہ ہیں جو ضعیف ہیں، اور غیر احادیث وہ ہیں جو موضوع اور مقلوب ہیں، امام ابن جوزی نے اسی دور کی احادیث کی تحقیق کے لیے موضوعات پر زیادہ تر کتابیں لکھی ہیں، پہلا اور دوسرا طبقہ محدثین اور فقہار کے نزدیک معتمد و معتبر ہے اور ان ادوار کی حدیثیں مقبول ہیں، تیسرے دور کی احادیث پر کلام ان محدثین و ناقدین کا کام ہے جو اسمار الرجال اور علل حدیث کے باب میں پورا علم رکھتے ہیں اور کھرے کھوٹے کو پہچانتے ہیں، البتہ اس طبقہ کی متابعات اور شواہد کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، چوتھے طبقہ کی احادیث سے تعلق و استنباط متاخرین کی خصوصیت ہے، اس طبقہ کی حدیثوں سے ادنیٰ تعلق اور معمولی اشارے کی بنا پر مبتدعین اور روافض وغیرہ حجت پکڑتے ہیں اور ان کو اپنی دلیل بناتے ہیں، اور اپنے خیالات و رجحانات پر ان سے شواہد لاتے ہیں لیکن محدثین کے نزدیک ان حدیثوں سے استدلال صحیح نہیں ہے۔

(۲)

چند اہم اور مشہور کتب احادیث

احادیث کے جمع و تالیف کے پہلے دور تک، جو صحابہ اور کبار تابعین کی روایت و کتابت کا زمانہ ہے اور پہلی صدی پر ختم ہوجاتا ہے، احادیث کی جو ذاتی اور شخصی تحریریں اور یادداشتیں مرتب ہوئی تھیں وہ تمام صحیفے اور کُراسے بعد کی مدوّنات میں شامل کردیئے گئے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رض کے مجموعۂ احادیث الصادقہ کی تمام روایتیں بعد میں عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے کتب احادیث میں داخل کرلی گئیں، اسی طرح حضرت ابوہریرہ رض کے تلمیذ حضرت ہمّام بن منبہ رح کا صحیفہ جو ۵۸ھ میں مرتب ہوا، اس کی تمام حدیثیں صحیح مسلم وغیرہ میں آگئیں، اس دور کی دیگر تحریروں کا یہی حال ہوا کہ وہ سب کی سب بعد کی کتابوں میں آگئیں، اور اگر ان میں سے کسی کا وجود باقی رہا تو چند صفحات یا اوراق میں تبرکات کی حیثیت سے خال خال کتب خانوں میں ان کا نشان ملتا ہے؛ البتہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس دور کی صرف ایک تحریر صحیفۂ ہمّام بن منبہ کی اشاعت ہوسکی ہے، جسے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب حیدرآبادی ثم فرانساوی نے تحقیق و تلاش کرکے دمشق سے شایع کیا ہے اور اُردو ترجمہ کے ساتھ حیدرآباد سے بھی اس کی طباعت و اشاعت ہوئی ہے۔

دوسرے دور کی کتبِ احادیث اور مدوّنات کا حال بھی تقریباً یہی ہے کہ وہ سب کی سب بعد کی کتابوں میں آگئیں، اور ان کی حیثیت مستقل تصنیف و تالیف کی نہیں رہی، مگر پہلے دور کے صحیفوں و یادداشتوں کے مقابلہ میں اس دور کی یہ چیزیں پائیدار ہیں اور ان میں سے کئی کتابیں بعد تک مستقل حیثیت کے ساتھ اہلِ علم کے پاس محفوظ رہیں۔ چنانچہ امام سفیان ثوری رح

اور امام حسن بصریؒ اور امام اوزاعیؒ کے فقہی مذاہب کی طرح ان کی کتابیں بھی دوسری صدی کے خاتمہ تک متداول و مستعمل رہیں اور امام ثوریؒ کا فقہی مسلک اور ان کی کتابیں تیسری صدی تک رائج رہیں، اس دور کی کتب احادیث میں مؤطا امام مالک کو جو مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی اس نے اس دور کی تمام مدونات کو پیچھے کر دیا، پھر بھی ان میں سے بعض کے نسخے یا اجزاء اب بھی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ شیخ محمد عز قدی مفتی لبنان نے اتحاف ذوی العلام میں لکھا ہے کہ جامع قرویین (فاس مغرب) کے کتب خانہ میں امام اوزاعی کی کتاب کا قلمی نسخہ نہایت باریک خط میں ایک ضخیم جلد میں موجود ہے، اگر اسے عام اور عادی خط میں لکھا جائے تو یہ کتاب چار جلدوں میں آسکتی ہے، اسی طرح اس دور کی دوسری کتابوں کا پتہ عالم اسلام کے بعض کتب خانوں میں چلتا ہے اور ان کو تلاش کر کے شایع کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی کتاب الآثار، اور کتاب الحجۃ، علی اہل المدینۃ، اور امام ابو یوسف کی کتاب الآثار اور کتاب الرد علی سیر الاوزاعی وغیرہ ہمارے زمانے میں پہلی بار لجنۃ احیاء المعارف النعمانیۃ حیدر آباد سے شایع ہوئی ہیں ــــ کتاب السیر الکبیر امام محمد، مؤطا امام محمدؒ اور کتاب الخراج امام ابو یوسف بھی اسی دور کی کتابیں ہیں جو بہت پہلے چھپ کر عام ہو چکی ہیں۔ اس دور کی ایک اہم ترین کتاب کتاب الزہد والرقائق عبداللہ بن مبارک حال میں ہندوستان سے شایع ہوئی ہے، الجامع لابن وہب تلمیذ امام مالک کا ایک ٹکڑا فوٹو کے ذریعہ قاہرہ کے معہد فرنسی نے شایع کیا ہے۔

تیسرے دور میں جو باقاعدہ حدیث کی تدوین کا دور ہے جو کتابیں لکھی گئیں وہ پہلے کی تمام مدونات و تصنیفات کی جامع تھیں اور اب تک حدیث پر جو کام ہوا تھا تقریباً سب ان میں مدغم و منضم ہو گیا، اس لیے اس دور کی کتابیں پہلے دونوں ادوار کی کتابوں کے مقابلہ میں دیرپا اور متداول رہیں اور صحاح ستہ، مسند امام احمد اور شرح معانی الآثار طحاویؒ کی مقبولیت و شہرت کے باوجود ان کا رواج رہا، ان کے قلمی نسخے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کی طباعت و اشاعت بھی ہوتی رہی، چنانچہ ان میں سے الادب المفرد بخاری، سنن دارمی، سنن دار قطنی، مسند ابو داؤد طیالسی،

مسند ابوعوانہ، مسند حمیدی، سنن سعید بن منصور (کا ایک حصہ) ہندوستان میں شائع کی گئیں، اور مصنف ابن ابی شیبہ اور مصنف عبدالرزاق کی اشاعت بھی یہیں سے شروع ہوئی ہے، ان کتابوں کے علاوہ مسند امام زید بن علی، مسند عمر بن خطاب روایۃ ابن ابی شیبہ، المنتقی ابن جارود، صحیح ابن حبان (جزء اول) وغیرہ وغیرہ مصر سے شایع ہو چکی ہیں اور ہمارے زمانے میں عالم اسلام خصوصاً عرب ممالک اور ہندوستان میں قدماء کی کتابوں کے ساتھ اعتنا بہت بڑھ گیا ہے اور ان کی نادر و نایاب کتابیں یورپ اور ایشیا وغیرہ کے کتب خانوں سے تلاش کر کے بہترین تعلیق و تحقیق کے بعد شایع کی جارہی ہیں اور یہ معاملہ حدیث ہی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے مختلف علوم و فنون کے بہترین اور قدیم ترین دفینے ہمارے سامنے آرہے ہیں، اب ہم مختصر طور سے موطا امام مالک مسند امام احمد اور صحاح ستہ کا تعارف کراتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ ان کتابوں میں کیا خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے یہ اپنے اپنے ادوار کی بہترین کتابیں قرار دی گئیں اور مسلمانوں نے ان کے ساتھ اس قدر اعتنا کیا۔

موطا امام مالک

دوسری صدی کی تصنیفات میں موطا امام مالک کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی دوسری کتاب کو نہ مل سکی، حالانکہ اس دور میں موطا امام مالک کے طرز پر اور اس کے مقابلہ میں بہت سی موطائیں لکھی گئیں، مگر روز اول سے آج تک امت میں جو رتبہ امام مالک کی کتاب کا ہے، اس میں کوئی دوسری کتاب شریک نہیں ہے علماء نے ہر دور میں اس کو مرکزی حیثیت دی ہے، اور اس کی بے شمار شرحیں لکھی ہیں۔

حضرت امام ابوعبداللہ مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ دارالہجرۃ مدینہ منورہ کے امام اور فقہاء حجاز کے سرخیل ہیں، مدینہ منورہ میں ۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۷۹ھ میں فوت ہوئے، خلیفہ ابوجعفر منصور عباسی نے حج کے موقع پر آپ سے ملاقات کی اور دینی مسائل پر ایک کتاب لکھنے کی درخواست کی، چنانچہ فقہ و حدیث میں موطا تصنیف فرمائی، خلیفہ مہدی عباسی نے موطا کا سماع کیا، خلیفہ ہارون رشید اور اس کے دونوں شہزادوں امین اور مامون نے مدینہ

منورہ آکر آپ سے موطا کا سماع کیا۔

احادیث کی تعداد

ابن الہباب کا بیان ہے کہ امام مالک نے ایک لاکھ احادیث کی روایت کی ہے، ابتدا میں ان میں سے دس ہزار حدیثیں موطا میں لکھیں، پھر ان کی تہذیب و تنقیح کرتے رہے حتی کہ پانچ سو باقی رہ گئیں، ابوبکر ابہری کا قول ہے کہ موطا کے تمام آثار جو رسول اللہ صحابہ اور تابعین سے منقول ہیں ان کی تعداد (۱۷۲۰) ہے ان میں مسند احادیث (۶۰۰) مرسل (۲۲۸) موقوف (۶۱۳) اور تابعین کے اقوال (۲۸۵) ہیں، چونکہ موطا کے بہت سے نسخے ہیں اس لیے احادیث کے عدد میں اختلاف ہو گیا ہے، چنانچہ موطا امام محمد جو موطا امام مالک ہی کا ایک نسخہ ہے، اس میں تمام احادیث و آثار مسند غیر مسند موقوف، غیر موقوف یعنی مرفوع (۱۱۸۰) ہیں، ان میں سے عن مالک (۱۰۰۵) عن ابی حنیفہ (۱۳) عن ابی یوسف (۴) اور باقی دیگر طرق و اسناد سے ہیں۔

روایات اور نسخے

قاضی عیاض کے قول کے مطابق موطا کے مشہور نسخے ۲۰ ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ تیس[۳۰] ہیں، شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی نے بستان المحدثین میں لکھا ہے کہ آج کل عرب میں موطا کے سولہ[۱۶] نسخے پائے جاتے ہیں، اور ہر نسخہ ایک خاص راوی سے مروی ہے، ابوالقاسم بن محمد ابن حسین شافعی کا بیان ہے کہ امام مالک سے گیارہ موطائیں مروی ہیں، اور سب کی سب قریب المعنی ہیں، البتہ ان میں چار مروج تھیں، پہلا نسخہ یحیی بن یحیی کا، دوسرا ابن بکیر کا تیسرا ابو مصعب کا اور چوتھا ابن وہب کا پھر بعد میں ابو مصعب اور ابن وہب کے نسخوں کا رواج کم ہو گیا، ان نسخوں میں احادیث کی کمی زیادتی ہے اور تقدیم و تاخیر بھی ہے۔ سب سے زیادہ احادیث نسخہ ابو مصعب میں ہیں، ابن حزم کا قول ہے کہ اس موطا میں دیگر موطاؤں سے سیکڑوں احادیث زائد ہیں، ان ہی نسخوں میں موطا امام محمد بھی ہے امام محمد بن حسن شیبانی متوفی ۱۸۹ھ امام ابو حنیفہ کے تلمیذ رشید ہیں، انھوں نے امام مالک سے موطا پڑھی پھر اس زمانہ کے رواج کے مطابق اپنے نسخہ میں زیادتی کر لی، بعد میں ان کا نسخہ

موطا امام محمد کے نام سے مشہور ہو گیا۔

مقبولیت و اہمیت حافظ ابن عبد البر اندلسی نے امام اوزاعی کے شاگرد عمر بن عبد الواحد کا قول نقل کیا ہے کہ ہم لوگوں نے امام مالک سے ان کی مؤطا چالیس دن میں پڑھی، اس پر امام صاحب نے فرمایا کہ جس کتاب کو میں نے چالیس سال میں تیار کیا تم لوگوں نے اسے چالیس دن میں پڑھ لیا، افسوس کہ تم لوگوں میں تفقہ فی الدین کم ہوتا جا رہا ہے۔ خود امام مالک کا بیان ہے کہ میں نے اپنی کتاب مؤطا کو مدینے کے ستر فقہاء کی خدمت میں پیش کیا، جب سب نے اس پر اتفاق کر لیا تو میں نے اس کا نام موطا (متفق علیہ) رکھا، ایک ہزار سے زائد علماء نے خود امام مالک سے اس کی روایت کی اور اس کے لیے سماع کے لیے اندلس سے لیکر حدود چین تک سے اہل علم مدینہ آئے، اور امام صاحب سے سماع کیا، آپ سے مؤطا کے راویوں میں ہر طبقہ کے ائمہ و علماء شامل ہیں۔ فقہاء میں امام شافعی، امام محمد، ابن وہب وغیرہ۔ محدثین میں یحیٰی بن سعید القطان، عبد الرحمٰن بن مہدی، عبد الرزاق بن ہمام صنعانی وغیرہ، امراء و سلاطین میں ہارون الرشید، مہدی، امین، مامون وغیرہ۔

شرح و مختصرات اور مستخرجات امام مالک کی زندگی ہی میں مؤطا تمام عالم اسلام میں پھیل گئی، اور علمائے امت نے اسے ماخذ و منبع قرار دیا۔ اس کی احادیث کی تخریج کی، متابعات و شواہد بیان کیے، غریب الفاظ کی شرح کی مشکلات کو ضبط کیا و فقہ سے بحث کی، رجال پر کتابیں لکھیں اور اس کو موضوع بنا کر بے حد بے حساب لکھا حتیٰ کہ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

شارحین مؤطا میں غالباً پہلا امام ابو مروان بن عبد الملک بن حبیب مالکی ۲۳۹ھ کا ہے، حافظ ابو عمر یوسف بن عبد البر اندلسی ۴۶۳ھ نے موطا پر دو کتابیں لکھیں ایک التقصی لحدیث موطا، اور دوسری، التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید، اس کے بارے میں امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ یہ کتاب فقہ اور حدیث کی ہے، میری نظر میں اس موضوع پر اس جیسی کوئی

دوسری کتاب نہیں ہے، التجرید التمہید لمافی الموطا من الاسانید مطبوع ہے اور ملتی ہے، ابو محمد عبداللہ بن محمد نحوی بیطلیوسی ۵۲۱ھ نے بھی موطا کی شرح کی ہے، قاضی ابوبکر محمد بن العربی مغربی ۵۴۶ھ نے القبس کے نام سے ایک شرح لکھی، جس میں لکھا ہے کہ موطا امام مالک اسلامی شرائع کی سب سے پہلی اور آخری کتاب ہے، اس کی بنیاد اصول کی تمہید پر ہے اور امام صاحب نے فقہ کے ایسے اہم اصول کو بیان کیا ہے جن سے فروعی مسائل مستنبط ہوتے ہیں، امام سیوطی ۹۱۱ھ نے ایک شرح لکھی جس کا نام کشف المغطا فی شرح الموطا ہے پھر اس کا اختصار تنویر الحوالک کے نام سے کیا یہ کتاب مصر میں چھپ چکی ہے امام محمد بن عبدالباقی زرقانی مصری مالکی ۱۱۲۲ھ نے تین جلدوں میں بسیط شرح لکھی، جو شرح زرقانی کے نام سے مشہور ہے اور مصر میں چھپ چکی ہے۔ ملا علی قاری ہروی مکی ۱۰۱۴ھ نے موطا کی شرح دو جلدوں میں لکھی جس میں اپنی عادت کے مطابق نہایت عمدہ عمدہ باتیں لکھی ہیں مگر کہا جاتا ہے کہ رجال کی تنقید میں اکثر مقامات پر ان سے تسامح ہوا ہے، ہندوستان میں بھی موطا امام مالک کے ساتھ خصوصی اعتنا رہا اور اس کی کئی شرحیں لکھی گئیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی ۱۱۷۶ھ نے دو شرحیں لکھیں ایک المصفّٰی یہ فارسی زبان میں ہے اور دوسری المسوّٰی یہ عربی میں ہے، اس میں اختلاف مذاہب اور بقدر ضرورت غرائب کی شرح کی ہے، دونوں شرحیں ایک ساتھ مکہ مکرمہ اور ہندوستان میں چھپ چکی ہیں۔ تیسری شرح مولانا عبدالحی فرنگی محلی ۱۳۰۴ھ کی ہے، جو موطا امام محمد کے نسخہ کی ہے اس کا نام التعلیق الممجد علی موطا الامام محمد ہے۔ موطا امام محمد کے حاشیہ پر لکھنؤ وغیرہ میں بار بار چھپی ہے، اور چوتھی شرح اوجز المسالک مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی ہے۔

موطا امام مالک کے مختصرات بھی بکثرت ہیں، ان میں امام خطابی احمد بن محمد بستی ۳۸۸ھ؛ ابو الولید سلیمان بن خلف باجی ۴۷۴ھ، اور ابن رشیق قیروانی ۴۵۶ھ کے مختصرات زیادہ مشہور ہیں

موطا پر دوسری کتابیں

موطا کی شرح کے علاوہ علماء نے اس کے مختلف پہلوؤں پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، چنانچہ اس کے غرائب کی شرح میں امام برقی، احمد بن عمران

[illegible] ابو القاسم عثمانی مصری وغیرہ نے کتابیں لکھیں، رجال موطا پر قاضی ابو عبد اللہ حذار، ابو [illegible] عبد اللہ بن مفرح، برقی، ابو عمر طلمنکی اور سیوطی نے کتابیں تصنیف کیں، سیوطی کی کتاب کا نام [illegible] اسعاف المبطا برجال الموطا ہے، جو تنویر الحوالک کے ساتھ مصر میں چھپی ہے، شواہد موطا پر قاضی [illegible] اسمٰعیل نے کتاب لکھی۔ اسی طرح ابو الحسن دارقطنی، اور قاضی ابو الولید باجی نے اختلاف موطا پر کتابیں لکھیں، ابو بکر بن حبیب نے اطراف الموطا اور ابن عبد البر نے التقصی فی مسند حدیث موطا لکھی۔

مسند امام احمد بن حنبلؒ تدوین حدیث کے تیسرے دور میں مسانید، جوامع اور مصنفات بکثرت لکھی گئیں، مگر ان میں سے مسند امام احمد کو جو مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی وہ مسند کی کسی دوسری کتاب کو میسر نہ ہو سکی۔ امام ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبلؒ شیبانی ۱۶۴ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے آپ کی والدہ بحالت حمل مرو سے آئی تھیں، امام شافعیؒ کے [illegible] تلامذہ سے ہیں، آپ نے امام شافعی کا ساتھ اس وقت چھوڑا جب امام صاحب یہ کہہ کر بغداد سے مصر چلے گئے کہ میں نے بغداد سے نکلتے وقت یہاں احمد بن حنبل سے زیادہ فقیہ و متقی کسی دوسرے کو نہیں چھوڑا ہے، فتنۂ خلق قرآن کے سلسلے میں خلیفہ معتصم باللہ کے دور میں کوڑوں سے مارے گئے اور قید و بند کے مصائب سے دوچار ہوئے مگر خلق قرآن کے قائل نہیں ہو سکے، امام بخاری، امام مسلم جیسے بڑے بڑے ائمۂ حدیث آپ کے شاگرد ہیں، دیانت و تقویٰ میں اپنے زمانہ کی ایک ہی فرد تھے، ۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ کو انتقال فرمایا اور بغداد کے باب حرب کے قبرستان میں دفن کئے گئے، آپ کے دو صاحبزادے تھے، صالح قاضی اصفہان (۲۰۳ھ، ۲۶۶ھ) اور عبد اللہ (۲۱۳ھ، ۲۹۰ھ)

احادیث کی تعداد مسند امام احمد امت محمدیہ کی جلیل القدر کتاب شمار ہوتی ہے اس میں کل چالیس ہزار حدیثیں ہیں، جن میں دس ہزار مکرر ہیں، اور تین سو سے زائد ثلاثیہ الاسناد ہیں یعنی وہ احادیث جن کے راوی صرف تین ہیں، امام احمد کو اپنی مسند کے بارے میں

اس قدر اعتماد تھا کہ ایک مرتبہ آپ سے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ دیکھو اگر میری مسند میں ہے تو خیر، ورنہ وہ حجت نہیں ہو سکتی، لیکن آپ سے بہ تصریح مروی نہیں ہے کہ جو مسند میں ہے سب حجت ہے، بلکہ یہ تصریح مروی ہے کہ جو حدیث مسند میں نہیں ہے وہ حجت نہیں ہے، چنانچہ کئی احادیث صحیحین میں موجود ہیں مگر مسند امام احمد میں نہیں ہیں، امام ابن جوزی نے اپنی کتاب الموضوعات میں مسند کی پندرہ احادیث کے بارے میں وضع کا احتمال ظاہر کیا ہے، اور حافظ عراقی نے ایسی احادیث کی تعداد صرف نو بتائی ہے، اور حافظ ابن حجر نے القول المسدد فی الذب عن مسند میں تین یا چار حدیثوں کو بے اصل قرار دیا ہے۔

شروح مختصرات مسند احمد جیسی ضخیم کتاب کی شرح ایک سندھی عالم نے کی ہے جو مدینہ منورہ میں تھے یعنی شیخ ابو محسن بن عبد الہادی السندی المدنی ۱۱۳۹ھ، اور شیخ زین الدین عمر بن احمد سماع حلبی سے ۹ھ نے اس کو مختصر کیا ہے، اور اس کا نام الدر المنتقد من مسند الامام احمد رکھا ہے، نیز شیخ سراج الدین عمر بن علی المعروف با بن الملقن شافعی ۸۰۵ھ نے اس کا اختصار کیا ہے، مسند احمد متعدد بار مصر میں چھپ چکی ہے آخری بار استاذ احمد بن محمد شاکر مرحوم کی تعلیق و تحقیق کے ساتھ نہایت شاندار طریقہ پر شائع ہوئی، مگر افسوس کہ صرف پندرہ جلدیں شائع ہو سکیں، اور محشی و محقق کا انتقال ہو گیا۔

صحیح بخاری امام ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بخاری، بخارا میں ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے، دس سال سے کم ہی کی عمر میں حدیث یاد کرنے لگے تھے، پھر اپنے یہاں کے مشائخ سے حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کی اور سولہ سال سے کم ہی کی عمر میں ان سے بہت کچھ حاصل کر لیا، اس کے بعد طلب علم میں سفر کا آغاز کیا، دو بار شام، مصر اور جزیرہ گئے، چار بار بصرہ کا سفر کیا، حجاز میں چھ سال قیام کیا، اور محدثین کے ہمراہ کوفہ اور بغداد کا بارہا سفر کیا، اٹھارہ سال کی عمر میں لوگوں نے آپ سے حدیث کی روایت شروع کر دی، سند اور متن کے ساتھ احادیث کے حفظ میں بے نظیر تھے، فرماتے ہیں کہ ہر دینی ضرورت کتاب و سنت سے پوری کی جا سکتی ہے، صحیح بخاری

علاوہ اور کئی کتابیں آپ کی تصانیف میں ہیں عید کی رات ۲۵۶ھ میں انتقال فرمایا، تیرہ دن باسٹھ سال کی عمر پائی تھی۔

صحیح بخاری امت کی پہلی کتاب ہے جس میں صحیح احادیث جمع کی گئی ہیں، جمہور علمائے سنت کا اتفاق ہے کہ صحیح بخاری کتاب اللہ کے بعد اصح کتب ہے، اور صحیح مسلم بھی اس کے قریب قریب ہے، یہ دونوں حضرات وہی حدیثیں بیان کرتے ہیں جن کے ناقلین ثقہ ہوتے ہیں، ساتھ ہی ان کی سند متصل اور غیر منقطع ہوتی ہے، امام صاحب نے صحیح بخاری کو سولہ سال میں مرتب کیا، ہر حدیث کے لکھنے سے پہلے غسل کرتے، دو رکعت نماز پڑھتے پھر اللہ تعالے سے استخارہ کرتے۔

تعداد احادیث

حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ صحیح بخاری میں مکررات سمیت کل (۷۳۹۷) حدیثیں ہیں، یہ تعداد معلقات، متابعات، اور موقوفات کے علاوہ ہے۔ اور مکررات کے بغیر متون موصولہ (۲۶۰۲) ہیں، اور متون موقوفہ جن کا اتصال نہیں کیا ہے (۱۵۹) ہیں، یعنی مکررات کے علاوہ کل (۲۷۶۱) حدیثیں ہیں، اور معلقات (۱۳۴۱) ہیں، اور متابعات اور اختلاف روایات والی احادیث (۳۴۴) ہیں، لیکن ابن حجرؒ نے موقوفات الصحابہ اور مقطوعات عن التابعین کی تعداد نہیں بیان کی ہے، اس لئے موقوف و مقطوع کے علاوہ مکررات سمیت کل احادیث (۹۰۸۲) ہیں، معلق، موقوف، اور مقطوع احادیث چونکہ امام بخاری کے موضوع سے خارج ہیں، مگر امام صاحب ان کو استشہاد وغیرہ کے لیے بیان کرتے ہیں، صحیح بخاری کی تیرہ حدیثوں پر ائمہ حدیث نے تنقید کی ہے، ایک سو دس احادیث ہیں جن میں سے (۳۲) کی تخریج پر امام مسلم بھی متفق ہیں اور (۷۰) کی تخریج میں امام بخاری منفرد ہیں، حفاظ حدیث نے صحیح بخاری کے (۸۰) رجال کو ضعیف قرار دیا ہے۔ مگر صحیح بخاری کے یہ رجال امام صاحب کے شیوخ میں سے ہیں اور آپ نے ان سے ملاقات کی ان کے حالات معلوم کئے اور ان کی احادیث کو پرکھا اور صحیح وسقیم کی تفریق کی اور صحیح بخاری کے رجال کو دوسروں سے زیادہ خود امام صاحب کو رکھا، صحیح بخاری کی براہ راست امام بخاری سے

روایت کرنے والے تقریباً ایک لاکھ انسان ہیں، اور ان میں سے اکثر ائمہ حدیث ہیں مسلم، ترمذی، ابوزرعہ، ابن خزیمہ وغیرہ،

شرح بخاری جس طرح امت نے قرآن کے بعد صحیح بخاری کو افضل کتب تسلیم کیا، اسی طرح کے بعد صحیح بخاری کی بہترین خدمت بھی کی، اور متقدمین و متاخرین نے اس کی بہت سی شرحیں لکھیں، علامہ حلبی نے کشف الظنون میں بخاری کی بیاسی سے زائد شرحوں کا ذکر کیا ہے اس کی مجمل شروح میں امام خطابی ۳۸۸ھ کی شرح اعلام السنن ایک جلد میں ہے، مفصل ہیں شیخ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروزآبادی شیرازی ۸۱۷ھ کی کتاب۔ منح الباری بالفسیح الجاری" ہے، کوئی چھوٹا بڑا مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر اس کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو، سند اور متن پر پوری بحث ہے، صحیح بخاری کی عبادات کا ربع حصہ اس کی بیس جلدوں میں ہے ان کے علاوہ صحیح بخاری کی چھوٹی بڑی سینکڑوں شرحیں لکھی گئیں مگر ان میں چار زیادہ مشہور ہیں (۱) امام بدر الدین محمد بن بہادر زرکشی ۷۹۴ھ کی کتاب التنقیح، (۲) امام بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی ۸۵۵ھ کی کتاب عمدۃ القاری، (۳) حافظ جلال الدین ۹۱۱ھ کی کتاب التوشیح (۴) شیخ الاسلام احمد بن علی حجر عسقلانی ۸۵۲ھ کی کتاب فتح الباری حقیقت یہ ہے کہ فتح الباری جیسی دوسری جامع شرح آج تک نہیں لکھی گئی، اس لیے صحیح بخاری کی طرح فتح الباری بھی امت کی اہم کتاب ہے۔

مختصرات صحیح بخاری کی بہت سی مختصرات ہیں، جن میں چند یہ مشہور ہیں (۱) مختصر جمال الدین احمد بن عمر القاری قرطبی ۶۵۶ھ۔ (۲) مختصر بدر الدین حسن بن عمر حلبی اس کا نام ارشاد الساری و القاری ہے، (۳) مختصر حسین بن مبارک زبیدی ۸۹۳ھ نام التجرید الصریح لاحادیث الجامع الصحیح ہے، زمانہ حال میں مصر وغیرہ میں اس کے کئی مختصر مختلف سے لکھے گئے ہیں۔

رجال بخاری پر کتابیں اسماء رجال البخاری امام احمد بن محمد کلاباذی ۳۹۸ھ کتاب التعدیل

ابو الولید سلیمان بن خلف باجی سنہ ۴۷۴ھ، الافہام بما وقع فی البخاری من الابہام، جلال الدین عبد الرحمٰن بن عمر بلقینی سنہ ۸۲۴ھ،

صحیح مسلم امام مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری سنہ ۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے، بچپن ہی سے حدیث کی تحصیل کی، امام بخاری وغیرہ سے پڑھا، وقت کے بڑے بڑے ائمہ وحفاظ نے آپ سے حدیث کی روایت کی، کئی کتابیں تصنیف کیں، ان میں سب سے اہم صحیح مسلم ہے۔ اپنے شیخ امام بخاری کے ساتھ بڑے اخلاص ومحبت سے پیش آتے تھے، مگر آخر میں دونوں حضرات میں ان بن ہوگئی، رجب سنہ ۲۶۱ھ میں امام مسلم کی وفات ہوئی اور نیساپور میں دفن کیے گئے۔

صحیح مسلم صحاح ستہ میں دوسرے درجہ پر مانی جاتی ہے، حسین بن علی نیساپوری کا بیان ہے کہ آسمان کے نیچے صحیح مسلم سے زیادہ اصح کوئی کتاب نہیں ہے، مشائخ مغاربہ میں سے بعض حضرات نے حسین بن علی نیساپوری کی موافقت کی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ صحیح بخاری کے بہت سے اوصاف صحیح مسلم میں نہیں پائے جاتے، مثلاً امام بخاری کی شرط روایت میں راوی کا مروی عنہ سے لقاء کا ثبوت ضروری ہے، اور امام مسلم کے نزدیک دونوں میں معاصرت کافی ہے، ضبط وعدالت کے سلسلے صرف اسی رجال بخاری پر کلام کیا گیا ہے جبکہ مسلم کے ایک سو ساٹھ رجال پر جرح کی گئی ہے، اسی طرح شذوذ اور اعلال کے سلسلے میں بخاری کی ۸۰ حدیثوں پر کلام کیا گیا ہے اور مسلم کی ایسی ۱۳۰ حدیثوں پر کلام ہوا ہے، نیز صحیح بخاری فقہی استنباط اور اسرار وحکم سے پر ہے، اور صحیح مسلم میں یہ بات نہیں ہے، پھر امام بخاری علم حدیث میں امام مسلم سے کہیں زیادہ معلومات رکھتے ہیں، دارقطنی کا قول ہے کہ اگر بخاری نہ ہوتے تو مسلم بھی نہ ہوتے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحیح مسلم کی عظمت واہمیت سے انکار ہے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہر حدیث اپنے موقع محل میں بیان کی گئی ہے، اور بلا تردد ہر حدیث مل سکتی ہے، اور اکثر وبیشتر احادیث کے طرق، اسانید اور الفاظ کو تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔

شروح صحیح مسلم صحیح مسلم کی بھی بہت سی شرحیں ہیں، صاحب کشف الظنون نے تقریباً

پندرہ شروح کا تذکرہ کیا ہے، جن میں چند مشہور یہ ہیں، المنہاج امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی شافعی ۶۷۶ھ، اکمال الاکمال، امام ابوالفرج عیسیٰ بن مسعود زوادی ۷۴۳ھ یہ شرح پانچ جلدوں میں ہے اور اس سے پہلے کی شروح کی جامع ہے اکمال المعلم بفوائد کتاب مسلم امام ابوعبداللہ محمد بن خلفہ ابی مالکی ۸۲۸ھ، یہ شرح چار جلدوں میں ہے، اور مازری، عیاض قرطبی اور نووی کی شروح کی جامع ہونے کے ساتھ اس میں اور بھی مفید باتیں ہیں، الابتہاج شیخ احمد بن محمد الخطیب قسطلانی شافعی ۹۲۳ھ یہ شرح نصف صحیح مسلم تک آٹھ جلدوں میں ہے، نیز ملا علی قاری ہروی ۱۰۱۶ھ نے صحیح مسلم کی شرح چار جلدوں میں لکھی ہے، آخر میں فتح الملہم شرح صحیح مسلم کے نام سے مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے شرح لکھی، افسوس کہ اس کی صرف جلدیں تیار ہو سکیں جو طبع ہو چکی ہیں۔

مختصرات صحیح مسلم

صحیح مسلم کی مشہور مختصرات یہ ہیں، تلخیص کتاب مسلم و شرحہ، شیخ احمد بن عمر و قرطبی ۶۵۶ھ، مختصر زکی الدین عبدالعظیم منذری ۶۵۶ھ مختصر زوائد مسلم علی البخاری، سراج الدین عمر بن علی بن الملقن شافعی ۸۰۴ھ، یہ کتاب چار جلدوں میں ہے، ابوبکر احمد بن علی اصبہانی ۴۷۲ھ نے صحیح مسلم کے رجال پر ایک کتاب لکھی ہے۔

صحیحین پر مستخرجات

استخراج کا مطلب یہ ہے کہ کسی کتاب مثلاً صحیح بخاری یا صحیح مسلم کی حدیثوں کو ایک ایک کرکے اپنی سندوں سے بیان کیا جائے، اس میں رواۃ کا ثقہ ہونا ضروری نہیں ہے، اس صورت سے محدث اپنی مرویات کو بخاری یا مسلم کی مرویات سے ملا دیتا ہے اور ان کے شیوخ یا شیوخ سے اوپر کسی راوی پر دونوں مل جاتے ہیں، استخراج کرنے والا بسا اوقات کچھ احادیث کو غیر مرضی سند کی وجہ سے روایت نہیں کرتا، بلکہ ان حدیثوں کو معلق کر دیتا ہے، اور کبھی صاحبِ اصل ہی کے طریقہ سے نقل کر دیتا ہے۔

تخریج و استخراج کا یہ طریقہ بڑے بڑے حفاظ حدیث نے اختیار کیا ہے، البتہ عموماً اس کے لیے صحیح بخاری یا صحیح مسلم کو اصل ٹھہرایا ہے کیونکہ ان دونوں کتابوں کو صحاح احادیث میں

جو مقام حاصل ہے وہ کسی دوسری کتاب کو میسر نہیں ہے،

مستخرجات بر صحیح بخاری صحیح بخاری پر مستخرجات حسب ذیل ہیں، مستخرج ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصبہانی سنہ ۴۳۰ھ، مستخرج ابو بکر احمد بن ابراہیم اسمٰعیلی سنہ ۳۷۱ھ، مستخرج شیخ الفقہاء والمحدثین ابو بکر احمد بن محمد برقانی سنہ ۴۲۵ھ،

مستخرجات بر صحیح مسلم صحیح مسلم پر مشہور مستخرجات یہ ہیں، مستخرج احمد بن حمدان نیساپوری سنہ ۳۱۱ھ، مستخرج ابو عوانہ اسفرائینی سنہ ۳۱۶ھ، مستخرج ابو نصر طوسی سنہ ۳۴۴ھ، المسند المستخرج علی مسلم حافظ ابو نعیم اصبہانی، المستخرج علی صحیح مسلم حافظ ابو بکر اسفرائینی محمد بن محمد بن رجاء سندھی سنہ ۲۸۶ھ،

مستدرک حاکم بر صحیحین امام ابو عبد اللہ حاکم نیساپوری سنہ ۴۰۵ھ نے اپنی کتاب المستدرک علی الصحیحین" میں ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں نہیں ہیں اور حاکم کی رائے میں وہ علی شرط البخاری ومسلم یا علی شرط احدہما ہیں، یا پھر حاکم کے علم و اجتہاد کے مطابق وہ احادیث صحیح ہیں، اگر کوئی حدیث علی شرطہما یا علی شرط احدہما ہوتی ہے، تو "ہذا حدیث علی شرط الصحیحین یا علی شرط البخاری یا علی شرط مسلم" لکھ کر اسے صحیح قرار دیتے ہیں اور اگر یہ بات نہیں ہے تو "ہذا حدیث صحیح الاسناد" کہہ کر اس کی صحت کو ظاہر کر دیتے ہیں، بسا اوقات ایسی احادیث بھی بیان کر دیتے ہیں جو خود ان کے نزدیک صحیح نہیں ہوتی بلکہ حسن یا ضعیف ہوتی ہے مگر اس پر تنبیہ کر دیا کرتے ہیں۔

حافظ ذہبی سنہ ۷۴۸ھ نے مستدرک حاکم کی تلخیص کر کے اس کی منکر اور ضعیف احادیث کو ظاہر کر دیا ہے، اور اس کی موضوع احادیث کو الگ بیان کر دیا ہے، اس میں موضوعات کی تعداد تقریباً ایک سو ہے، امام ذہبی کا قول ہے کہ نصف مستدرک علی شرط الصحیحین یا علی شرط احدہما ہے ایک ربع کی سندیں صحیح ہیں، اور ایک ربع مناکیر و موضوعات ہیں، یہ بات کہ حاکم جیسے عالم حدیث نے ان احادیث کو کیوں شامل کیا؟ تو اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ حاکم نے

آخر عمر میں مستدرک لکھی جبکہ ان کا حافظہ کمزور ہو چکا تھا ابن حجر کا قول ہے کہ حاکم کے تساہل کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مستدرک کا مسوّدہ تیار کیا تھا کہ ان کا وصال ہو گیا اور اس کی تبیض کی باری نہ آسکی اور نہ تصحیح و تنقیح کا فرق ہو سکا، بعض محدثین کا قول ہے کہ حاکم کے تفردات پر بحث و تمحیص کے بعد ان کے صحیح، حسن اور ضعیف ہونے کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔

جامع صحیح ترمذی امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ ترمذی ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے، امام بخاری اور ان کے شیوخ سے حدیث کی روایت کی، کتاب السنن اور کتاب العلل آپ کی تصنیف ہے، زہد و تقویٰ، علم و فضل اور حفظ و دیانت میں امام بخاری کے ہم پلّہ تھے آخر رجب ۲۷۹ھ میں ترمذ میں انتقال فرمایا۔

امام ترمذی کا بیان ہے کہ میں نے اپنی یہ کتاب حجاز، عراق اور خراسان کے علماء کے سامنے پیش کی سب نے بنظر استحسان دیکھا اور پسند کیا میں نے اس میں کوئی ایسی حدیث درج نہیں کی ہے جس پر کسی فقیہ کا عمل نہ ہو، مطلب یہ ہے کہ جامع ترمذی کی ہر حدیث کسی فقیہ کے نزدیک حجّت اور معمول بہ ہے، امام ترمذی نے اس کتاب میں یہ اہم ترین کام کیا ہے کہ ہر حدیث کے بارے میں صحیح، حسن، معلول ہونے پر کلام فرمایا ہے، اور معلول و متروک حدیث کی بھی توضیح کر دی ہے، اور ہر باب میں اس سلسلہ کی دوسری احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے، نیز جرح و تعدیل کو بیان کیا ہے، اور آخر میں کتاب العلل کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، ان خصوصیات کی وجہ سے جامع ترمذی نہایت مفید اور جلیل القدر کتاب تسلیم کی گئی ہے، مکرّر احادیث بھی کم ہیں۔

مشہور شرحیں امام محمد بن عبد اللہ اشبیلی المعروف بہ ابن العربی مالکی ۵۴۶ھ نے جامع ترمذی کی شرح عارضۃ الاحوذی فی شرح الترمذی کے نام سے لکھی، حافظ محمد بن محمد شافعی ۷۳۴ھ نے جامع ترمذی کے دو ثلث کی شرح دس جلدوں میں لکھی جو نا مکمل تھی، بعد میں زین الدین عبد الرحیم بن حسین عراقی ۸۰۶ھ نے اس کی تکمیل کی، عبد الرحمن بن احمد حنبلی سے

نے بیس جلدوں میں شرح لکھی مگر افسوس کہ یہ ضخیم کتاب ایک ہنگامہ میں نذر آتش ہو گئی اور مسلمانوں کے بے شمار علمی ذخیروں کے ساتھ یہ ذخیرہ بھی ضائع ہو گیا، اسی طرح جلال الدین سیوطی ۹۱۱ھ اور شیخ محمد حیات سندھی مدنی ۱۱۶۳ھ نے اس کی شرح لکھی، امام عمر بن علی بلقینی ۸۰۵ھ نے ترمذی کی ان احادیث کی شرح کی جو صحیحین اور ابوداؤد کی صحاح سے زائد ہیں۔ آخری دور میں ہندوستان میں جامع ترمذی کی چند شرحیں لکھی گئیں اور اس پر شیوخ کی درسی تقریروں کو جمع کیا گیا۔ ان میں تحفۃ الاحوذی فی شرح جامع الترمذی ابو العلیٰ عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم مبارک پوری ۱۳۵۳ھ بڑی اہم اور مفید شرح ہے، اور عرب وعجم میں ہر جگہ مقبول و متداول ہے، مقدمہ کے ساتھ پانچ ضخیم جلدوں میں ہندوستان میں چھپی ہے، اور اسی کا فوٹو لے کر بیروت میں چھاپی گئی ہے، نیز مصر میں گیارہ جلدوں میں طبع ہوئی ہے، حق یہ ہے کہ امام ترمذی کا قرضہ اس کتاب نے امت کے سر سے اتار دیا ہے، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بھی جامع ترمذی کی ایک بسیط شرح فقہی انداز میں معارف السنن کے نام سے لکھ رہے ہیں، اس کی تین جلدیں اب تک کراچی سے چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔

مختصرات ترمذی

جامع ترمذی کی مختصرات میں نجم الدین محمد بن عقیل ۷۲۹ھ اور نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی طوفی حنبلی ۷۱۰ھ کی کتابیں زیادہ مشہور رہیں۔

سنن ابوداؤد

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے، امام احمد بن حنبل، قعنبی، سلیمان بن حرب وغیرہ سے حدیث کی روایت کی، اور علماء امت کے ایک جم غفیر نے ان سے روایت کی، امام ترمذی اور امام نسائی آپ کے تلامذہ میں ہیں، ابوداؤد نے پہلے اپنی سنن بغداد کے علماء کے سامنے پیش کی تو وہاں کے علماء نے اسے پڑھا امام احمد نے بنظرِ استحسان دیکھا اور پسند فرمایا، ۲۷۵ھ میں بصرہ میں انتقال فرمایا، ابو سلیمان خطابی نے اپنی کتاب معالم السنن میں سنن ابوداؤد کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ نہایت محترم کتاب ہے، دینی علوم میں اس جیسی دوسری کتاب نہیں لکھی گئی، یہ امت کے ہر طبقہ میں مقبول ہوتی ہے اور محدثین و فقہاء کے درمیان قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے، اختلاف آراء کے

باوجود ہر مذہب کے علماء کے لیے حجت ہے اور عراق، مصر بلاد مغرب اور دوسرے ممالک کے علماء اسے مستند قرار دیتے ہیں، خود امام ابوداؤد نے بیان کیا ہے کہ میں نے پانچ لاکھ حدیثیں لکھیں ان میں سے چار ہزار آٹھ احادیث کا انتخاب کر کے اس کتاب میں جمع کیا ہے، اور ان ہی احادیث کو ذکر کیا ہے جو صحیح ہیں یا صحت کے قریب ہیں، اور ان تمام احادیث میں سے صرف ان چار احادیث پر عمل کیا جائے تو ایک مسلمان کے دین کے لیے کافی ہیں۔

پہلی حدیث :- اِنَّمَا الأعمال بالنیات

دوسری حدیث :- من حُسنِ اسلام المؤ ترکہ مالا یعنیہ،

تیسری حدیث :- لا یکون المؤمن مومناً حتیٰ یرضی لاخیہ مایرضی لنفسہ

چوتھی حدیث :- الحلال بین والحرام بیّن۔

اس کتاب میں کوئی حدیث نہیں لکھی ہے جسے ترک کر چکے ہیں اور جس حدیث میں شدید وہن ہے میں نے اسے ظاہر کر دیا ہے اور جس حدیث کی سند صحیح نہیں ہے یا میں نے جس حدیث کے بارے میں کچھ لکھا ہے وہ صالح ہے، اور ایسی حدیثوں میں صحت کے اعتبار ایک دوسرے سے بڑھی ہوئی ہیں یہ کتاب کسی سنت رسول کے بارے میں تم کو مایوس نہیں کرے گی، میرے نزدیک قرآن کے بعد اس کتاب کا پڑھنا نہایت ضروری ہے، اگر کسی نے اس کتاب کے بعد کوئی کتاب نہیں پڑھی تو کوئی مضائقہ نہیں ہے یہ باتیں اور اسی قسم کی مزید باتیں اس خط میں درج ہیں جسے امام ابوداؤد نے اہل مکہ کے یہاں بھیجا تھا۔ سنن ابوداؤد احکام کی جامعیت میں مشہور ہے، اس میں مرسل احادیث بکثرت ہیں، اور سفیان ثوری، اوزاعی، اور امام مالک کے نزدیک حدیث مرسل حجت ہے، ابن کثیر نے مختصر علوم الحدیث میں لکھا ہے کہ سنن ابی داؤد کی کئی روایات ہیں اسی لیے بعض احادیث بعض نسخوں میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

شروح سنن ابوداؤد اس کی شرحیں بڑے بڑے علمائے امت نے لکھی ہیں، امام خطابی ۳۸۸ھ نے معالم السنن کے نام سے مشہور شرح لکھی ہے۔

قطب الدین ابوبکر یمنی شافعی ۷۵۲ھ نے چار ضخیم جلدوں میں اس کی شرح لکھی ہے، ابوزرعہ احمد بن عبدالرحیم عراقی ۸۲۶ھ نے صرف سجود السہو تک سات جلدوں میں شرح کی، جو احادیث زائد علی الصحیحین ہیں ان کی شرح ابن الملقن نے دو جلدوں میں لکھی ہے، نیز اس کی ایک شرح شہاب الدین رملی ۸۴۴ھ نے لکھی ہے، اخیر دور میں ہندوستان میں اس کی مفصل شرحیں لکھی گئیں ایک بذل المجہود مولانا خلیل احمد انبیٹھوی ۱۳۴۶ھ کی، اور دوسری عون المعبود مولانا ابوالطیب شمس الحق عظیم آبادی سنہ ھ کی، دونوں شرحیں ہندوستان میں چھپ چکی ہیں بلکہ دوسری شرح مصر میں طبع ہو کر شائع ہوئی ہے، عون المعبود کی تالیف میں مولانا ابوالعلی عبدالرحمٰن مبارک پوری ۱۳۵۳ھ نے بھی کام کیا ہے۔

مختصرات سنن ابوداؤد سنن ابی داؤد کا اختصار امام زکی الدین منذری ۶۵۶ھ نے المجتبیٰ کے نام سے کیا، جس کی شرح امام سیوطی نے زہرۃ الربا علی المجتبیٰ کے نام سے لکھی ہے، نیز امام ابن قیم جوزی حنبلی ۷۵۱ھ نے مختصر منذری کی شرح وتہذیب کی ہے۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ منذری نے اپنی مختصر میں حسن انتخاب سے کام لیا ہے اس لیے میں نے اس کی ترتیب وتہذیب کی، اور جن علل احادیث کے بارے میں سکوت تھا، میں نے ان پر گفتگو کی ہے نیز ان احادیث کی تصحیح اور مشکل متون کی تشریح میں تفصیل سے کام لیا ہے، یہ باتیں دوسری جگہ نہیں ملیں گی۔

سنن ابن ماجہ امام ابوعبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ بن ماجہ قزوینی ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے، علم حدیث کی طلب میں بڑے بڑے اسفار کئے اور بہت سے شہروں کا چکر کاٹا امام مالک اور امام لیث بن سعد کے تلامذہ سے احادیث کا سماع کیا اور بے شمار مخلوق نے آپ سے روایت کی، سہ شنبہ ۲۲ رمضان ۲۷۵ھ کو انتقال فرمایا۔

بعض ائمہ نے حدیث کی پانچ کتابوں کو اصول سنت قرار دیا ہے یعنی بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابوداؤد، اور بعض دوسرے حفاظ حدیث نے سنن ابن ماجہ کو ملا کر چھ کتابوں کو اصول

سنت مانا ہے، ان میں سب سے پہلے ابن طاہر مقدسی ۵۰۷ھ ہیں، اسی کو حافظ عبد الغنی ۶۰۰ھ نے بھی الاکمال فی اسماء الرجال میں اختیار کیا ہے، صحاح ستہ میں موطا امام مالک کو چھوڑ کر سنن ابن ماجہ کو لینے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بقیہ پانچوں کتابوں سے زوائد کثرت سے ہیں۔ بعض علماء کی رائے میں صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کے بجائے سنن دارمی ہونی چاہئے کیونکہ سنن دارمی میں اگرچہ مرسل، اور موقوف احادیث زیادہ ہیں لیکن ضعیف و شاذ اور منکر احادیث بہت کم ہیں، اور رزین سرقسطی ۵۳۵ھ اور بعض دوسرے علمائے کبار نے صحاح ستہ کی چھٹی کتاب موطا امام مالک کو مانا ہے، ابن اثیر وغیرہ کا یہی خیال ہے۔

حافظ مزی کا قول ہے کہ سنن ابن ماجہ میں جو احادیث پانچوں کتب حدیث سے منفرد ہیں وہ ضعیف ہیں لیکن حافظ ابن حجر نے اس اصول کو تسلیم نہیں کیا ہے، ان کا قول ہے کہ ابن ماجہ بہت سی احادیث میں منفرد ہیں اور وہ احادیث صحیح ہیں، اس لئے ابن ماجہ کی احادیث میں ضعف ان کی انفرادیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ رجال کے ضعف کی وجہ سے ہونا چاہئے۔

شروح سنن ابن ماجہ امام کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری شافعی ۸۰۸ھ نے الدیباجہ کے نام سے پانچ جلدوں میں سنن ابن ماجہ کی شرح لکھی ہے، لیکن تکمیل سے پہلے فوت ہو گئے، ابراہیم بن محمد حلبی ۸۴۱ھ نے ایک شرح لکھی، اور جلال الدین سیوطی نے مصباح الزجاجہ کے نام سے شرح لکھی، عمر بن علی بن الملقن نے اس کی کتب خمسہ سے زائد احادیث کی شرح آٹھ جلدوں میں لکھی جس کا نام "ما تمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ" رکھا، ہندوستانی علماء میں شیخ محمد حیات سندی مدنی نے ایک شرح لکھی، اور محدث عبد الغنی مجددی ۱۲۹۶ھ نے انجاح الحاجہ لکھی۔

سنن نسائی امام احمد بن شعیب نسائی خراسانی ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے، آپ نے خراسان حجاز، عراق، مصر، شام، اور جزیرہ وغیرہ کا علمی سفر کیا اور شیوخ زمانہ سے حدیث کی روایت کی، حدیث کی معرفت علو اسناد اور اتقان میں منفرد تھے، کہا جاتا ہے کہ آپ کا حافظہ امام مسلم کے حافظہ سے بڑھا ہوا تھا، دوشنبہ ۱۲ صفر ۳۰۳ھ کو مقام رملہ میں فوت

ہوئے، اور بیت المقدس میں دفن کیے گئے، ایک روایت یہ ہے کہ آپ مکہ مکرمہ میں دفن کیے گئے

سنن نسائی کا اصل نام المجتبیٰ ہے، جس وقت امام نسائی نے اپنی کتاب السنن الکبریٰ لکھ کر رملہ کے امیر کی خدمت میں پیش کیا اس نے سوال کیا کہ کیا اس کتاب کی تمام حدیثیں صحیح ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ اس میں صحیح، حسن وغیرہ ہر قسم کی احادیث ہیں، اس پر امیر رملہ نے خواہش ظاہر کی کہ آپ اس میں سے صحیح احادیث کو علیحدہ کر دیں، چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اس کا نام المجتبیٰ من السنن رکھا، اس میں ضعیف احادیث بہت کم ہیں۔

شروح سنن نسائی امام سیوطی نے اس کی ایک مختصر شرح لکھی ہے، اور شیخ ابو محسن محمد بن عبدالہادی حنفی سندی مدنی ۱۱۳۸ھ نے بھی ایک شرح لکھی ہے جو سیوطی کی شرح سے طویل ہے، سراج الدین عمر بن علی بن الملقن شافعی نے ایک جلد میں اس کی ان صحیح احادیث کی شرح لکھی ہے جو کہ صحیحین، ابوداؤد اور ترمذی سے زائد ہیں، سیوطی اور سندی کی شرحوں کے ساتھ سنن نسائی ہندوستان میں دو بار چھپ چکی ہے،

صحاح ستہ کے علاوہ کتب احادیث امام نووی کا قول ہے کہ اصول خمسہ بخاری و مسلم وغیرہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان سے صحاح احادیث بہت کم باقی رہ گئی ہیں، پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ صحاح ستہ میں تمام صحاح کا استیعاب نہیں ہو سکا ہے، اور محدثین نے بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں صحاح احادیث کو درج کیا ہے، ذیل میں چند مشہور جوامع اور صحاح کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن میں سے اکثر کتابیں تیسری صدی میں لکھی گئی ہیں اور کچھ چوتھی صدی کی ابتداء کی ہیں:

۱ صحیح ابن خزیمہ نیساپوری ۳۱۱ھ، یہ کتاب صحت کے اعتبار سے ابن خزیمہ کے تلمیذ ابن حبان کی صحیح سے بڑھی ہوئی ہے، اس میں ابن خزیمہ نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے حتیٰ کہ سندوں میں ادنیٰ کلام کی وجہ سے حدیث کی صحت کے قائل ہونے میں توقف کیا ہے۔

۲ صحیح ابن حبان ابوحاتم محمد بن حبان بستی ۳۵۴ھ کا نام التقاسیم والانواع ہے، مگر

اس میں احادیث کی تلاش میں سخت دقت پیش آتی ہے، اس کی ترتیب نہ فقہی ابواب پر ہے اور نہ مسانید پر ہے، اسی لئے ابن الملقن نے اسے ترتیب دیا ہے، ابوالحسن ہیثمی نے اس کی ان احادیث کی تجرید کی ہے، جو صحیحین سے زائد ہیں، بعضوں کا قول ہے کہ ابن حبان نے احادیث کی تصحیح میں تساہل سے کام لیا ہے لیکن ان کا یہ تساہل حاکم کے مستدرک میں تساہل سے کم ہے، یہ کتاب حیدرآباد میں چھپ رہی ہے۔ صحیح ابی عوانہ، ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق ۳۱۶ھ

صحیح المنتقی ابن سکن محمد بن عثمان ۳۵۳ھ حیدرآباد میں چھپ چکی ہے، المنتقی فی الاحکام ابن الجارود عبداللہ بن علی ۳۰۷ھ، یہ کتاب مصر میں طبع ہو چکی ہے، المنتقی فی الآثار قاسم بن اصبغ محدث اندلس ۳۴۰ھ المختارہ، محمد بن عبدالواحد مقدسی ۶۴۳ھ، مقدسی نے اس کتاب میں صحت کا پورا پورا التزام کیا ہے، انھوں نے ایسی احادیث کی تصحیح کی ہے جو متقدمین کو معلوم نہیں تھیں، افسوس کہ یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی، بعض حفّاظ نے اسے مستدرک حاکم پر ترجیح دی ہے۔

صحاح ستہ وغیرہ پر کتب اطراف

جن کتابوں میں حدیث کا ایک ٹکڑا ذکر کر دیا جائے جس سے پوری حدیث کا پتہ چل جائے اور اس کی سندوں کو پورے طور سے یا کسی خاص کتاب سے بیان کر دیا جائے، ان کو کتب اطراف کہتے ہیں، صحاح ستہ کے اطراف پر بکثرت کتابیں لکھی گئی ہیں، ہم یہاں ایسی چند کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں، ان میں بعض دیگر اہم کتابوں کے اطراف پر شامل ہیں اطراف الصحیحین پر حافظ ابراہیم بن محمد بن عبید دمشقی ۴۰۰ھ اور ابومحمد خلف بن محمد واسطی ۴۰۱ھ نے کتابیں لکھی ہیں، ابن عساکر کا قول ہے کہ ان دونوں میں خلف کی کتاب اچھی ہے، اس کی ترتیب بہتر ہے اور وہم وخطا بھی اس میں کم ہے، اس کا قلمی نسخہ مصر میں چار جلدوں میں موجود ہے۔ نیز اطراف صحیحین پر حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی ۴۳۰ھ اور حافظ ابوالفضل ابن حجر عسقلانی نے کتابیں لکھی ہیں۔

سنن اربعہ کے اطراف کو ابو القاسم علی بن حسن ابن عساکر دمشقی ۵۷۱ھ نے حروف معجم کی ترتیب پر چار جلدوں میں جمع کیا ہے، اور اس کا نام الاشراف علی معرفۃ الاطراف رکھا۔

کتب ستہ کے اطراف پر محمد بن طاہر مقدسی ۵۰۷ھ نے ایک کتاب بنام "اطراف الغرائب والافراد" لکھی، جس میں صحیحین اور سنن اربعہ کے اطراف کو جمع کیا ہے، اس کے بارے میں ابن عساکر نے الاشراف کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں نے اسے بغور پڑھا تو اوہام بہ کثرت ملے۔ اور ترتیب بھی اچھی نہیں ہے، اسی لیے ابن عساکر نے الاشراف لکھی اور حافظ محمد بن علی دمشقی ۷۶۵ھ نے اس کی تلخیص کی، اور ترتیب کو بہتر بنایا، اطراف صحاح ستہ پر حافظ یوسف بن عبد الرحمٰن مزی نے ایک کتاب لکھی، مگر اس میں اوہام زیادہ تھے جن کو ابو زرعہ احمد بن عبد الرحیم نے جمع کر دیا ہے، مزی کی کتاب الاطراف کو علامہ ذہبی اور محمد بن علی دمشقی نے مختصر کیا ہے ابن الملقن نے بھی ایک کتاب بنام الاشراف علی اطراف الستۃ لکھی، حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرۃ یا اطراف العشرۃ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں صحاح ستہ اور مسانید اربعہ کی احادیث کے اطراف کو جمع کیا، یہ کتاب آٹھ جلدوں میں ہے، اور حافظ ابن حجر نے اطراف المسند المعتلی کے نام سے دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے۔

علومِ حدیث

علمِ غریب الحدیث

محدثین کی اصطلاح میں غریب ایسے کلام کو کہتے ہیں جو مطلب اور منشاء کے اعتبار سے بعید الفہم ہو، اور غور و خوض اور لغت کی مراجعت کے بعد سمجھ میں آئے۔ علم غریب الحدیث کی تاریخی وضاحت کے لیے ہم علامہ ابن اثیرؒ کی کتاب النہایہ کی ابتدائی بحث کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:۔

عہدِ رسالت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم افصح العرب ہیں، فصل خطاب آپ کا امتیازی مقام ہے، اختلاف لغات، فرقِ لہجات اور کثرتِ قبائل و شعوب کے باوجود عرب آپ کے مخاطبِ اوّل تھے، ان میں سے ہر شخص آپ کی گفتگو سمجھتا تھا، خدمتِ نبوی میں حاضر باش صحابہ کرام اور باہر سے آنے والے بدوی وحضری وفود آپ کے کلام کا مفہوم سمجھ جاتے تھے، اور جس بات کو نہ سمجھتے آپ سے دریافت کرتے، اور آپ بتا دیتے تھے، احادیثِ نبویہ کے تفہیم و تفہم کا یہ طریقہ آپ کی حیاتِ طیبہ تک جاری رہا۔

عہدِ صحابہ آپ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی تقریباً یہی طریقہ رائج تھا عربی زبان صحابہ کے دور تک دخیل و جدید اور معرب الفاظ سے محفوظ تھی، اور جب عرب فاتحین و مبلغین مختلف بلاد و امصار میں گئے اور روم، فارس، نبط اور حبش وغیرہ غیر اجناس سے ملے، اور ان کے ملکوں کو فتح کر کے ان میں اپنے علوم و معارف پھیلائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ زبانوں میں اختلاط ہوا، عربی زبان دوسری زبانوں سے متاثر ہوئی۔

غیر عرب مسلمان ہوئے ان کی اولاد نے عربی علوم کی تحصیل کی غرض سے بقدر ضرورت عربی زبان سیکھی اس کے جو الفاظ و محاورات ان کے نزدیک اہم اور ضروری تھے، ان کو سیکھا اور جو لغات و محاورات اور کلمات ان کے نزدیک غیر ضروری تھے، ان کو حاصل نہ کر سکے، عہد صحابہ تک یہ معاملہ یونہی چلتا رہا اور صحابہ کرام اس دور کی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرتے رہے۔

عہد تابعین

اس کے بعد تابعین رحمہم اللہ کا دور آیا اور وہ حضرات بھی اس معاملہ میں صحابہ کرام کے نقش قدم پر چلتے رہے، حالانکہ تابعین عربی لغات و محاورات میں عام طور سے صحابہ سے کم درجہ رکھتے تھے، ابھی کبار تابعین کا زمانہ (۱۵۰ھ تک) گذرنے نہ پایا تھا کہ عجم کی فتوحات و تعلقات کی وجہ سے عربی زبان میں عجمیت کے اثرات ظاہر ہونے لگے، اور خالص عربی زبان کے جاننے والے اور اس کے محافظ خال خال رہ گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ خالص عربیت کے الفاظ و محاورات سے غافل ہو گئے اور جو غریب و مشکل الفاظ عام طور سے عصر اول میں مستعمل تھے، اور جن کا جاننا متاخرین کے لیے ضروری تھا ان سے لوگ رفتہ رفتہ ناآشنا ہو گئے۔

دوسری صدی

جب اس غفلت یا لسانی اختلاط کی وجہ سے احادیث نبویہ کے سمجھنے میں دشواری پیدا ہونے لگی، تو کچھ حضرات نے اس صورتِ حال کے مقابلہ کے لیے حدیث کے غریب الفاظ میں کتابیں لکھیں اور ان کی توضیح و تشریح کی، کہا جاتا ہے کہ اس فن میں تصنیف کی اولیت کا سہرا ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ بصری ۲۱۰ھ کے سر ہے جنہوں نے حدیث و اثر کے غریب الفاظ کو ایک چھوٹی سی کتاب میں جمع کیا، کیونکہ اس وقت تک لوگوں میں غریب الفاظ سے لاعلمی بہت زیادہ نہیں تھی، دوسرے یہ کہ اس فن کی یہ پہلی کتاب تھی، اور ہر فن کی ابتدائی کتاب اسی قسم کی ہوتی ہے پھر بعد میں اس میں ضخیم کتابیں لکھی جاتی ہیں جیسا کہ اس فن میں بھی ہوا، اس کے بعد ابوالحسن نضر بن شمیل مازنی ۲۰۴ھ نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جو ابو عبیدہ کی کتاب سے بڑی تھی اور مختصر ہونے کے باوجود اس میں تفصیل بھی تھی۔

اس کے بعد عبدالملک بن قریب اصمعی ۲۱۳ھ نے ایک کتاب لکھی، جس میں ابو عبیدہ

کی کتاب سے زیادہ غریب الفاظ تھے، اصمعی کی یہ کتاب بہت عمدہ تھی۔ اس کے بعد ائمۂ لغت و فقہ نے چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں جن میں احادیث کے معانی و لغات پر کلام کیا، لیکن ان کتابوں میں تقریباً ایک ہی قسم کی حدیثیں ہوا کرتی تھیں، اور اس دور کا کوئی مصنف اس فن میں امتیازی درجہ نہ پاسکا، یہ حضرات امام لغت قطرب ۲۰۶ھ کے طبقہ سے تھے۔

تیسری صدی

دوسری صدی تک غریب الحدیث میں تصنیف و تالیف کا یہی سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ تیسری صدی میں امام ابوعبیدہ قاسم بن سلام ۲۲۴ھ کا زمانہ آیا اور انہوں نے اپنی مشہور کتاب غریب الحدیث لکھی، اس تصنیف میں امام موصوف نے اپنی زندگی ختم کردی اور چالیس سال کی مدت میں یہ کتاب لکھی، جو اس باب میں نہایت بہتر مانی گئی ہے، اور اس میں بہت سی احادیث و آثار کے معانی و فوائد پر سیر حاصل بحث ہے، ابوعبیدہ کا خیال ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں تمام اہم غرائب کو جمع کردیا ہے، یہ کتاب علمائے حدیث و فقہ میں نہایت مقبول ہوئی، دنیا میں پہلی بار ۱۳۸۳ھ میں چہار جلدوں میں حیدرآباد سے طبع ہوکر شائع ہوئی ہے۔

اس کے بعد ابومحمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ ۲۷۶ھ کا زمانہ آیا تو ابن قتیبہ نے اپنی مشہور کتاب غریب الحدیث لکھی، اس میں انہوں نے ابوعبید قاسم بن سلام کی کتاب سے بقدر ضرورت ہی اخذ و استفادہ کیا ہے، یہ کتاب ابوعبیدہ کی کتاب کے مثل یا اس سے بڑھ کر مانی گئی، ابن قتیبہ نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ مجھے امید ہے کہ ان دونوں کتابوں کے بعد غریب احادیث کے لیے مزید گفتگو کی گنجائش باقی نہیں رہے گی، یہ کتاب بھی حال ہی میں مصر سے چھپ کر شائع ہوئی ہے۔

اس کے بعد ابن قتیبہ کے معاصر امام ابراہیم بن اسحاق حربی ۲۸۵ھ نے ایک کتاب لکھی جس میں متون اور اسانید کا ذکر نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے، اس کے بعد اس فن میں لوگوں نے کثرت سے کتابیں لکھی ہیں، جن میں مبرد ۲۸۵ھ، ثعلب ۲۹۱ھ، محمد بن قاسم انباری ۳۲۸ھ، سلمہ بن عاصم نحوی ــــھ، عبدالملک بن حبیب مالکی ــــھ، محمد بن حبیب بغدادی ــــھ

وغیرہ ائمہ نحو ولغت اور ماہرین حدیث وفقہ کی کتابیں زیادہ مشہور رہیں۔

چوتھی صدی امام محمد بن احمد خطابی ۳۸۸ھ تک اس فن کی یہی تصنیفی رفتار رہی اور امام موصوف نے بھی اپنی مشہور کتاب غریب الحدیث لکھی جس میں ابو عبیدہ اور ابن قتیبہ کا انداز واسلوب اختیار کیا، اور کوشش کی کہ ان دونوں ائمہ کی کتابوں میں جو حدیثیں ہیں انہیں بھی جمع کردیں چنانچہ احادیث وآثار کے غرائب میں یہی تینوں کتابیں اُمّہاتِ کتب مانی گئیں اور علماء میں مقبول ہوکر معتمد ٹھہریں، مگر یہ تینوں اور دوسری کتابیں جو اس فن میں لکھی گئی تھیں یوں ترتیب وار نہیں تھیں کہ آدمی جو حدیث چاہے آسانی سے تلاش کرلے، امام حربی کی کتاب اگرچہ ترتیب وار تھی مگر طوالت اور مشکل ترتیب کی وجہ سے حدیثوں کی تلاش اس میں بھی مشکل تھی۔

اس کے بعد امام خطابی کے معاصر اور ان کے طبقہ کے مشہور عالم ابو عبید ہروی ۴۰۱ھ نے ایک کتاب لکھی جس میں قرآن وحدیث کے مشکل وغریب الفاظ کو جمع کیا، اور اپنے پیش روؤں سے الگ راہ اختیار کرکے عمدہ ترتیب قائم کی، اور لغت کے مشکل وغریب الفاظ کو حروف معجم کی ترتیب پر جمع کیا، اس میں قدماء کی کتابوں کی طرح متون واسانید کی بھرمار نہ تھی، قدماء کی تمام غریب حدیثوں کے ساتھ اضافہ بھی کیا، البتہ غریب الالفاظ ہونے کی وجہ سے ایک حدیث کو مختلف مقامات میں بیان کیا، اس کے باوجود یہ کتاب علماء کے نزدیک وضع واحاطہ کے اعتبار سے بڑی شہرت واعتماد کی مالک ہوئی اور بعد کے لوگوں نے اس پر استدراک لکھا اور اسی کے اسلوب پر اور کتابیں لکھی گئیں۔

بعد کی کتابیں بعد میں بھی اس فن میں تدوین وتالیف کا سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ علامہ ابوالقاسم محمود بن عمر جار اللہ زمخشری معتزلی ۵۳۸ھ نے الفائق تصنیف کی، جو اپنے موضوع پر نہایت کامیاب کتاب ہے، علامہ نے اس کی ترتیب مقفیٰ حروف پر رکھی، اور ایک لفظ کی مناسبت سے ایک ہی حدیث کو متعدد مقامات میں بیان کرکے اس کے غریب الفاظ کی توضیح وتخریج کی، اس لیے اس کتاب میں بھی احادیث کی تخریج وتلاش مشکل تھی، اسی وجہ سے امام

ہروی کی کتاب اس بارے میں الفائق سے زیادہ بہتر مانی گئی ہے حالانکہ ہروی کی کتاب میں بھی ایک حدیث کے الفاظ مختلف مقامات پر آئے ہیں۔"

اسی طرح ابو موسیٰ محمد بن ابو بکر مدینی اصفہانی ۵۸۱ھ نے ایک کتاب لکھی جس میں قرآن و حدیث کے ان غریب الفاظ کو جو ہروی کی کتاب میں نہیں آسکے تھے، ان ہی کے طرز پر جمع کیا، نیز ابو الفرج عبد الرحمن بن علی جوزی ۵۹۷ھ نے ایک کتاب میں صرف احادیث کے غریب الفاظ کو جمع کیا، اور اس میں امام ہروی کا طریقہ اختیار کیا ابن جوزی کی کتاب ہروی کی کتاب سے مختصر ہے، انھوں نے معمولی اضافہ کیا ہے بخلاف ابو موسیٰ مدینی کے کہ انھوں نے ہروی کی کتاب سے بہت کم اخذ و استفادہ کیا ہے، بلکہ مستقل کتاب لکھی ہے۔

اس کے بعد علامہ مجد الدین ابن اثیر ۶۰۶ھ نے اس فن میں اپنی کتاب النہایہ فی غریب الحدیث والاثر لکھی، انھوں نے اس میں ہروی اور ابو موسیٰ کی کتابوں کو جمع کر کے صحاح، سنن، جوامع مصنفات اور مسانید سے مزید اضافہ کیا اور ہروی کے حوالہ کے لیے "ہ" اور ابو موسیٰ کے لیے "س" مقرر کیا، بعد میں محمود بن ابو بکر ارموی ۷۲۳ھ نے نہایہ پر ذیل کے طور پر ایک کتاب لکھی، اور علی بن محمد صفوی ۷۲۳ھ نے اس کا اختصار کیا جو تقریباً نہایہ کا نصف ہے، امام جلال الدین سیوطی ۹۱۱ھ نے نہایہ کی ایک تلخیص الدر النثیر تلخیص نہایۃ ابن الاثیر کے نام سے لکھی، نیز سیوطی نے نہایہ پر تذییل اور تہذیب بھی لکھی اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع اور انفع کتاب مجمع بحار الانوار شیخ محمد بن طاہر بن علی پٹنی گجراتی کی ہے، علامہ محمد طاہر نے اس کتاب میں گزشتہ تمام کتابوں کا نچوڑ جمع کر کے مزید مفید اضافے کیے، اور اپنی تصنیف کے زمانہ ہی سے یہ کتاب علماء و محدثین میں معتبر مستند مانی گئی اور متداول رہی، واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کی وجہ سے علامہ گجراتی کا احسان عظیم علماء پر ہے، متعدد بار ہندوستان میں چھپ چکی ہے مگر افسوس کہ اس میں مطبعی اغلاط بہت زیادہ ہیں اور اب حجاز کے پٹنی تجار کی طرف سے حیدرآباد میں تحقیق و تصحیح کے بعد چھپ رہی ہے۔

علم اسماء الرجال

اسماء الرجال کا علم نہایت مہتم بالشان بلکہ حدیث کا نصف علم ہے، کیونکہ حدیث متن اور سند کا نام ہے، اور اسماء الرجال سند کے رواۃ و رجال کی معرفت کا نام ہے، اس علم میں مختلف انواع ہیں جن میں بے شمار کتابیں ہیں جن میں سے بعض میں صرف صحابہ کرام کا تذکرہ ہے، بعض میں عام رواۃ حدیث کا حال ہے، بعض خاص قسم رواۃ کے حال میں ہیں جیسے ثقات، ضعفاء، حفاظ، مدلسین، وضاعین، بعض کتابوں میں راویوں کے صرف اسماء و انساب ہوتے ہیں، یا صرف وفیات کا ذکر ہوتا ہے، اور بعض کتابیں موتلف و مختلف اور متفق و مفترق کے موضوع پر ہوتی ہیں،

اسماء الصحابہ صحابہ کے حالات میں سب سے پہلے امام بخاری ۲۵۶ھ نے مستقل کتاب لکھی جس میں اسماء صحابہ کو ذکر کیا، اس کے بعد امام بخاری کے مشائخ کے طبقہ کی ایک جماعت نے اسماء صحابہ کے ساتھ اپنے شیوخ کا ذکر کیا، چنانچہ ماہر انساب محدث خلیفہ بن خیاط ۲۴۰ھ اور محمد بن سعد واقدی ۲۳۰ھ نے طبقات کے نام سے اس فن میں کتابیں لکھیں، تاریخ کبیر امام بخاری حیدرآباد میں، طبقات ابن سعد یورپ اور بیروت میں اور طبقات خلیفہ شام میں تینوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں، نیز واقدی اور خلیفہ کے معاصرین میں یعقوب بن سفیان ۲۷۷ھ اور ابوبکر بن ابی خیثمہ ۲۷۹ھ نے بھی اس موضوع پر کتابیں لکھیں۔

اس کے بعد علماء کی ایک جماعت نے خاص طور سے صحابہ کے حالات میں کتابیں تصنیف کیں، جن میں حافظ عبد اللہ بن محمد بن عبد العزیز بغوی ۳۳۰ھ، حافظ ابوبکر عبد اللہ بن ابوداؤد ۳۱۶ھ، علی بن السکن ۳۵۳ھ، ابوبکر عمر بن احمد المعروف بہ ابن شاہین ۳۸۵ھ، ابومنصور ماوردی ۔۔۔ھ، ابوحاتم رازی ۔۔۔ھ، ابن حبان ۳۵۴ھ، سلیمان بن احمد طبرانی ۳۶۰ھ اور عبد اللہ بن مندہ ۳۵۵ھ اور حافظ ابونعیم ۴۶۳ھ زیادہ مشہور ہیں۔

پھر ابو یوسف عمر بن عبدالبر اندلسی ۴۶۳ھ نے "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب" لکھی، امام ابن عبدالبر کا خیال تھا کہ انھوں نے اپنے دور سے پہلے کے مصنفین کی کتابوں کے جملہ محتویات کا استیعاب کر لیا ہے، مگر اس کتاب میں سب صحابہ کے حالات نہ آسکے، اور بہت سے غیر صحابی کے حالات آگئے، اس لیے کئی علماء نے الاستیعاب کا ذیل لکھا، ان میں ابو بکر بن فتحون ۵۱۹ھ کا ذیل بہت طویل تھا، الاستیعاب حیدرآباد میں طبع ہو چکی ہے، اسی طرح ابو موسیٰ مدینی ۵۸۱ھ نے ابن مندہ کی کتاب کا ذیل لکھا، اور ساتویں صدی تک ان دونوں حضرات کی کتابوں پر ذیل لکھنے کا سلسلہ جاری رہا کہ اسی درمیان میں علامہ ابن اثیر ۶۳۰ھ نے ایک بڑی کتاب "اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ" کے نام سے تصنیف کی جو کئی جلدوں میں ہے، اس میں متقدمین کے جملہ محتویات کو درج کر دیا، مگر اسی کے ساتھ ان کی کتابوں کے اوہام کو بھی ذکر کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے صحابی کا تذکرہ کرنا رہ گیا اور بہت سے غیر صحابی کا ذکر آ گیا، اور علامہ ذہبی ۷۴۸ھ نے اسد الغابہ کے اسماء کی تجرید کر کے اس میں کچھ اضافہ بھی کیا، اور اوہام پر تنبیہ بھی کی، پھر بھی ذہبی کی یہ کتاب اس بارے میں کامل و مکمل نہ ہو سکی، اسد الغابہ مصر میں چھپی ہے اور اسی کا فوٹو اصفہان میں چھپا ہے مگر متعدد مقامات پر حاشیہ پر ایسی عبارتیں درج کر دی گئی ہیں جن سے شیعیت کے حق میں ذہن سازی ہوتی ہے، اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی نے کیا ہے جو چھپ گیا ہے، اور تجرید اسماء الصحابہ حیدرآباد میں چھپی ہے، اور اسی کی نقل بمبئی میں ہوئی ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن حجر ۸۵۲ھ نے آٹھ جلدوں میں "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" لکھی جس میں الاستیعاب اور اسد الغابہ اور ان کے تمام ذیول کو جمع کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے اسماء کا اضافہ کیا، اوہام و اغلاط کی نشاندہی کی، اور ترتیب و تہذیب کا پورا اہتمام کیا، ابن حجر کے تلمیذ رشید علامہ جلال الدین سیوطی ۹۱۱ھ نے عین الاصابہ کے نام سے الاصابہ کی تلخیص کی۔

یہ عام صحابہ کے حالات میں کتابیں ہیں، مخصوص صحابہ کے تذکرہ میں بھی کتابیں لکھی گئیں، چنانچہ بخاری و مسلم نے ایسے صحابہ کے حالات لکھے جن سے صرف ایک ہی حدیث مروی ہے۔ اور امام یحییٰ بن عبدالوہاب بن مندہ اصفہانی ۵۱۱ھ نے ایک کتاب ان صحابہ کے حالات میں تصنیف کی جو ایک سو بیس سال تک زندہ رہے، اور راقم نے "العقد الثمین فی فتوح الہند و من ورد فیہا من الصحابة و التابعین" لکھی جس میں ان صحابہ کے حالات بھی ہیں جو غزوات و فتوحات کے سلسلے میں ہندوستان میں تشریف لائے، اسماء الرجال پر مسلمانوں نے بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں لکھی ہیں اور اس فن میں بھی دنیا کی کوئی قدیم و جدید قوم ان کی ہمسری نہیں کر سکتی ہے، احادیث رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی خاطر مسلمانوں نے چار لاکھ سے زائد راویوں اور عالموں کے حالات قلم بند کئے ہیں یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

علم جرح و تعدیل

اس علم میں رجال و رواۃ حدیث کے احوال سے خاص خاص الفاظ میں بحث کی جاتی ہے جن سے ان راویوں کے درجات و مراتب معلوم ہوتے ہیں، رجال کے بارے میں جرح و تعدیل کے الفاظ رسول صلے اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہ اور تابعین سے منقول ہیں، اس کا مقصد لوگوں پر طعن و تشنیع ہرگز نہیں ہے، بلکہ صیانتِ حدیث کے لیے ان کے راویوں کی جانچ پڑتال کی گئی ہے اور یہ جائز ہے، اور جس طرح گواہوں کی جرح ہوتی ہے اسی طرح رواۃِ حدیث کی جرح ہوتی ہے، بلکہ ذاتی حقوق و اموال کی حفاظت و صیانت سے زیادہ ضروری امر عام دینی معاملات کی دیکھ بھال ہے

پہلی صدی اس فن میں بہت سے علماء و محدثین کے اقوال اور کلام ہیں، ان کا احصار دشوار ہے، ابن عدی ۳۶۵ھ نے اپنی کتاب الکامل کے مقدمہ میں اپنے زمانہ تک کے ائمہ جرح و تعدیل کے نام دیئے ہیں، قرن اول میں حضرات صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباس ۶۸ھ، حضرت عبادہ ابن صامت ۳۴ھ حضرت انس بن مالک ۹۳ھ، اور تابعین میں

امام شعبی ۱۰۴ھ، امام محمد بن سیرین ۱۱۰ھ، اور امام سعید بن مسیّب بعد ۹۰ھ ائمہ جرح و تعدیل ہیں، یہ حضرات بعد کے ائمہ جرح و تعدیل کے مقابلہ میں بہت کم ہیں، وجہ یہ ہے کہ انہوں نے صحابہ سے حدیث کی روایت کی اور تمام صحابہ عادل و ثقہ ہیں، اور غیر صحابہ یعنی تابعین بھی ثقات میں سے ہیں، اس دور میں کوئی غیر ثقہ راوی مشکل ہی سے ملے گا۔

دوسری صدی البتہ دوسری صدی کے درمیانی طبقہ کے تابعین میں کچھ ضعفاء پیدا ہو گئے یعنی احادیث اور ضبط و تدوین کے سلسلہ میں ان میں کچھ ضعف آ گیا اور انھوں نے مراسیل کی روایت کی، موقوف احادیث کو مرفوع سمجھ کر بیان کیا، ورنہ وہ اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے ضعفاء میں نہیں تھے اور ان حضرات میں کوئی کمی نہیں تھی، بلکہ ان کی روایت کے طریقے کچھ ضعیف تھے، ان میں ابو ہارون عبدری ۱۴۳ھ وغیرہ شامل ہیں، تابعین عظام کے آخری طبقہ کے زمانہ میں (حدود ۱۵۰ء) ائمہ حدیث کی ایک جماعت نے کھل کر جرح و تعدیل میں کلام کیا، امام اعمش ۱۴۸ھ نے ایک جماعت کی تضعیف اور دوسری جماعت کی توثیق کی اور شعبہ ۱۶۰ھ نے رجالِ حدیث میں غور کر کے کلام کیا، شعبہ نہایت ثقہ تھے، اور عموماً ثقہ راویوں سے روایت کرتے تھے، اسی طرح امام مالک ۱۷۹ھ نے بھی اس فن میں کلام کیا، اس دور میں معمر ۱۵۳ھ، ہشام دستوائی ۱۵۴ھ، اوزاعی ۱۵۶ھ، سفیان ثوری ۱۶۱ھ، ابن ماجشون ۱۶۳ھ، حماد بن سلمہ ۱۶۷ھ، لیث بن سعد ۱۷۵ھ وغیرہ نے رواۃ حدیث میں کلام کیا۔

اس طبقہ کے بعد عبداللہ بن مبارک ۱۸۱ھ، ہشیم بن بشیر ۱۸۸ھ، ابو اسحٰق فزاری ۱۸۵ھ، معافی بن عمران موصلی ۱۸۵ھ، بشر بن مفضل ۱۸۶ھ اور سفیان بن عیینہ ۱۹۷ھ وغیرہ تھے ان ائمہ کے زمانہ میں ائمہ جرح و تعدیل کا ایک دوسرا طبقہ پیدا ہوا جس میں ابن علیہ ۱۹۳ھ، ابن وہب ۱۹۷ھ اور وکیع بن جراح ۱۹۷ھ وغیرہ تھے، اس دور میں جرح و تعدیل کے دو جلیل القدر امام پیدا ہوئے یحییٰ بن سعید القطان ۱۸۹ھ اور عبدالرحمٰن بن مہدی ۱۹۸ھ ان دونوں اماموں پر علمائے حدیث نے اس بارے میں پورا اعتماد کیا، اور جسے انھوں نے مجروح

کو ثقہ قرار دیا وہ امت کے نزدیک مجروح یا ثقہ مانا گیا، اور جس کے بارے میں انھوں نے اختلاف کیا اس کے بارے میں امت نے ان کے رجحان پر عمل کیا۔

تیسری صدی

اس کے بعد اس فن میں ایک دوسرا طبقہ پیدا ہوا، جو مرجع ٹھہرا، اس میں یزید بن ہارون سنہ ۲۰۶ھ، ابوداؤد طیالسی سنہ ۲۰۴ھ، عبدالرزاق بن ہمام صنعانی سنہ ۲۱۱ھ، ابوعاصم ضحاک بن نبیل بن مخلد سنہ ۲۱۲ھ شامل ہیں، اس کے بعد علم جرح وتعدیل میں مستقل تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوا جن میں رواۃ حدیث کے حالات بلاکم وکاست ظاہر کئے گئے اس دور میں اس فن کی سیادت ایک جماعت کو ملی جس میں یحییٰ بن معین سنہ ۲۳۳ھ وغیرہ شامل ہیں، بعض رجال کے متعلق ابن معین کے الفاظ جرح وتعدیل مختلف ہیں، ان ہی کے طبقہ میں امام احمد بن حنبل سنہ ۲۴۱ھ ہیں، آپ کے تلامذہ نے رجال حدیث کے بارے میں سوالات کئے اور آپ نے اظہار خیال فرمایا، امام احمد کی کتاب العلل ومعرفۃ الرجال ان کے صاحبزادے عبداللہ کی روایات سے ہے [illegible] اور ترکی میں چھپی ہے، محمد بن سعد واقدی سنہ ۲۳۰ھ نے الطبقات الکبریٰ میں رجال پر گفتگو کی ہے، اور ان کا کلام اس بارے میں مستند مانا جاتا ہے، ابوخثیمہ زہیر بن حرب سنہ ۲۳۴ھ نے بھی جرح وتعدیل کے باب میں کلام کیا ہے، حافظ ضریر ابوجعفر عبداللہ بن محمد النفیلی بھی اس فن کے مستند عالم تھے، ان کے متعلق ابوداؤد کا قول ہے میں نے ان سے بڑھ کر حافظ حدیث نہیں دیکھا، علی بن مدینی سنہ ۲۳۴ھ کی علل اور رجال پر کئی کتابیں ہیں، محمد بن عبداللہ بن نمیر سنہ ۲۳۴ھ، ابوبکر بن ابی شیبہ سنہ ۲۳۵ھ، عبداللہ بن عمر وقواریری سنہ ۲۳۵ھ، امام خراسان اسحٰق بن راہویہ سنہ ۲۳۷ھ، حافظ ابوجعفر محمد بن عبداللہ بن عمار موصلی سنہ ۲۴۲ھ حافظ مصر احمد بن صالح سنہ ۲۴۸ھ ہارون بن عبداللہ حمال سنہ ۲۴۳ھ، یہ تمام حضرات ائمہ جرح وتعدیل ہیں، اور راویوں کے بارے میں ان کے اقوال مستند ومعتبر مانے جاتے ہیں ان ہی حضرات سے متصل اس فن میں ایک اور طبقہ پیدا ہوا جس میں امام اسحاق کوسج سنہ ۲۵۱ھ امام دارمی سنہ ۲۵۵ھ، امام بخاری سنہ ۲۵۶ھ اور نزیل مغرب حافظ عجلی سنہ ۲۶۱ھ شامل ہیں، اس کے بعد

کے طبقہ میں ابوزرعہ رازی ۲۶۴ھ، ابوحاتم رازی ۲۷۷ھ، امام مسلم ۲۶۱ھ، ابوداؤد سجستانی ۲۷۵ھ، بقی بن مخلد ۲۷۶ھ، ابوزرعہ دمشقی ۲۸۱ھ وغیرہ ہیں، پھر عبدالرحمٰن بن یوسف بغدادی علم حدیث کی معرفت وجامعیت میں ابوحاتم رازی کے ہم پایہ ہیں، ابراہیم بن اسحٰق حربی ۲۸۵ھ، محمد بن وضاح ۲۹۰ھ حافظ قرطبہ ابوبکر بن ابی عاصم ۲۸۷ھ، عبداللہ بن امام احمد بن حنبل ۲۹۰ھ، صالح جزرہ ۲۹۳ھ، ابوبکر بزار ۲۹۲ھ، محمد بن نصر مروزی ۲۹۴ھ، محمد بن عثمان بن ابی شیبہ ۲۹۷ھ، ہیں۔

چوتھی صدی
ان کے بعد ابوبکر فریابی، امام نسائی ۳۰۳ھ، ابویعلیٰ ۳۰۷ھ، ابوالحسن سفیان ابن خزیمہ ۳۱۱ھ، محمد بن جریر طبری ۳۱۰ھ دولابی ۳۱۰ھ، ابوعروبہ حرانی ۳۱۸ھ، ابوالحسن احمد بن عمیر ۳۲۰ھ، احمد بن نصر بغدادی ۳۲۳ھ وغیرہ، پھر ابوحاتم بن حبان بستی ۳۵۴ھ، طبرانی ۳۶۰ھ، ابن عدی جرجانی ۳۶۵ھ وغیرہ ہیں، ابن عدی کی کتاب گویا جرح وتعدیل میں آخری کتاب ہے، اس طبقہ کے بعد ابوعلی حسین بن محمد نیساپوری ۳۶۵ھ، ان کی مسند معلل کے تیرہ سو اجزاء میں ہے، ابوالشیخ بن حبان ۳۶۹ھ، ابوبکر اسماعیلی ۳۷۱ھ، ابواحمد حاکم ۳۷۸ھ، دارقطنی ۳۸۵ھ وغیرہ ہیں، علل کی معرفت دارقطنی پر گویا ختم ہوگئی، ابن منده ۳۹۵ھ، ابونصر کلاباذی ۳۹۸ھ وغیرہ۔

پانچویں صدی
ابوعبداللہ حاکم ۴۰۵ھ، عبدالرحمٰن بن فطیس قاضی قرطبہ ۴۰۲ھ، ان کی کتاب کا نام دلائل السنۃ ہے، عبدالغنی بن سعید ۴۰۹ھ، ابوبکر بن مردویہ اصفہانی ۴۱۶ھ، پھر محمد بن ابی الفوارس بغدادی ۴۱۲ھ ابوبکر برقانی ۴۲۵ھ، ابوحاتم عبدری ان کے تلامذہ نے ان سے دس ہزار اجزاء لکھے، محمد بن خلف واسطی ۴۰۱ھ، ابومسعود دمشقی ۴۰۱ھ، حسن بن محمد خلال بغدادی ۴۳۹ھ، ابویعلیٰ خلیلی ۴۴۶ھ، ابن عبدالبر اندلسی ۴۶۳ھ، ابن حزم اندلسی ۴۵۶ھ، بیہقی ۴۵۸ھ، خطیب بغدادی ۴۶۳ھ، پھر ابن ماکولا ۴۷۵ھ، ابوالولید باجی ۴۷۴ھ، ابوعبداللہ حمیدی ۴۸۸ھ، وغیرہ ہیں۔

چھٹی صدی | پھر ابو الفضل بن طاہر مقدسی ۵۰۷ھ، موتمن بن احمد ۵۰۷ھ شہرویہ دیلمی سنہ، ابو موسیٰ مدینی ۵۸۱ھ، ابو القاسم بن عساکر دمشقی ۵۲۳ھ، ابن بشکوال ۵۷۸ھ، ابوبکر حازمی ۵۸۴ھ، عبد الغنی مقدسی ۶۰۰ھ وغیرہ

اس کے بعد | اس کے بعد اس فن کے ائمہ میں یہ حضرات زیادہ مشہور ہیں: رہاوی سنہ، ابو شامہ ۶۲۵ھ، ابن مفضل مقدسی ۶۱۶ھ، ابو الحسن بن قطان ۶۳۸ھ، ابن الانماطی ۶۱۹ھ، ابن نقطہ ۶۲۹ھ، پھر ابن صلاح ۶۴۳ھ، زکی الدین منذری ۶۵۶ھ، ابو عبد اللہ برزالی ۶۳۶ھ، ابن ابار سنہ، ابن دقیق العید ۷۰۲ھ، شرف میدومی سنہ ابن تیمیہ ۷۲۸ھ، اس کے بعد مزی ۷۴۲ھ ابن سید الناس سنہ، ابو عبد اللہ بن ایبک ذہبی ۷۴۸ھ، شہاب بن فضل اللہ ۷۴۹ھ مغلطائی ۷۶۲ھ شریف حسینی دمشقی سنہ زین الدین عراقی ۸۰۶ھ ولی الدین عراقی سنہ برہان الدین حلبی سنہ، ابن حجر عسقلانی ۸۵۲ھ، وغیرہ ہیں۔

یہ ہر دور کے مشہور ائمہ جرح و تعدیل کے نام ہیں، ورنہ ہر دور میں اس فن کے بہت سے علماء گزرے ہیں، اور ہر پچھلے دور کے لوگ پہلے کے دور کے لوگوں سے اس فن میں زیادہ محتاط رہے ہیں، فن جرح و تعدیل کے سلسلے میں نسبتہً طوالت سے کام لیا گیا ہے تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ احادیث رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور ان کو صحیح طریقہ پر پہنچانے کے لیے علمائے امت نے کیا کیا جتن کیے ہیں، ایک ایک راوی کے حالات زندگی معلوم کئے، اس کی داخلی و خارجی زندگی کا جائزہ لیا، اور اس کے بارے میں جرح و تعدیل کے آراء کو ضبط کر کے ان کو مدون و مرتب کیا واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اپنے دینی علوم و معارف کی حفاظت و صیانت اور تعلیم و تبلیغ کا اس قدر اہتمام و انتظام نہ کر سکی جس قدر کہ امت محمدیہ نے اس بارے میں کیا ہے، والحمد للہ ذالک۔

جرح و تعدیل اور رجال کی جامع کتابیں | جرح و تعدیل کی کتابوں میں سے بعض ثقات پر، بعض ضعفاء پر، بعض مدلسین پر اور بعض عام رجال حدیث پر ہیں، ان میں سے بعض کتابیں کسی خاص کتاب کے رجال میں یا چند کتابوں کے رجال میں ہیں، ذیل میں ہم بعض مشہور کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں:

ثقات وضعفاء کی جامع کتابوں میں مشہور کتابیں یہ ہیں، الطبقات الکبری محمد بن سعد وا
سنہ ۲۳۰ھ، یہ کتاب اپنے موضوع کی سب سے بڑی اور جامع ہے، اس میں صحابہ و تابعین اور بع
کے علماء و محدثین اور فقہاء کے تذکرے ہیں، لیڈن اور بیروت میں چھپی ہے، علامہ سیوطی سنہ ۹۱۱ھ
" انجاز الوعد المنتقی من طبقات ابن سعد" کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے، طبقات خلیفہ بن
خیاط سنہ ۲۴۰ھ، حال ہی میں شام میں چھپی ہے، طبقات امام مسلم بن حجاج سنہ ۲۶۱ھ، تاریخ ا
بی خیثمہ سنہ ۲۷۹ھ، یہ کتاب بڑے کام کی ہے، التاریخ الکبیر، الاوسط اور الصغیر امام بخار
سنہ ۲۵۶ھ، تاریخ کبیر حروف معجم کی ترتیب پر ہے، اس کی ابتداء محمد سے ہے حیدر آباد میں چھ
چکی ہے، تاریخ صغیر الہ آباد میں چھپی تھی، تاریخ اوسط مسودہ ہے، مسلم بن قاسم سنہ ... نے ت
کبیر پر ایک جلد میں ذیل لکھا ہے، اور ابن ابی حاتم رازی سنہ ۳۲۷ھ نے ایک جلد میں تاریخ کبیر
تنقید کی ہے، جس کا نام " بیان خطأ البخاری فی تاریخہ" ہے اور حیدر آباد میں چھپی ہے، نیز ابو
حاتم رازی نے اپنی مشہور کتاب الجرح و التعدیل لکھی، جس میں امام بخاری کا اسلوب اختیار کیا
یہ بھی حیدر آباد میں چھپ گئی ہے، حسین بن ادریس انصاری ہروی المعروف بہ ابن خرم ...
نے بھی تاریخ بخاری کے انداز پر ایک تاریخ لکھی ہے، علی بن مدینی سنہ ۲۳۴ھ کی تاریخ دس ا
میں ہے، ابن حبان سنہ ۳۵۴ھ نے بھی ایک کتاب اصحاب تاریخ کے اوہام میں دس اجزاء
لکھی ہے، ابو محمد بن عبد اللہ بن علی بن جارود سنہ ... کی ایک کتاب جرح و تعدیل میں ہے، ا
طرح امام مسلم کی رواۃ الاعتبار، امام نسائی کی التمییز، ابو یعلی خلیلی سنہ ۴۴۶ھ کی الارشاد، عماد بن کثیر
کی التکمیل فی معرفۃ الثقات و الضعفاء والمجاہیل" ہے اس میں ابن کثیر نے مزی کی تہذیب ا
کی میزان الاعتدال کو اضافہ کے ساتھ جمع کر دیا ہے، یہ کتاب محدث و فقیہ دونوں کے لیے نہا
مفید ہے، ذہبی کی تاریخ، اسمٰعیل بن عمر ابن کثیر دمشقی سنہ ۷۷۴ھ کی التکمیل، عمر بن علی بن الملقن
کی طبقات المحدثین جس میں انہوں نے اپنے زمانہ تک کے محدثین کا تذکرہ کیا ہے، ان کی ایک
کتاب الاکمال فی معرفۃ الرجال بھی ہے۔

کتب ثقات

کتاب الثقات عجلی ۲۶۱ھ، کتاب الثقات خلیل ابن شاہین، اس کا قلمی نسخہ کہیں بھی میں موجود ہے۔ الثقات ابو حاتم بن حبان بستی ۳۵۴ھ یہ کتاب حال میں حیدر آباد دکن چھپی ہے جس میں ثقات تابعین کا تذکرہ ہے، کتاب الثقات زین الدین قاسم بن قطلوبغا حنفی ۸۷۹ھ، یہ کتاب چار جلدوں میں ہے، اس میں ان رواۃ و رجال کے اسماء و حالات ہیں جن کے نام صحاح ستہ میں نہ آسکے، اسی قسم میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو طبقات حفاظ حدیث پر ہیں، اس موضوع پر علماء کی ایک جماعت نے کتابیں لکھی ہیں، جیسے امام ذہبی ۷۴۸ھ، ابن الدباغ ۵۴۶ھ، ابن مفضل، ابن حجر عسقلانی سیوطی ۹۱۱ھ، امام ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ چار جلدوں میں حیدر آباد میں دوبار چھپی ہے، اور اس پر تقی الدین بن فہد مکی، محمد بن محمد بن ہاشمی ۸۹۰ھ اور سیوطی نے ذیل لکھے ہیں، یہ تینوں کتابیں مصر میں ایک ساتھ چھپ گئی ہیں۔

کتب ضعفاء

کتاب الضعفاء امام بخاری، کتاب الضعفاء والمتروکین امام نسائی، امام ابو الفرج عبد الرحمن بن علی جوزی ۵۹۷ھ کی کتاب ضعفاء میں بہت بڑی اور جامع ہے، امام ذہبی نے اس کا اختصار کیا ہے اور اس کا ذیل لکھا ہے، نیز علاء الدین مغلطائی ۷۶۲ھ نے اس کا ذیل لکھا، کتاب الضعفاء محمد بن عمر عقیلی ۳۲۲ھ مفید کتاب ہے، امام حسن بن محمد صغانی لاہوری ۶۵۰ھ اور محمد بن حبان بستی کی کتابیں اس سلسلہ میں جامع ہیں، اور احمد بن عدی کی کتاب الکامل ضعفاء کے موضوع پر سب سے مکمل اور بڑی کتاب ہے، اور اسے ائمہ کا اعتماد حاصل ہے، ابو العباس احمد بن محمد حنبلی المعروف بہ ابن الرومیہ ۶۳۷ھ، دارقطنی، حاکم، اور علاء الدین ماردینی ۷۵۰ھ نے بھی ضعفاء کے نام سے کتابیں لکھی ہیں، ذہبی کی میزان الاعتدال بھی جامع ہے، ہندوستان اور مصر میں طبع ہو چکی ہے، حافظ زین الدین عراقی نے دو جلدوں میں اس کا ذیل لکھا ہے، اور حافظ ابن حجر نے تہذیب الکمال سے ناموں کو چھانٹ کر اور دوسرے مستقل تراجم اور زیادات کو تلاش کر کے لسان المیزان لکھی جو حیدر آباد میں طبع ہو چکی ہے، اس سلسلہ میں حافظ ابن حجر نے دو اور کتابیں لکھی ہیں، تقویم اللسان اور تحریر المیزان، کتب مذکورہ کے علاوہ ضعفاء کے بیان میں اور بہت سی کتابیں ہیں۔

کتب مدلسین امام شافعی کے تلمیذ امام حسن بن علی کرابیسی ۲۴۵ھ نے سب سے پہلے مدلسین کے موضوع پر مستقل کتاب لکھی، ان کے بعد دار قطنی اور نسائی کی کتابیں ہیں امام ذہبی نے مدلسین کے سلسلے میں کچھ اشعار لکھے، پھر ان کے شاگرد احمد بن ابراہیم مقدسی نے امام علائی کی کتاب جامع التحصیل سے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا، نیز علائی کی کتاب کے حاشیہ پر زین الدین عراقی ۸۰۶ھ نے کچھ مدلسین کا اضافہ کیا، پھر ان کے لڑکے ولی الدین عراقی نے اسے حواشی سے علیحدہ کر کے علائی کی کتاب میں شامل کر دیا، بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ کر کے مستقل تصنیف بنا دیا، اس کے بعد ابراہیم بن محمد حلبی ۸۴۱ھ نے "التبیین فی اسماء المدلسین" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ان تینوں کتابوں پر اضافہ کیا، علائی کی کتاب میں کل (۶۸) مدلسین کا تذکرہ تھا، عراقی کے صاحبزادے نے ان میں (۱۳) کا اضافہ کیا اور حلبی نے (۳۲) کا اضافہ کیا، اس کے بعد حافظ ابن حجر نے مزید (۳۹) کا اضافہ کیا اور ان سب کی مجموعی تعداد (۱۵۲) ہو گئی، سیوطی نے بھی ایک رسالہ اسماء المدلسین لکھا ہے۔

کتب مخصوصہ کے رجال پر کتابیں رجال البخاری، احمد بن محمد کلاباذی ۳۹۸ھ، رجال البخاری محمد بن داؤد کردی ۹۲۵ھ، رجال مسلم احمد بن علی المعروف بہ ابن منجویہ ۴۲۸ھ، و رجال مسلم احمد بن علی اصفہانی ۲۷۹ھ، محمد بن طاہر مقدسی ۵۰۷ھ نے بخاری و مسلم دونوں کے رجال کو ایک کتاب الجمع بین رجال الصحیحین میں جمع کیا، نیز مقدسی نے اس میں ابن منجویہ اور کلاباذی کی کتابوں کو جمع کر کے اضافہ کیا اور اس کی ترتیب حروف پر رکھی یہ کتاب حیدر آباد میں چھپ چکی ہے، اور ہبۃ اللہ لالکائی ۴۱۸ھ نے بھی صحیحین کے رجال پر ایک کتاب لکھی ہے، اور سنن کی کتابوں کے رجال کو ابو داؤد حسین بن محمد حبانی ۴۹۸ھ نے ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے، سیوطی نے موطا امام مالک کے رجال کو اسعاف المبطا میں جمع کیا ہے جو ان کی تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک کے ساتھ مصر میں چھپی ہے، محمد بن عبداللہ الخطیب صاحب مشکوۃ نے مشکوۃ المصابیح کے رجال کو جمع کیا ہے، حافظ ابن حجر نے

رجال الاربعۃ کے نام سے موطا امام مالک، مسند امام شافعی، مسند امام احمد، مسند امام ابوحنیفہ کے رجال جمع کیا ہے، احمد بن احمد کردی ۷۶۳ھ نے "رجال السنن الاربع" یعنی ترمذی، نسائی، ابوداؤد اور ابن ماجہ کے رجال کو یکجا کیا، ابو محمد عبد الغنی بن عبد الواحد بن سرور مقدسی ۶۰۰ھ نے صحاح ستہ کے رجال کو الکمال فی معرفۃ الرجال میں ذکر کیا، پھر جمال الدین یوسف بن زکی الدین مزی ۷۴۲ھ نے اس کی تہذیب و تنقیح کرکے تہذیب الکمال لکھی، یہ کتاب تیرہ جلدوں میں تھی، اپنے باب میں یہ کتاب بے مثال ہے، اور عمر بن علی بن الملقن ۸۰۵ھ نے اکمال التہذیب لکھی، امام سیوطی نے "زوائد الرجال علی تہذیب الکمال" نامی کتاب لکھی مزی کی تہذیب الکمال کے مختصرات بہت ہیں، چنانچہ ذہبی کی ایک کتاب الکاشف بھی ان ہی میں سے ہے اس کے مقدمہ میں ذہبی نے لکھا ہے کہ یہ مختصر کتاب کتب ستہ یعنی صحیحین اور چاروں سنن کے رجال میں ہے، اور مزی کی کتاب کا انتخاب ہے، اس میں صرف صحاح ستہ کے ان ہی رجال کا ذکر ہے۔ جن کی روایات ان میں موجود ہیں، ان کے علاوہ مزی کی کتاب کے اور رجال کا ذکر نہیں ہے، مزی کی تہذیب الکمال کے مختصرات میں حافظ ابن حجر کی تہذیب التہذیب ہے جو ذہبی کی الکاشف سے زیادہ جامع ہے، اور ابن حجر نے اپنی طرف سے بعض تراجم کا اضافہ بھی کیا ہے، یہ کتاب حیدرآباد میں چھپ چکی ہے، پھر حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب کا اختصار تقریب التہذیب کے نام سے کیا، یہ کتاب پہلے ہندوستان میں متعدد بار چھپی تھی اور اب مصر میں بھی چھپ گئی ہے، اس موضوع پر حافظ ابو المحاسن دمشقی ۷۶۵ھ نے "التذکرۃ فی رجال العشرۃ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔

کتب وفیات محدثین رجال کی بہت سی کتابوں میں صرف محدثین و رجال کی وفیات بیان کی گئی ہیں، سب سے پہلے حافظ ابوسلیمان محمد بن عبد اللہ نے رواۃ حدیث کے سنین وفات جمع کئے، اور سلھ سے ۳۳۸ھ تک یہ کام کیا، حافظ ابو محمد بن عبد العزیز کتانی ۴۶۶ھ نے اس کا ذیل لکھا، اور کتانی کے اس ذیل پر ہبۃ اللہ احمد اکفانی نے ایک معمولی سا

ذیل لکھا جو ۵۸۵ھ تک تقریباً بیس سال پر مشتمل ہے، پھر اکفانی کی کتاب پر علی بن مفضل مقدسی ۶۱۱ھ نے ۵۸۱ھ تک ذیل لکھا، اور ابن مفضل کے اس ذیل پر عبد العظیم بن عبد القوی منذری ۶۵۶ھ نے تین جلدوں میں "التکملۃ لوفیات النقلۃ" کے نام سے ایک بڑا ذیل لکھا، اور منذری کے اس ذیل پر ان کے شاگرد عز الدین احمد بن محمد نے ۶۷۴ھ تک ذیل لکھا، اور عز الدین کے ذیل پر احمد بن ایبک دمیاطی نے ۷۴۹ھ تک ذیل لکھا، اور ابن ایبک کے ذیل پر حافظ زین الدین عبد الرحیم عراقی ۸۰۶ھ نے ذیل لکھا، یہ تمام کتابیں رجال حدیث کے سنہ وفات کے مطابق سنین وشہور پر مرتب کی گئی ہیں اور ان کی ترتیب حروف تہجی پر نہیں ہے۔
فنِ اسماء الرجال کے اس شعبہ میں قاسم بن محمد دمشقی برزالی ۷۳۸ھ کی تاریخ سب سے بہتر کتاب ہے، تقی الدین بن رافع نے ۷۳۷ھ سے ۷۷۴ھ تک اس کا ذیل لکھا ہے اور اس ذیل پر تقی الدین بن حجر نے ذیل لکھا ہے، نیز مبارک بن احمد انصاری کی وفیات الشیوخ، اور ابراہیم بن اسمٰعیل حبال کی کتاب الوفیات اس فن کی اچھی کتابیں ہیں۔

کتبِ اسماء وکنیٰ اور القاب

بعض رواۃ حدیث اپنے نام سے مشہور ہوئے، اور ان کی کنیت اور لقب کو ان کی شہرت میں دخل نہیں ہے، اور بعض اپنے لقب یا کنیت سے مشہور ہوئے، اور ان کا نام دب گیا، اس لیے محدثین نے رواۃ حدیث کے اسماء والقاب اور کنیٰ پر کتابیں لکھیں، تاکہ ان میں اشتباہ نہ ہو، اور ایک راوی کے اسم ولقب اور کنیت کو دوسرے کا اسم ولقب اور کنیت نہ سمجھا جائے اور اس طرح ثقہ راوی کو ضعیف، صادق کو کاذب یا اس کے خلاف نہ شمار کیا جائے، اس بارے میں علی بن مدینی، نسائی، حاکم، عبد البر اور دوسرے بہت سے علماء نے کتابیں لکھیں، امام ذہبی نے ایک کتاب المقتنیٰ فی سرد الکنیٰ لکھی، یہ اس فن کی سب سے بڑی کتاب ہے، جو راوی اپنے نام سے مشہور نہیں ان کی کنیت پر ابوحاتم بن حبان بستی نے کتاب لکھی، اور القابِ رواۃ پر لکھنے والوں میں ابوبکر شیرازی ۴۰۷ھ ہیں، ابو الفضل نے منتہی الکمال لکھی، نیز ابن جوزی اور ابن حجر نے اس موضوع

کتابیں تصنیف کیں، کتاب الکنیٰ والاسماء ابو بشر دولابی کی حیدر آباد میں چھپی ہے، اور امام نووی کی تہذیب الاسماء واللغات مصر میں طبع ہوئی ہے۔

مؤتلف مختلف، متفق مفترق، اور مشتبہ اسماء وانساب پر کتابیں

بعض اسماء وانساب میں الفاظ کی خطی صورت ایک ہوتی ہے مگر صیغہ اور صورت میں اختلاف ہوتا ہے، مثلاً سلام اور سلّام پہلا لام کی تخفیف اور دوسرا لام کی تشدید کے ساتھ صورۃً دونوں الفاظ ایک معلوم ہوتے ہیں حالانکہ دونوں جدا جدا ہیں، ایسے اسم کو مؤتلف ومختلف کہتے ہیں اور بعض اسماء میں لفظاً اور خطاً دونوں ایک ہوتے ہیں مگر متعدد راویوں کے نام ہوتے ہیں یعنی اسم ایک اور مسمّیٰ کئی ہوتے ہیں جیسے خلیل بن احمد کئی لوگوں کا نام ہے ایسے لفظ کو متفق ومفترق کہا جاتا ہے، اور بعض اسماء میں لفظ وخط ہم جنس ہوتے ہیں مگر آباء وانساب میں خطاً اشتباہ ہونے کے باوجود لفظاً مختلف ہوتے ہیں، جیسے محمد بن عَقِیل قاف کے کسرہ کے ساتھ اور محمد بن عُقَیل قاف کے فتحہ کے ساتھ، یا شریح بن نعمان شین اور حاء کے ساتھ، اور سریج بن نعمان سین اور جیم کے ساتھ، یعنی پہلا اسم شین اور حاء سے اور دوسرا اسم سین اور جیم سے، ایسے لفظ کو مشتبہ کہتے ہیں۔

ان اختلافات کی شناخت فن حدیث میں بڑا اہم کام ہے، ابن مدینی کا قول ہے کہ سخت ترین غلطی یہ ہے کہ اسماء کے بارے میں غلطی ہو جائے، کیونکہ قیاس وظن کو دخل نہیں ہے، نہ کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جس سے صحیح اسم کا پتہ چل سکے، اس وجہ سے راویوں میں اختلاط واشتباہ ہو جاتا ہے اور ان کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے، اسی لیے مذکورہ بالا جملہ اقسام پر محدثین نے کتابیں لکھی ہیں، چنانچہ مؤتلف ومختلف میں ابو احمد عسکری ۳۸۲ھ نے ایک کتاب لکھی اور اسے اپنی کتاب التصحیف کا ایک حصہ قرار دیا، اس کے بعد عبد الغنی بن سعید ۴۰۹ھ نے مستقل کتاب تصنیف کی، اس سلسلے میں ان کی دو کتابیں ہیں ایک مشتبہ الاسماء میں اور دوسری مشتبہ الانساب میں، نیز ان کے شیخ دارقطنی ۳۸۵ھ نے ایک بڑی کتاب لکھی تھی، پھر ابو بکر احمد بن علی خطیب بغدادی ۴۶۳ھ نے ایک ذیل "المؤتلف لتکملۃ المختلف" لکھا اس میں خطیب نے اپنے پیش روؤں کی کتابوں پر استدراک کر کے ان کے اوہام کو جمع کیا، یہ کتاب اس بارے میں سب سے

زیادہ جامع اور محدثین کے نزدیک معتمد ہے، پھر خطیب کی کتاب پر محمد بن عبد الغنی المعروف بہ ابن نقطہ حنبلی ۶۲۹ھ نے استدراک کے طور پر مستقل کتاب لکھی، اور ابن نقطہ کی اس کتاب پر منصور بن سلیم ۶۷۳ھ نے ایک جلد میں ذیل لکھا، اسی طرح ابو محمد بن علی دمشقی ۶۸۰ھ نے اس کا ذیل لکھا، اور ان دونوں کے ذیل پر حافظ علاء الدین مغلطائی ۷۶۲ھ نے ایک ذیل لکھا مگر انہوں نے رواۃ حدیث کے مقابلہ میں شعراء کے اسماء و القاب اور انساب عرب کو زیادہ ذکر کیا ہے، اور خطیب بغدادی تک کی جملہ کتب مؤتلف و مختلف کو سامنے رکھ کر امیر ابو نصر علی بن ہبۃ اللہ بن ماکولا نے ایک کتاب الاکمال لکھی جو اس وقت کی تمام کتابوں کی جامع ہے، یہ کتاب حیدر آباد میں چھپ رہی ہے اب تک چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں علامہ ذہبی نے کتاب المشتبہ فی الرجال اسمائہم و انسابہم لکھی مگر اس میں تصحیف کثرت سے ہو گئی اور ان غلطیوں کو حافظ ابن حجر نے "تبصیر المنتبہ بتحریر المشتبہ" میں واضح کیا جس میں اسماء کے حروف کو ضبط کر کے ذہبی کی فرو گزاشتوں کو لکھ دیا ہے، ذہبی کی یہ کتاب پہلے یورپ میں ایک جلد میں اور بعد کو مصر میں کئی جلدوں میں چھپی ہے، اس باب میں علی بن عثمان ماردینی ۷۵۰ھ، یحیی بن علی مصری ۶۱۶ھ، محمد بن احمد ابیوردی ۵۰۷ھ عبد الرزاق ابن الفوطی ۷۲۳ھ نے بھی کتابیں لکھی ہیں، علامہ محمد طاہر گجراتی کی کتاب المغنی فی المشتبہ چھپ چکی ہے، متفق و مفترق کے موضوع پر خطیب بغدادی نے کتاب المتفق والمفترق لکھی، نیز خطیب نے مشتبہ الاسماء پر تلخیص المتشابہ لکھی، پھر خود ہی اس کا ذیل لکھا، یہ کتاب نہایت مفید ہے"۔

علم ناسخ و منسوخ

اگر حدیث مقبول کے مقابلہ میں دوسری حدیث معارض نہ ہو تو اسے محکم کہتے ہیں، اور اگر اس کے مقابلہ میں اسی جیسی دوسری حدیث معارض ہو، اور دونوں میں تطبیق و جمع ممکن ہو تو اسے مختلف الحدیث کہتے ہیں اور اگر صورت یہ ہو کہ دونوں حدیثوں میں جمع و تطبیق

نہ ہوسکے تو ان میں سے جس حدیث کا تاخر ثابت ہو اور معلوم ہو کہ یہ بعد کی ہے وہ ناسخ ہے، اور پہلی حدیث منسوخ ہے، ناسخ و منسوخ احادیث کے بارے میں علماء نے بہت سی کتابیں لکھی چند مشاہیر یہ ہیں۔

احمد بن اسحاق دیناری ۳۱۸ھ، محمد بن بحر اصفہانی ۳۲۲ھ، احمد بن محمد نحاس ۳۳۸ھ، ابو قاسم بن اصبغ ۳۴۰ھ محمد عثمان المعروف مجد شیبانی ــــــھ، ہبۃ اللہ بن سلامہ ۴۱۰ھ، محمد بن موسی حازمی ۵۸۴ھ ان کی کتاب کا نام الاعتبار فی ناسخ الحدیث ومنسوخہ" ہے، ابوحفص عمر بن شاہین ۳۸۵ھ، ان کی کتاب کو ابراہیم بن علی المعروف بہ ابن عبدالحق ۷۴۴ھ نے مختصر کیا ہے عبدالکریم بن ہوازن قشیری ــــــھ وغیرہ وغیرہ۔

علم تلفیق حدیث

تلفیقِ حدیث وہ علم ہے جس میں بظاہر متناقض احادیث میں تطبیق و توفیق دی جاتی ہے کبھی حدیثِ عام کو خاص کر کے کبھی مطلق کو مقید کر کے یا پھر بظاہر متناقض حدیثوں کو متعدد واقعات پر محمول کر کے تطبیق دی جاتی ہے الغرض احادیث کے تناقض کو تطبیق کے ذریعہ ختم کرنے کو تلفیق حدیث کہتے ہیں

اس فن کے مشہور علماء و مصنفین یہ ہیں، امام شافعی ۲۰۴ھ امام صاحب نے ایسی تمام حدیثوں کا استقصاء و استیعاب نہیں کیا ہے، عبداللہ بن مسلم المعروف بہ ابن قتیبہ ۲۶۳ھ، ابو یحیٰ زکریا بن یحیٰ ساجی ۳۰۷ھ، امام طحاوی ۳۲۱ھ، امام ابن جوزی ۵۹۷ھ ان کی کتاب کا نام "التحقیق فی احادیث الخلاف" ہے، اور ابراہیم بن علی بن عبدالحق ۷۴۴ھ نے اس کا اختصار کیا ہے۔

علم عِلَل حدیث

علوم حدیث میں احادیث کے علل کی معرفت نہایت اجل و ادق اور محترم فن ہے، جن کو اللہ تعالٰی نے احادیث اسانید و متون میں فہم ثاقب اور ذہنِ رسا کا ملکہ راسخہ عطا فرمایا ہے وہی اس فن

سے حصہ پاتے ہیں، اسی اس میں بہت کم باخبر ہوتے ہیں، علل حدیث ان خفیہ وغامض اسباب کو کہتے ہیں جن کی وجہ سے حدیث کی صحت میں خلل پیدا ہوجاتا ہے، جیسے منقطع حدیث کا وصل، یا موقوف حدیث کا رفع، یا ایک حدیث کو دوسری حدیث میں داخل کر دینا وغیرہ وغیرہ اس فن کے مشاہیر یہ حضرات ہیں، ابن مدینی ۲۳۴ھ، ابن ابی حاتم رازی ۳۲۷ھ ان کی کتاب دو جلدوں میں چھپ چکی ہے، خلال ۳۱۱ھ، امام مسلم ۲۶۱ھ، علی بن عمر دارقطنی ۳۸۵ھ، محمد بن عبداللہ حاکم ۴۰۵ھ ابوعلی حسن بن محمد زجاجی سنہ اور ابن جوزی وغیرہ،

علم مصطلح حدیث

اغلب یہ ہے کہ علوم حدیث یا مصطلحات حدیث میں سب سے پہلے قاضی ابو محمد رامہرمزی ۳۶۰ھ نے "المحدث الفاصل بین الراوی والسامع" لکھی، گو ان سے پہلے مصطلحات حدیث میں بعض کتابیں لکھی گئیں مگر وہ بعض مباحث ومصطلحات پر شامل تھیں، رامہرمزی کی یہ کتاب اگرچہ پورے مصطلحات کا استیعاب نہ کرسکی، مگر ان کے زمانہ تک جتنا کچھ لکھا جا چکا تھا ان کی جامع ہے، اس کے بعد علماء نے اس فن میں کثرت سے کتابیں لکھیں، ان میں سب سے پہلے محمد بن عبداللہ حاکم نیساپوری سنہ نے ایک مفصل کتاب معرفۃ علوم الحدیث لکھی جو پچاس انواع پر مشتمل ہے، مگر ترتیب وتہذیب کے لحاظ سے قابل اصلاح تھی یہ کتاب حیدرآباد میں اور اس کی نقل بیروت میں چھپ چکی ہے اس کے بعد ابونعیم اصفہانی سنہ نے حاکم کی کتاب پر ایک کتاب بطور استخراج کے لکھی، مگر انہوں نے بھی کچھ باتیں چھوڑ دیں، اور خطیب بغدادی ۴۶۳ھ نے روایت کے آداب وقوانین پر ایک کتاب الکفایۃ فی ادب الروایہ لکھی جو حیدرآباد میں چھپ گئی ہے نیز "الجامع لآداب الشیخ والسامع" کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس کے علاوہ حدیث کے ہر ہر فن میں کتابیں لکھیں، اسی لیے ابن نقطہ کا قول ہے کہ ہر منصف مزاج آدمی یہی فیصلہ کرے گا خطیب کے بعد محدثین ان کے عیال ہیں، خطیب کے بعد بہت سے علماء نے حدیث کے فنون پر کتابیں لکھیں، چنانچہ قاضی عیاض ۵۴۴ھ نے الالماع

کے نام سے چھوٹی سی کتاب لکھی، ابوحفص میانجی ۵۸۱ھ نے "ما لا یسع المحدث جہلہ" کے نام سے کتاب لکھی
پھر حافظ ابو عمرو عثمان بن عبدالرحمن المعروف بہ ابن صلاح ۶۴۳ھ نے اپنی مشہور کتاب لکھی
جو مقدمہ ابن صلاح کے نام سے مشہور ہے، اور ہندوستان اور مصر میں بار بار چھپ چکی ہے
اس کتاب میں ابن صلاح نے ۶۵ انواع میں اس فن کو بیان کیا ہے، اور علماء نے اس پر خاص
توجہ کی، کسی نے معارضہ کیا کسی نے ہمنوائی کی، کسی نے مختصر کیا اور کسی نے شرح کی اور کسی نے اس پر
استدراک لکھا، محی الدین یحیی بن شرف نووی ۶۷۶ھ نے الارشاد کے نام سے اس کا اختصار
کیا، پھر اس اختصار کا اختصار "التقریب والتیسیر" کے نام سے کیا، اور علامہ سیوطی ۹۱۱ھ نے نووی
کی تقریب کی شرح "تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی" کے نام سے کی، یہ اس کی بہت ہی
بڑی شرح ہے، حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین عراقی ۸۰۵ھ نے الفیۃ لکھ کر مقدمہ ابن
صلاح کی تلخیص کے ساتھ اضافہ بھی کیا، الفیۃ کا پہلا شعر یہ ہے۔

یقول راجی ربہ المقتدر ‌ ‌ ‌ عبدالرحیم بن الحسین الاثری

۷۶۸ھ میں مکمل کر کے خود ہی اس کی شرح فتح المغیث کے نام سے کی جو ۷۷۱ھ میں مکمل ہوئی فتح المغیث
ہندوستان وغیرہ میں چھپ چکی ہے، برہان الدین ابراہیم بن عمر بقاعی ۸۵۵ھ نے فتح المغیث
کا حاشیہ لکھا جس کا نام "النکت الوفیۃ بما فی شرح الالفیۃ" رکھا، بقاعی نے اس میں اپنے شیخ
حافظ ابن حجر کے بیان کردہ فوائد درج کئے یہ حاشیہ اصل ‌ ‌ کتاب کا تقریباً نصف تھا، الفیۃ العراقی
کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں، جن میں بہترین شرح محمد بن عبدالرحمن سخاوی ۹۰۲ھ کی ہے، امام
سیوطی نے بھی اس فن میں ایک منظوم الفیۃ لکھی ہے جس میں بہت سے فوائد درج کئے، حافظ ابن حجر
۸۵۲ھ کی کتاب "نخبۃ الفکر فی مصطلح اہل الاثر" مختصر اور جامع بہترین متن ہے، پھر حافظ ابن
حجر ہی نے اس کی شرح نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر کے نام سے لکھی جو عام طور سے پڑھی پڑھائی
جاتی ہے، دوسرے کئی علماء نے بھی نخبۃ الفکر کی شرحیں لکھی ہیں، اور احمد بن صدقہ ۹۰۵ھ اور
محمد بن اسحق مقدسی حوالی ۹۰۰ھ نے اس کو نظم کیا ہے، بعد میں بہت سے علماء نے علوم حدیث

بیں کتابیں لکھی ہیں جیسے محمد بن منغلوطی ۷۶۲ھ، ابن الملقن ۸۰۴ھ اور ابن الحریری ۸۴۳ھ نے
شیخ ابوالفیض محمد بن محمد بن علی فاسی مکی ۱۳۶۵ھ نے اس فن میں ایک نہایت ہی مفید، مختصر اور
جامع کتاب "جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول" لکھی ہے جس میں تدریب الراوی اور مقدمہ
ابن صلاح کے علاوہ اس فن کی دوسری کتابوں کے محتویات آ گئے ہیں اور اضافے بھی ہیں، اس
کے قلمی نسخے موجود ہیں اور راقم نے اس کی تعلیق و تصحیح کی ہے، تاہنوز غیر مطبوع ہے، آخر میں علامہ
شیخ طاہر جزائری کی کتاب "توجیہ النظر فی اصول الاثر" اس باب میں نہایت بہتر اور جامع کتاب ہے

تخریج احادیث

علمائے امت نے علوم حدیث میں ہر قسم کی آسانیاں فراہم کر دی ہیں اور کوئی گوشہ اس فن کا خالی نہیں چھوڑا، تفسیر و فقہ اور دوسرے دینی امور و معاملات میں جو کتابیں دائر و سائر ہیں، ان میں بکثرت ایسی احادیث وارد ہوئی ہیں جن کی سند نہیں بیان کی گئی ہے اور نہ اصل کتاب اور ماخذ کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان کو دیکھ کر معلوم نہیں ہوتا کہ صحت و سقم کے اعتبار سے ان احادیث کا کیا درجہ ہے، اور ان سے استدلال صحیح ہے یا نہیں، اگر ایسی احادیث کی تخریج پڑھنے والوں پر چھوڑ دی جائے تو بڑی مشکل پیش آ جائے گی، اس لیے علماء نے اس قسم کی کتابوں کو سامنے رکھ کر ان کی احادیث کو کتاب میں جمع کیا، ہر حدیث کے راوی کا ذکر کیا، ان کے درجات قائم کیے، اور اصل کتاب کا حوالہ دیا، تاکہ ہر پڑھنے والا آسانی سے ہر حدیث کے بارے میں صحیح فیصلہ کر سکے، احادیث کی تخریج میں امت میں کثرت سے کتابیں لکھی گئیں، ہم مثال کے طور پر چند کتب تخریج کو بیان کرتے ہیں۔ تاکہ علوم حدیث کے اس شعبہ کے بارے فی الجملہ معلومات ہو جائیں۔

تخریج احادیث الکشاف جمال الدین محمد بن عبداللہ حنفی ۷۶۲ھ، یہ علامہ جاراللہ زمخشری کی مشہور تفسیر الکشاف کی احادیث کی تخریج ہے اور ایک جلد میں ہے "الفتح السماوی بتخریج احادیث البیضاوی" شیخ عبدالرؤف مناوی بعد ۹۰۰ھ، یہ تفسیر بیضاوی کی احادیث کی تخریج ہے۔

الطرق والوسائل الی معرفۃ خلاصۃ الدلائل" احمد بن عثمان ترکمانی ۷۴۴ھ، یہ فقہ حنفی کے مشہور متن مختصر القدوری کی تخریج اور شرح ہے "تخریج احادیث الہدایۃ محمد بن عبداللہ ۷۵۵ھ"۔ اور نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ عبداللہ بن یوسف زیلعی ۷۶۲ھ، یہ دونوں کتابیں فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کی احادیث کی تخریج میں ہیں، نصب الرایہ پہلے دو جلدوں میں ہندوستان میں چھپی تھی، پھر مجلس علمی کے زیر اہتمام چار جلدوں میں مصر میں طبع ہوئی، الدرایہ پہلے دو جلدوں میں ہندوستان میں چھپی تھی، پھر مجلس علمی کے زیر اہتمام چار جلدوں میں مصر میں طبع ہوئی، الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ حافظ ابن حجر ہندوستان میں ہدایہ کے حاشیہ پہ چھپی ہے، اور جن احادیث کی تخریج میں حافظ ابن حجر کامیاب نہ ہوسکے، قاسم قسطلوبغا حنفی رومی نے ان کی تخریج ایک رسالہ...... میں کی، یہ مصر میں چھپ گیا ہے" "خلاصۃ البدر المنیر فی تخریج احادیث الشرح الکبیر الوجیز" سراج الدین عمر بن علی ابن الملقن، اس میں فقہ شافعی کی مشہور کتاب الوجیز کی شرح کی احادیث کی تخریج سات جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر نے اس کی تلخیص مع اضافہ کے کی ہے، اور مقدمہ میں لکھا ہے کہ مجھے امید ہے کہ فقہار کی استدلالی احادیث کی تخریج میں یہ کتاب سب سے بڑی ہوگی پہلے ہندوستان میں پھر مصر میں چھپ گئی، تخریج احادیث المنہاج، ابن الملقن، المنہاج فقہ شافعی کی مشہور کتاب ہے اس میں اس کی احادیث کی تخریج ہے، "المغنی عن الاسفار فی تخریج ما فی الاحیار من الاخبار" عبدالرحیم بن حسین عراقی ۸۰۶ھ، یہ امام غزالی کی کتاب احیار العلوم کی احادیث و آثار کی تخریج ہے، احیار العلوم میں ضعیف اور بے اصل آثار و اخبار بکثرت ہیں، اس لیے یہ کتاب بہت مفید ہے، مصر میں احیار العلوم کے حاشیہ پر چھپی ہے، "اوراک الحقیقۃ فی تخریج احادیث الطریقۃ" علی بن حسن بن صدقہ مصری یمانی، اس کی تالیف سے مصنف ۱۰۵۰ھ میں فارغ ہوئے،

(۴)

اسلامی تعلیم کا مکی مرکز دارِ ارقم

حرم مکی شریف کی جدید تعمیر و توسیع کی پوری تفصیلات سعودی حکومت کے ترجمان جریدہ البلاد السعودیہ مکہ مکرمہ میں آچکی ہیں، اس کی یہ خبر بہت ہی اطمینان بخش اور خوشگوار ہے کہ کوہِ صفا کے پاس جو میدان بنایا جائے گا اس کے درمیان دارارقم کو خاص طور سے نمایاں کرکے ان تمام دینی اور تاریخی عظمتوں کو اجاگر کیا جائے گا، جو ابتدائے اسلام سے لے کر آج تک اسے حاصل رہی ہیں، اور اسے ثقافتِ اسلامیہ کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے استعمال کیا جائے گا، اس طرح اسلامی مرکز کے بارے میں تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی، اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دارارقم کی تاریخی اور دینی عظمت کا جائزہ لیا جائے، اور دکھایا جائے کہ اس مقام کو، اسلام اور اسلامی علوم و معارف سے کیا تعلق رہا ہے، اور اسی تعلق کی بنا پر اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اسے کیسی اہمیت دی گئی ہے،[۱]

حضرت ارقمؓ اور دارارقم

مکی زندگی کی لامرکزیت اور پریشانی کے دور میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ہر وقت اس خیال میں رہا کرتے تھے کہ کوئی مرکزی جگہ مل جائے جہاں اطمینان سے دین و ایمان کی باتیں کی جاسکیں اور قرآن کو پڑھا پڑھایا جائے، بالآخر اللہ تعالےٰ نے مکہ مکرمہ میں اسلامی مرکز بننے کا شرف اسی پہاڑی کو عطا فرمایا جس کے اوپر پیغمبر اسلام نے اسلام کا پہلا پیغام دنیا کو سنایا تھا، آگے چل کر اسی پہاڑ کا دامن اس صدا پر لبیک کہنے والوں کے لیے پناہ گاہ ثابت ہوا، اور اسی کے دامن نے مسلمانوں کو ایک خاص وقت تک

[۱] بعد میں یہ سب کچھ نہیں ہوا بلکہ اسے مدرسۃ القرآن بنادیا تھا اور آج وہ ایک مدرسہ کی شکل میں ایک گلی میں موجود ہے، ہم نے اس کی زیارت کی سعادت پائی ہے۔

لیے پناہ دی اور وہی قرآن کی تعلیم کے لیے اسلام کا پہلا باقاعدہ مدرسہ بنا، کوہِ صفا پر ایک جانب دارِ ارقم تھا، جہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے جاں نثاروں کو لے کر کفارِ مکہ کے ظلم سے پناہ پائی، اور قرآن کی تعلیم کا انتظام کیا اور اسی میں رہ کر اسلام کی دعوتِ عام کی، حضرتِ ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہ سابقینِ اولون مسلمانوں میں سے تھے، ایک روایت کے مطابق دس صحابہ کے بعد آپ اسلام لائے، ان کا اصل نام عبدمناف بن اسد بن عبد اللہ بن عمر بن مخزوم ہے، مگر ارقم بن ابی ارقم کے لقب سے مشہور ہیں، کنیت ابوعبد اللہ ہے، والدہ کا نام تماضر بنت حذیم سہمیہ ہے، بعض نے والدہ کا نام امیہ بنت عبدالحارث خزاعیہ بتایا ہے، ابوعبد اللہ حاکم کی تصریح کے مطابق ارقم ساتویں مسلمان ہیں، انھوں نے غزدہ بدر غزدۂ احد اور دوسرے تمام غزوات میں شرکت کی سعادت پائی ہے، چونکہ انھوں نے مکہ مکرمہ کا اپنا مکان اسلامی مرکز بنادیا اس لیے ہجرت کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ منورہ میں ایک مکان جاگیر کے طور پر عطا فرمایا تھا اور وہ بھی دارارقم کے نام سے مشہور تھا، حضرتِ معاویہ رضؓ کے دور میں ۵۵ھ یا ۵۳ھ میں وفات پائی اور ان کی وصیت کے مطابق نمازِ جنازہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ نے پڑھائی، وفات کے وقت عمر ۸۵ سال کی تھی لڑکوں میں عثمان بن ارقم کا نام صراحت کے ساتھ تاریخوں میں ملتا ہے[1] حسبِ روایتِ ابن سعد مکہ میں ان کا مکان کوہ صفا پر تھا اور یہی وہ مکان تھا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابتدائے اسلام میں رہا کرتے تھے، اور اسی میں رہ کر لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے تھے، چنانچہ اس مکان میں بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا،[2] اصابہ میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ارقم کے مکان میں تھے جو کوہ صفا کے پاس تھا، آپ اس میں یہاں تک مقیم رہے کہ مسلمانوں کی عدد چالیس ہوگئی حضرت عمر ان میں سب سے آخر میں اسلام لائے، جب چالیس مسلمان ہوگئے تو اس مکان سے باہر آئے[3] اسی وجہ سے دارارقم اسی زمانہ میں دارالاسلام کے نام سے مشہور ہوگیا تھا اور حضرت ارقم رضؓ نے اس کی

---

[1] الاصابہ جلد ۱ ص ۲۶، [2] طبقات ابن سعد جلد ۳ قسم اول ص ۱۷۳، مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۵۰۲

[3] اصابہ جلد ۱ ص ۲۶،

دینی اہمیت و عظمت کے پیش نظر اسے اپنی اولاد پر وقف کر دیا طبقات ابن سعد اور مستدرک حاکم میں ہے

وصیت دار الارقم دار الاسلام — دار ارقم دار الاسلام کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

دار ارقم کو مکی دور میں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ علمائے رجال و طبقات حضرات صحابہ کے طبقات قائم کرنے کے سلسلے میں اسے بھی ایک طبقہ اور دوسرے طبقہ کے درمیان حد فاصل قرار دیتے ہیں، صحابہ کے حالات میں عام طور سے ابن سعدؒ، ابن عبد البرؒ اور ابن حجرؒ وغیرہ جو یہ تصریح کرتے ہیں کہ اسلم قبل الدار، اسلم بعد الدار، اسلم فی الدار " تو اس سے مراد یہی دار ارقم ہے، امام حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں صحابہ کرام کے طبقات و درجات بیان کرتے ہوئے دار ارقم سے پہلے اسلام لانے والے صحابہ کو طبقۂ اولیٰ میں شمار کیا ہے اور دار ارقم سے نکلنے کے بعد جو حضرات مسلمان ہوئے ان کو طبقۂ ثانیہ میں شمار کیا ہے، مگر انہوں نے دار ارقم کے بجائے اس کا نام دار الندوہ رکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

والطبقۃ الثانیۃ من الصحابۃ اصحاب دار الندوۃ وذلک عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لما اسلم واظہر اسلامہ حمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی دار الندوۃ فبایعہ جماعۃ من اہل مکۃ[1]

صحابہ کا دوسرا طبقہ دار الندوہ (دار ارقم) والوں کا ہے جس وقت حضرت عمرؓ اسلام لائے اور اس کا اظہار و اعلان کیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دار الندوہ میں بلایا گیا جہاں اہل مکہ کی ایک جماعت نے آپ کے دستِ اقدس پر اسلام کی بیعت کی۔

الغرض دار ارقم مکہ کی اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور اسلام کی اشاعت و تبلیغ اور قرآن کی تعلیم میں اسے مرکزیت حاصل ہے۔

۶ نبوت میں دار ارقم میں داخلہ اور دعوتِ اسلام	۵ نبوت میں حبشہ کی طرف ہجرت ہو… جس میں بہت سے صحابہ مرد اور عورتیں

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص

چھوڑ کر حبشہ چلی گئیں اور جو حضرات ... مکہ میں رہ گئے سخت حالات کا مقابلہ کرتے رہے، جب معاملہ بہت ہی خطرناک ہو گیا تو ۶ نبوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے دارِ ارقم میں پناہ گزیں ہو کر وہیں سے دعوتِ اسلام کا فریضہ انجام دینا شروع کیا، اسی غرض سے آپ اس محفوظ مقام میں تشریف لے گئے تھے، طبقات ابن سعد اور مستدرک حاکم میں ہے۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتدائے اسلام میں
یکون فیہا فی اول الاسلام و	دارارقم میں رہا کرتے تھے اور اسی میں لوگوں کو
فیہا یدعو الناس الی الاسلام فاسلم	اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے، چنانچہ اس
فیہا قوم کثیر[۱]	گھر میں بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

ابن عبد البر حضرت ابو حذیفہ رض کے حال میں لکھتے ہیں۔

وکان اسلامہ قبل دخول رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ ﷺ کے دارارقم میں اسلامی دعوت کے
علیہ وسلم دار الارقم للدعاء فیہا	لیے داخل ہونے سے پہلے حضرت ابو حذیفہ
الی الاسلام۔[۲]	اسلام لائے۔

دارارقم کو اسی لیے دار الاسلام بھی کہتے ہیں اور جو حضرات اس وقت اس دعوت پر لبیک کہتے تھے وہ اسی میں مقیم رہتے تھے، عامر بن بکیر لیثی رض، ایاس بن بکیر رض، عاقل بن بکیر رض اور خالد بن بکیر رضی اللہ عنہم کے متعلق ابن عبد البر نے لکھا ہے۔

اسلموا فی دار ارقم۔	یہ چاروں حضرات دارِ ارقم میں مسلمان ہوئے تھے

حضرت ابو بکر رض کی والدہ ماجدہ حضرت ام الخیر ابتدائی دور میں دارِ ارقم ہی میں اسلام لائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رض بھی دارِ ارقم میں اسلام لائے، ان کے اسلام قبول کرنے کے تیسرے دن حضرت عمر رض مسلمان ہوئے[۳] اسی طرح حضرت عمار بن یاسر رض اور

---

[۱] طبقات ابن سعد جلد ۳ قسم اول ص ۱۷۳، و مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۵۰۲، [۲] استیعاب جلد ۲ ص ۶۵۲
[۳] مواہب لدنیہ ج ۱ ص ۲۱۸۔

حضرت صہیب ابن سنان رضؓ اسی گھر میں اسلام لائے، یہ دونوں حضرت تیس آدمیوں کے بعد مسلمان ہوئے، ابن سعد نے حضرت عمار کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے صہیب بن سنان رضؓ کو دارِ ارقم کے دروازے پر پایا، اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اندر تشریف فرما تھے، میں نے ان سے پوچھا کیا ارادہ ہے، صہیب نے کہا آپ کا کیا ارادہ ہے؟ میں نے کہا میرا ارادہ ہے کہ محمد صلعم کے پاس جاؤں اور ان کا کلام سنوں، صہیب رضؓ نے کہا میں بھی اسی ارادہ سے آیا ہوں، چنانچہ ہم دونوں ساتھ ہی خدمت نبوی میں حاضر ہوئے آپ نے ہمیں دعوت اسلام دی، جس پر ہم دونوں نے لبیک کہا اور پورا دن دارِ ارقم میں گزارا۔ جب شام ہوئی تو چھپتے چھپاتے وہاں سے نکلے [1] حضرت خباب بن ارت رضؓ بھی دارِ ارقم ہی میں مسلمان ہوئے، اس وقت تک صرف سات اشخاص اسلام لا چکے تھے حضرت خبابؓ نے یہاں رہ کر دوسرے صحابہ کی بہ نسبت قرآن کی تعلیم زیادہ حاصل کرلی تھی اس لیے وہ اندر باہر حسب موقع قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے، چنانچہ وہ ان ہی ایام میں حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت خطاب اور بہنوئی سعید بن زید کو ان کے گھر پر جاکر تعلیم دیا کرتے تھے یہ دونوں بھی دارارقم میں قیام کے دوران اسلام لائے تھے، اور اپنے مکان میں خفیہ طور سے قرآن پڑھتے تھے، حضرت نعیم بن عبد اللہ بن نحام رضؓ بھی اسی زمانہ میں مسلمان ہوئے، آپ نے حضرت عمر رضؓ کو ان کے مسلمان ہونے سے پہلے خبر دی تھی کہ آپ کی بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں، اسی طرح اور کئی حضرات دارِ ارقم کے زمانۂ قیام میں مسلمان ہوئے سب سے آخر میں حضرت عمر رضؓ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے، اور اسی کے بعد مسلمان یہاں سے نکلے، اصابہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا کے پاس دارارقم میں مقیم رہے یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد چالیس ہوگئی، ان میں سب سے آخر میں حضرت عمر اسلام لائے، اور جب چالیس کی تعداد پوری ہوگئی تو یہاں سے باہر نکلے [2] حضرات وقتاً فوقتاً باہر آتے جاتے تھے بلکہ کعبہ اور مسجد حرام میں بھی ان کی آمد و رفت

[1] طبقات ابن سعد [2] اصابہ جلد ۱ ص ۲۶

کرتی تھی، البتہ ان کا مرکز دارِ ارقم تھا اور مستقل قیام اسی میں تھا،

کفارِ قریش کی فتنہ پروری

اس زمانہ کا ایک واقعہ ابن سعد نے بیان کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفارِ قریش اس دور میں بھی مسلمانوں اور اسلام کے درپے رہا کرتے تھے اور دارِ ارقم کی مرکزیت اور حبشہ میں مسلمانوں کے اطمینان سے ان کو بڑی بے چینی تھی، جب اہلِ قریش نے دیکھا کہ مسلمان روز بروز زیادہ ہوتے جارہے ہیں، اور کعبہ کے آس پاس آکر بیٹھنے بھی لگے ہیں تو ان کی حیرت اور پریشانی بہت زیادہ بڑھ گئی، اور انہوں نے ابوطالب کے پاس وفد کی صورت میں جاکر کہا کہ آپ ہمارے سردار اور ہم سب سے افضل ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ناسمجھ لوگ آپ کے بھتیجے کی ہاں میں ہاں ملاکر ہمارے معبودوں کو چھوڑتے جارہے ہیں، اور ان کی پرستش پر ہمیں طعنہ دیتے ہیں اور بے وقوف بناتے ہیں، اہلِ قریش اپنے ساتھ ایک قریشی نوجوان عمارہ بن ولید بن مغیرہ کو لائے تھے، کہنے لگے کہ ہم آپ کے پاس ایسے قریشی نوجوان کو لائے ہیں جو حسن و جمال، حسب و نسب اور نجابت و شرافت کے ساتھ شاعری میں بھی بہت آگے ہے یہ محمدؐ کے بدلے میں آپ کا مددگار اور وارث ہوگا ہم اسے آپ کی خدمت میں نذر کے طور پر پیش کرتے ہیں اس کے بدلے میں اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالے کردیں تاکہ ہم اس کا قصہ تمام کردیں، یہ صورت ہمارے پورے معاشرے اور قبیلہ کے لیے مناسب اور انجامِ کار کے لحاظ سے بہتر ہے ابوطالب نے جواب دیا کہ واللہ تم لوگوں نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم اپنے بچے کو میرے حوالے کرتے ہو تاکہ میں اسے کھلاؤں پلاؤں اور میں تمہیں اپنے بھتیجے کو دے دوں تاکہ تم اسے قتل کرڈالو، یہ انصاف نہیں ہے بلکہ تم لوگ میرے ساتھ ذلیل قسم کے لوگوں کی طرح معاملہ کرتے ہو، قریش نے کہا کہ اچھا آپ اپنے بھتیجے کو بلائیں ہم اس سے انصاف کی بات کریں گے، ابوطالب نے ان کے کہنے پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور کہا دیکھو یہ تمہارے چچا اور تمہاری قوم کے اشراف ہیں، یہ لوگ تم سے انصاف کی بات کرنی چاہتے ہیں، آپ نے قریش کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہو میں سن رہا ہوں، انہوں نے کہا کہ تم ہمارے معبودوں کو چھوڑ دو ہم

تمہارے معبود کو چھوڑ دیتے ہیں، یہ سن کر ابوطالب نے آپ سے کہا کہ قوم نے تم سے انصاف کا معاملہ کیا ہے تم اسے منظور کر لو، اس پر آپ نے اہل قریش کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اچھا اگر میں تمہاری بات مان لوں تو کیا تم لوگ میری ایک بات مان لوگے ؟ اگر تم اسے مان لوگے تو پورے عرب و عجم کے مالک ہو جاؤ گے، ابوجہل نے کہا بات تو بہت اچھی ہے ہم یہ اس جیسی دسیوں بات منظور کر لیں گے، آپ نے ان سے لا الٰہ الا اللہ کے مان لینے کا مطالبہ کیا، اس کلمہ کا سننا تھا کہ سب کے سب تلملا اٹھے اور غصہ میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ اپنے معبودوں کے معاملہ میں صبر کرو، بعض راویوں نے کہا کہ یہ گفتگو عقبہ بن ابومعیط سے ہوئی تھی، بہرحال سب نے کہا کہ اب محمدؐ کے پاس ہم لوگ نہیں آئیں گے، اور اس سے بہتر کوئی شکل نہیں ہے کہ ان کو کسی بہانہ سے قتل کر دیا جائے، دن میں اہل قریش سے یہ بات چیت ہوئی اور انہوں نے قتل کی دھمکی دی، اور شام کو رسول صلے اللہ علیہ وسلم گھر نہ آئے، ابوطالب کو جب اس کی خبر لگی تو وہ اور آپ کے دوسرے چچا آپ کے گھر آئے، نہیں ملے تو ابوطالب نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کے نوجوانوں کو جمع کرکے ان سے کہا کہ تم میں سے ہر ایک ننگی تلوار لے کر میرے پیچھے پیچھے آئے، جب میں مسجد حرام میں داخل ہو جاؤں تو تم میں سے ہر ایک نوجوان ادھر ادھر دیکھے پھر اس بڑے مجمع کے قریب جاکر بیٹھ جائے جس میں ابن حنظلیہ یعنی ابوجہل ہو، اس لیے کہ اگر محمدؐ کو قتل کر دیا گیا ہے تو وہ اس میں شریک رہا ہوگا ہاشمی اور مطلبی نوجوان تلواریں لے کر ابوطالب کے پیچھے نکلے اتنے میں زید بن حارثہ رضؓ نظر پڑے، ابوطالب نے فوراً ان سے کہا کہ اے زید! انہیں میرے بھتیجے کی کچھ خبر ہے، زید نے کہا کہ ہاں میں ابھی ابھی ان کے ساتھ تھا، ابوطالب نے کہا کہ جب تک میں اپنے بھتیجے کو دیکھ نہیں لوں گا گھر واپس نہیں جاؤں گا،

فخرج زید یسعیٰ حتیٰ اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو فی بیت عند الصفا ومعہ اصحابہ یتحدثون۔	یہ سن کر زید جلدی سے رسول اللہ ؐ کے پاس آئے، اس وقت آپ صفا کے پاس ایک مکان میں تشریف فرما تھے اور آپ کے ساتھ آپ کے صحابہ آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

زید نے آپ سے تمام ماجرا بیان کیا، آپ اپنے چچا کے پاس آئے، چچا نے خیریت پوچھی آپ نے جواب دیا، اس کے بعد ابوطالب نے کہا تم اپنے گھر چلو آپ نے چچا کے حکم کی تعمیل کی، صبح کو ابوطالب آپ کے پاس گئے، اور آپ کو ہاشمی اور مطلبی نوجوانوں کے ساتھ کھڑا کرکے باآواز بلند کہا اے اہلِ قریش! تم کو معلوم ہے کہ میں نے کیا ارادہ کیا تھا، پھر انہوں نے سارا منصوبہ بیان کرکے قریشی نوجوانوں سے ننگی تلواروں کا مظاہرہ کرایا، اور کہا کہ واللہ اگر تم لوگ محمدؐ کو قتل کر دیئے ہوتے تو میں نے تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑا ہوتا اور بات یہاں تک بڑھ جاتی کہ ہم تم فنا کے گھاٹ اتر جاتے، اس کے بعد اہلِ قریش ٹھنڈے پڑ گئے اور سب سے زیادہ خفت ابوجہل کو اٹھانی پڑی۔[1]

بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی واقعہ کے بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر مستقل طور سے دارِ ارقم میں قیام پذیر ہو گئے اور جب حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے مسلمان ہو جانے سے کفارِ قریش کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا تو آپ صحابہ کو لے کر باہر نکل آئے، اور آزادی سے کعبہ کے پاس مجلس ذکر و مذاکرہ قائم کرنے لگے، دارِ ارقم میں قیام کی مدت سیرت حلبیہ کے بیان کے مطابق ایک ماہ ہے اقام فیھا شھراً یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہاں ایک ماہ تک قیام فرمایا۔[2]

مدرسہ دارِ ارقم اس مدت میں یہ مقام دار الاسلام اور مدرسۃ الاسلام بنا رہا یہاں سے اسلام کی دعوت دی جاتی تھی اور اسلام لانے والوں کو قرآن سکھایا جاتا تھا۔ مدرسہ دارِ ارقم کے بارے میں حضرت عمرؓ کا بیان صاحب سیرت حلبیہ نے ان کی زبانی نقل کیا ہے۔

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يجمع الرجل والرجلين اذا أسلما عند الرجل به قوة فيكونان معه يصيبان من طعامه ثم ضم الى زوج اختى رجلين ممن اسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو دو ایک ایک مسلمانوں کو کسی ایسے مسلمان کے ساتھ کر دیتے جو کھانے کی طاقت رکھتا تھا، یہ دونوں ان کے یہاں رہ کر کھانا کھاتے تھے، چنانچہ آپ نے دو مسلمانوں

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ا قسم اول ص ۱۳۴ و ص ۱۳۵، [2] السیرۃ الحلبیۃ جلد ا ص ۳۰۱

احدھما خباب بن الارتؒ والاٰخر لم اقف علی اسمہ[1] | کو میرے بہنوئی کے ساتھ رکھا تھا۔ ایک خباب بن ارت تھے، اور دوسرے کا نام مجھے معلوم نہیں

ان دونوں حضرات میں سے حضرت خبابؓ فاطمہ اور سعیدؓ میاں بیوی کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے، ابن ہشام کا بیان ہے۔

وکان خباب بن الارت یختلف الی فاطمۃ بنت الخطاب یقرءھا القرآن۔ | خباب بن ارت فاطمہ بن خطاب کے گھر آتے جاتے تھے اور ان کو قرآن پڑھاتے تھے۔

فاطمہؓ کے شوہر سعید بن زیدؓ بھی خباب بن ارتؓ سے قرآن پڑھتے تھے، حضرت عمرؓ اسلام لانے سے پہلے جس وقت اپنی بہن اور بہنوئی کے گھر پہونچے وہاں یہ منظر تھا۔

وعندھما خباب بن الارت معہ صحیفۃ فیھا طٰہٰ یقرءھما ایاھا[2] | ان دونوں کے پاس خباب بن ارت موجود تھے اور خباب کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی وہ ان سے دونوں کو پڑھا رہے تھے۔

مورخ مکہ امام ارزقی متوفی ۲۲۳ھ لکھتے ہیں۔

یجتمع ھو واصحابہ فیہ عند الارقم بن ابی الارقم ویقرءھم القرآن ویعلمھم فیہ[3] | رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اسی مکان میں ارقم بن ابی ارقم کے یہاں جمع ہوتے تھے اور آپ صحابہ کو قرآن پڑھاتے تھے اور دین کی تعلیم دیتے تھے۔

ان تمام تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ دار ارقم میں ایک مدت تک تعلیم و تبلیغ کا کام ہوتا رہا، اور جو لوگ اس میں رہتے تھے ان کے کھانے پینے کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا بلکہ مدرسہ دار ارقم کے طلبہ جاگیر کے طور پر باہر کے مسلمانوں کے یہاں کھانا کھاتے تھے، اور یہ انتظام خود رسول اللہ صلعم نے فرمایا

[1] السیرۃ الحلبیہ ج ۱ ص ۳۰، [2] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۱۱، [3] اخبار مکہ ج ۲ ص ۲۱۰،

...ان تمام حضرات کی تعداد حضرت عمرؓ کے مسلمان ہو جانے کے بعد چالیس تھی، اور اسی کے بعد مسلمان
...ی مقام سے باہر نکلے۔

...رت عمرؓ کا قبول اسلام، اور دار ارقم سے نکلنا

جیسا کہ معلوم ہوا دار ارقم میں متعدد صحابہ نے اسلام قبول کیا، مگر حضرت عمرؓ کا مسلمان ہونا
...لام کی تاریخ اور خود دار ارقم کی تاریخ کے لیے نیا باب ثابت ہوا، اور اسی کے بعد مسلمان وہاں
...باہر آئے اور علانیہ چلتے پھرتے اسلام کی باتیں کرنے لگے، حضرت عمرؓ اپنی بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید
...ھر سے واپس ہوئے اور ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی تلاش میں
...لوگوں نے بتایا کہ وہ لوگ صفا کے قریب ایک مکان میں جمع ہیں، ان کی تعداد مردوں اور عورتوں ملا
...کر چالیس کے قریب ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ لوگ ہیں، جنہوں نے حبشہ
...ف ہجرت نہیں کی اور مکہ میں رہنا پسند کیا مثلاً حمزہ بن عبد المطلب، ابوبکر، علی بن ابی طالب وغیرہ،
...کر حضرت عمر دار ارقم کے پاس آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، صحابہ نے سوراخ سے دیکھ کر رسول اللہ
...اللہ علیہ وسلم کو خبر دی، آپ دروازہ کے قریب آگئے، جب حضرت عمر سامنے آئے تو آپ نے
...یا ابن خطاب! کس ارادہ سے آئے ہو؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ اور اس کے
...ی پر ایمان لانے کے لیے آیا ہوں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا جس سے اندر
...وں کو معلوم ہو گیا کہ عمر مسلمان ہو گئے،[1] علامہ ابن سعد نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
...ار ارقم میں دو شنبہ کی رات میں دعا کی تھی کہ اے اللہ! عمر بن خطاب اور عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں
...تیرے نزدیک محبوب ہے اس سے اسلام کو عزت دے، اسی رات کی صبح کو حضرت عمر آئے اور
...رقم میں مسلمان ہوئے، اس کے بعد صحابہ نے باہر نکل کر نعرۂ تکبیر بلند کیا، اور علی الاعلان کعبہ کا
...کیا۔[2] الغرض دار ارقم مکی دور میں اسلام اور مسلمانوں کا قید خانہ بھی تھا اور مدرسہ بھی جہاں وہ
...چھپا کر دعوتِ اسلام اور تعلیم قرآن میں مشغول رہے، اور اس کا دوسرا نام دار الاسلام پڑ گیا۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۱۱ و ص ۲۱۲ ملخص، [2] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۷۳ قسم اول،

اس کے بعد تاریخ کے ہر دور میں اسے خاص اہمیت حاصل رہی اور مسلمانوں نے اسے مکہ مکرمہ
اہم مشاہد مبارکہ میں شمار کیا۔

دارارقم مختلف ادوار میں جب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت عامہ ہوئی تو حضرت ارقمؓ بھی اپنا
بار چھوڑ کر ہجرت کر گئے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے
کو بھی مدینہ منورہ میں ایک مکان جاگیر میں دیا جو وہاں بھی دارارقم کے نام سے مشہور ہوا پھر
مکہ کے بعد حضرت ارقم کو مکہ والا مکان بھی مل گیا، آپ نے اس کی عظمت واہمیت کے پیش نظر فرو
نہیں کیا بلکہ اپنی اولاد پر وقف کر دیا، حضرت ارقم کا وصال ۵۳ھ یا ۵۵ھ میں ہوا، ظاہر ہے
انہوں نے اپنے مکان کو اپنی اولاد پر وقف اس سے پہلے کیا ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ پچاس
سال تک یہ مکان ان کی ملکیت میں رہا اور اس کے بعد وقف علی الاولاد ہو گیا، ان کے صاحبزا
حضرت عثمان بن ارقمؓ وغیرہ کی زندگی تک ان کے قبضہ میں رہا، اور اسی سال سے زائد تک و
اس میں رہے، مگر خلیفہ ابوجعفر منصور عباسی متوفی ۱۵۸ھ نے دوسری صدی کے وسط میں ا
موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے خرید لیا، جب اس کے لڑکے خلیفہ مہدی متوفی ۱۶۹ھ کا زمانہ آیا
نے اپنی چہیتی باندی خیزران کی ملکیت میں دے دیا اور خیزران نے اس کی جدید تعمیر کرائی، پھر
کے لڑکے خلیفہ موسیٰ الہادی متوفی ۱۷۰ھ کے لڑکے جعفر کے قبضہ میں آیا اور دوسری صدی
آخر میں اس میں کپڑوں کے تاجر رہنے لگے۔

اس سلسلے میں طبقات ابن سعد اور مستدرک حاکم کی ایک روایت کافی معلومات پیش کر
دونوں کی روایت میں بہت معمولی فرق ہے، ہم دونوں روایتوں کو سامنے رکھ کر خلاصہ درج کر
عثمان بن ارقم کا بیان ہے کہ ساتویں مسلمان کا بیٹا ہوں، میرے والد کا مکان مکہ میں صفا
تھا یہ وہی مکان ہے جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا اور یہیں رہ کر لوگوں
اسلام دی، ایک مرتبہ دوشنبہ کی رات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ ا
عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے جو تجھے پسند ہو اس سے اسلام کو عزت

صبح کو سویرے ہی عمر بن خطاب دار ارقم میں مسلمان ہو گئے، صحابہ نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور باہر آکر کعبہ کا طواف کیا۔

دار ارقم وقف علی الاولاد اور عباسی خلفاء کی ملکیت

بعد میں یہ مکان دار الاسلام کے لقب سے مشہور ہوا، اور حضرت ارقم نے اسے اپنے لڑکوں پر صدقۃً وقف کر دیا، اس کے وقف نامہ کی عبارت یہ ہے:۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	بسم اللہ الرحمن الرحیم
ھٰذا ما قاضی الارقم فی ربعہ ما حاز الصفا انہا صدقۃ بمکانہا من الحرم، لاتباع ولا تورث، شہد ھشام ابن العاص وفلان مولی ھشام بن العاص۔	ارقم نے اپنے مکان واقع بالمقابل صفا کے بارے میں اس کے حرم کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ صدقہ (وقف) ہے، وہ نہ فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ وراثت میں لیا جا سکتا ہے گواہ ہشام بن عاص اور فلاں مولی ہشام بن عاص۔

اس وقف نامہ کے بموجب حضرت ارقم کی اولاد اس مکان میں رہتی سہتی تھی، اور دوسروں کو کرایہ پر دیتی تھی، مگر خلیفہ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں دار ارقم حضرت ارقم کے ہاتھ سے نکل گیا، حضرت ارقم کے پوتے عبداللہ بن عثمان بن ارقم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ابو جعفر منصور حج کو آیا اور صفا مروہ کی سعی کرتے ہوئے ہمارے مکان کے نیچے اتنے قریب سے گزرا کہ اگر میں چاہتا تو اس کی ٹوپی آسانی سے اتار لیتا، منصور مروہ سے واپسی پر صفا پر چڑھتے ہوئے درمیانی وادی سے گزر رہا تھا اور ہماری طرف بار بار دیکھ رہا تھا، مگر اس وقت اس نے کوئی بات نہیں کی اور موقع کا منتظر رہا، اتفاق سے اس کے بعد مدینہ منورہ میں امام محمد نفس زکیہؒ کے والد عبداللہ بن حسنؒ نے ۱۴۵ھ میں ابو جعفر منصور کے خلاف صف آرائی کی، اور عبداللہ بن عثمان ابن ارقم نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی حالانکہ انہوں نے عبداللہ کے ساتھ خروج نہیں کیا تھا، ابو جعفر منصور کو جب عبداللہ بن عثمان کے معاملہ

کی خبر ملی تو اس نے مدینہ کے حاکم کو لکھا کہ عبداللہ کو گرفتار کر لو، اور لوہے کی زنجیروں میں باندھ کر جیل خانے میں ڈال دو، اس کے بعد ابوجعفر منصور نے کوفہ کے ایک آدمی شہاب بن عبدرب نامی کو ایک خط دے کر مدینہ کے گورنر کے پاس بھیجا جس میں درج تھا کہ تم میرے حکم پر عمل کرو، شہاب بن عبدرب مدینہ آیا اور پھر عبداللہ بن عثمان بن ارقم کے پاس جیل خانے میں گیا، اس وقت عبداللہ بالکل بوڑھے ہو چکے تھے، عمر اسّی سال سے زائد تھی، لوہے کی زنجیروں کے برداشت کرنے کے قابل نہ تھے، شہاب نے جاتے ہی ان سے کہا کہ آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو جیل سے رہا کر دوں؟ بشرطیکہ آپ دار ارقم میرے ہاتھ فروخت کر دیں، تو مجھے امید ہے کہ میں ان سے آپ کے بارے میں گفتگو کر کے اس مصیبت سے نجات دلا سکوں گا، عبداللہ بن عثمان نے کہا کہ دار ارقم وقف علی الاولاد ہے، وہ کیسے فروخت کیا جا سکتا ہے، میں اپنا حصّہ ابوجعفر کو دے سکتا ہوں مگر اس میں میرے بھائی وغیرہ بھی شریک ہیں، شہاب نے کہا کہ آپ اپنے حصّہ کے بارے میں بات کیجئے اور اپنا حق ہمیں دے کر بری ہو جائیے، بعد میں ہم دوسروں سے نبٹ لیں گے، چنانچہ عبداللہ نے سترہ ہزار دینار پر اپنا حصّہ فروخت کر کے بیعنامہ لکھ دیا، اس کے بعد ان کے بھائیوں پر دباؤ ڈالے گئے اور زیادہ سے زیادہ رقم دے کر ان کو بھی اپنے اپنے حصّہ فروخت کرنے پر تیار کر لیا گیا، اور سب نے ابوجعفر منصور کے نام اپنا اپنا حصہ لکھ دیا، اس کے بعد سے دار ارقم ابوجعفر منصور کی ملکیت قرار پایا، پھر اس نے جس کو اسے جاگیر میں دیا اس کی ملکیت بن گیا۔

خلیفہ مہدی متوفی ۱۶۹ھ کا زمانہ آیا تو اس نے دار ارقم کو اپنے دونوں شاہزادوں موسیٰ و ہارون کی ماں خیزران کے نام کر دیا، خیزران نے اسے نئے سرے سے بنوایا جس کی وجہ سے وہ اس نام سے مشہور ہوا، اور اب اس کا نام دار ارقم کے بجائے دار الخیزران پڑ گیا اس کے بعد یہ مکان موسیٰ الہادی کے بیٹے جعفر کے قبضہ میں چلا گیا، اور کچھ دنوں کے بعد اس میں شطوی اور عدنی کپڑے کے تاجر رہنے لگے، شطوی مصری کپڑا جو علاقہ شطا میں بنتا تھا اور عدنی کپڑا عدن میں تیار ہوتا تھا، پھر ایک زمانہ وہ بھی آیا کہ جعفر بن موسیٰ الہادی کی اولاد میں سے غسان بن عباد نے پورے مکان

اس کے اکثر حصے کو خرید لیا[1]

اس کے بعد جب خلیفہ ہارون رشید متوفی ۱۹۲ھ کا زمانہ آیا تو اس کی بیوی زبیدہؒ نے مکہ مکرمہ میں رفاہ عام اور حجاج کے آرام کے لیے نہر زبیدہ وغیرہ بنوائی اور اسی زمانہ میں دار ارقم کو اس کے ورثہ سے خرید کر پھر وقف کر دیا[2] اور اب دار ارقم دار زبیدہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہارون رشید کی ماں خیزران اور اس کی بیوی زبیدہ دونوں کے نام اس مکان کے ساتھ مشہور ہوئے چنانچہ مشہور مورخ مکہ امام ازرقی متوفی ۲۲۳ھ نے تیسری صدی کے شروع میں لکھا ہے کہ دار ارقم کو دار الخیزران بھی کہتے ہیں اور آٹھویں صدی کے سیاح ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ مکہ کے جن مکانات کے دروازے مسجد حرام کی طرف ہیں ان میں دار زبیدہ بھی ہے[3]

دار ارقم بعد کے ادوار میں

تیسری صدی میں دار ارقم کے بارے میں امام ازرقی کا مفصل بیان ہے کہ آل ارقم بن ابی ارقم کا مکان صفا کے پاس واقع ہے جسے دار الخیزران کہتے ہیں، اس میں ایک مسجد ہے جس میں نماز پڑھی جاتی ہے، یہ مسجد وہی مکان ہے جس میں رسول اللہؐ اور صحابہ چھپ کر رہا کرتے تھے، آپ ان لوگوں کو قرآن پڑھاتے تھے اور دین کی تعلیم دیتے تھے، اسی گھر میں حضرت عمر بن خطابؓ مسلمان ہوئے[4]

ایک دوسرے مقام پر مسجدوں کے ذکر میں امام ازرقی لکھتے ہیں کہ مسجد دار ارقم بن ابی ارقم صفا کے پاس واقع ہے، جسے دار الخیزران کہا جاتا ہے، یہ مسجد پہلے گھر تھی جس میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم چھپے تھے، اور اسی میں حضرت عمرؓ اسلام لائے تھے[5]

اس بیان سے معلوم ہوا کہ دار ارقم تیسری صدی میں مسجد کی شکل اختیار کر چکا تھا اور مکہ مکرمہ کے مشاہدہ مبارکہ میں شمار ہوتا تھا، اس کے باوجود دار ارقم تربیع آل ارقم، دار الخیزران اور دار زبیدہ

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ قسم اول ص ۱۷۳ و ص ۱۷۴ اور مستدرک حاکم، کتاب معرفۃ الصحابۃ، ذکر ارقم بن ابی ارقم ج ۳ ص ۵۰۳، [2] تاریخ مکہ، احمد سباعی ص ۱۰۱ [3] رحلہ ابن بطوطہ ج ۱ ص ۸۹، [4] اخبار مکہ ج ۲ ص ۲۱۰، [5] اخبار مکہ ج ۲ ص ۱۶۲،

کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا، تاریخوں میں اس کا ایک نام مختبیٰ (چھپنے کی جگہ) بھی آتا ہے۔

دارارقم مکہ کے مشاہد متبرکہ میں

بعد میں اس مقام کی عظمت و اہمیت کے پیش اس کا شمار مشاہد مکہ میں ہونے لگا اور یہاں مسجد تعمیر کردی گئی اور حجاج و زدار کے علاوہ سیاحوں اور مورخوں کے لیے اس مقام میں بڑی جاذبیت پیدا ہوگئی اور وہ اس کا ذکر خاص طور سے کرنے لگے، چنانچہ ابن جبیر اندلسیؒ نے جو چھٹی صدی کے آخر میں مکہ مکرمہ آئے تھے اپنے سفرنامہ میں دارارقم کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے، "مکہ مکرمہ کی متبرک زیارت گاہوں میں سے دار الخیزران بھی ہے، یہ وہی مکان ہے جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس مقدس گروہ کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتے تھے، جو آپ کے صحابہ میں سب سے پہلے ایمان لایا، یہاں تک کہ اللہ تعالٰے نے اسی گھر سے حضرت عمر بن خطابؓ کے ہاتھوں اسلام کو پھیلایا، اس مکان کی فضیلت کے لیے یہی کافی ہے"[۱] آٹھویں صدی کے مشہور سیاح ابن بطوطہؒ نے دارارقم کے بارے میں لکھا ہے کہ مکہ مکرمہ کے مقامات متبرکہ میں وہ مکانات بھی شامل ہیں جن کے دروازے حرم کی طرف کھلتے ہیں، ان ہی سے امیر المومنین ہارون رشید کی بیوی زبیدہ کا مکان دار زبیدہ بھی ہے[۲] مورخ مکہ علامہ قطبیؒ نے لکھا ہے کہ دار الخیزران دارارقم کے علاوہ ایک اور مکان ہے، جو اسی کے قریب واقع ہے، یہ بات یوں صحیح ہے کہ دارارقم جسے مختبیٰ بھی کہتے ہیں اس کے ایک حصہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پناہ لی تھی، اس کو مسجد بنادیا گیا تھا اور اس میں باقاعدہ نماز ہوتی تھی جیسا کہ امام ارزقیؒ کی تصریح گزرچکی ہے اور اسی مکان کے دوسرے حصہ کو دار الخیزران کے نام سے یاد کیا گیا جسے خیزران نے اپنے صرفہ سے تعمیر کرایا تھا، اخبار مکہ ارزقی کے محشی نے جو زمانۂ حال کے ہیں، اور مکہ مکرمہ کے رہنے والے ہیں حاشیہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ دارارقم آج کل دار الخیزران کے نام سے مشہور ہے یہ پہلے مختبیٰ بھی کہا جاتا تھا، پھر دوسری جگہ حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ دار الخیزران مختبیٰ کے اردگرد واقع ہے[۳]

دارارقم موجودہ صدی تک

اس مقام کی عظمت و اہمیت کی وجہ سے بعد کے امراء و سلاطین نے بھی

---

[۱] رحلہ ابن جبیر ص۹۱، [۲] رحلہ ابن بطوطہ ج ا ص۸۶، [۳] اخبار مکہ ج ۲ ص۱۶۲ حاشیہ

اس کی طرف عقیدت و محبت کی نظر کی، اور اس کی تعمیر و تجدید کو باعث سعادت سمجھا چنانچہ اس صدی کی ابتدا تک اس میں دو کتبے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ امین الملک مصلح اور وزیر جمال الدین اصفہانی نے بھی دار ارقم کی تعمیر و تجدید میں حصہ لیا تھا اس کے مشرقی جنوبی گوشے میں دو پتھر رکھے ہوئے تھے، جن میں سے ایک پر ابھرے ہوئے حروف میں یہ عبارت کندہ تھی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	بسم اللہ الرحمن الرحیم
فی بیوت اذن اللّٰه ان ترفع	فی بیوت اذن اللہ ان ترفع و یذکر فیہا اسمہ
ویذکر فیها اسمه یسبح له فیها	یسبح لہ فیہا بالغدو و الآصال (الآیۃ) یہ رسول اللہ
بالغدو والآصال، هذا مختبأ	صلے اللہ علیہ وسلم کا مختبیٰ (پناہ گاہ) اور دار
رسول الله، ودار الخيزران، و	خیزران ہے، اور اسی میں اسلام کی اشاعت کی
فيها مبتدأ الاسلام أمر بتجديده	ابتدا ہوئی، اس کی تجدید کا حکم فقیر امین الملک
الفقير الى مولاه امين الملك	مصلح نے دیا، اس کا مقصد اللہ و رسول کی
مصلح ابتغاء ثواب الله ورسوله	طرف سے ثواب ہے، اور اللہ تعالیٰ نیکیوں کے
ولا يضيع اجر المحسنين ۔	اجر کو ضائع نہیں کرتا ہے،

اور دوسرے پتھر پر یہ عبارت کندہ تھی:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	بسم اللہ الرحمن الرحیم
هذا مختبأ رسول الله صلى الله عليه وسلم	یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا مختبیٰ ہے، اسے
المعروف بدار الخيزران، امر بعمله	دار الخیزران بھی کہتے ہیں، اس کی تعمیر کا حکم
وانشائه العبد الفقير لرحمة الله تعالى	فقیر جمال الدین شرف الاسلام ابو جعفر
جمال الدين شرف الاسلام ابو جعفر	محمد بن علی بن ابو منصور اصفہانی وزیر شام و
محمد بن علي بن ابي منصور الاصفهاني	موصل نے دیا، جو اللہ تعالے کا طالب اور
وزير الشام والموصل الطالب الوصول إلى الله تعالى	اس کی رحمت کا امیدوار ہے، اللہ تعالے اپنی

الواجی لرحمتہ اطال اللہ فی الطاعۃ بقاءہ — اطاعت میں اس کی عمر دراز کرے، اور دونوں
وانالہ فی الدین مناہ فی سنۃ خمس وخمسین وثمانمائۃ — جہاں میں اس کی مراد پوری کرے، ۸۵۵ھ،

سعودی حکومت سے پہلے خدیو مصر عباسی حلمی باشا الثانی نے ۱۳۲۷ھ کے اپنے سفر نامہ حجاز میں دار ارقم کے بارے میں تفصیل سے معلومات درج کی ہیں، جو اس کی قدیم تاریخ کی آخری سند و شہادت ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ دار ارقم جو دار خیزران کے نام سے مشہور ہے کوہ صفا کی طرف جانے والے کے بائیں جانب گلی میں واقع ہے، اس کا دروازہ مشرق کی طرف کھلتا ہے، اس دروازہ سے داخل ہونے کے بعد ایک کھلا ہوا صحن پڑتا ہے، جس کا طول تقریباً آٹھ میٹر اور عرض چار میٹر ہے، اس صحن کے بائیں جانب تقریباً تین میٹر چوڑا سائبان کی چھت ہے اور صحن کے دائیں جانب کی دیوار کے وسط میں ایک دروازہ ہے جس سے اندر ایک کمرہ میں داخل ہوا جاتا ہے، اس کمرے کا طول آٹھ میٹر اور عرض اس کا نصف ہے، اس میں چٹائی بچھی ہوئی اور اس کمرے کے مشرقی جنوبی گوشے میں دو پتھر رکھے ہوئے ہیں جن کے اوپر دو تحریریں ہیں، (یہ دونوں تحریریں اوپر گزر چکی ہیں) [1]

خلاصہ یہ ہے کہ دار ارقم ابتدائے اسلام میں مکہ مکرمہ میں اسلامی دعوت اور قرآنی تعلیم کا مرکز تھا اور اس میں وہ مسلمان اپنے رسول کے ساتھ رہتے تھے جن کو "السابقون الاولون" کا خطاب ملا ہے، یہ مرکز سیرت نبوی کے ابتدائی اہم واقعات کا گہوارہ ہے، جسے اسلامی ثقافت کا مرکز کہا جا سکتا ہے جہاں دینی علوم و افکار اور اسلامی اقوال و اعمال کی تعلیم و تلقین عملی طور سے ہوتی تھی، اسی مرکزیت اور اہمیت کی وجہ سے مسلمانوں نے دار ارقم کو ہمیشہ اپنی عقیدت و محبت کا مرکز بنایا، اور وہ مختلف ناموں سے یاد کیا گیا، مثلاً (۱) دار ارقم بن ابی ارقم (۲) دار آل ارقم (۳) دار الاسلام (۴) مسجد دار ارقم (۵) مختبیٰ (۶) دار الخیزران (۷) دار زبیدہ، اس صدی کی ابتدائی ربع تک اس کی یہ حیثیت اور خصوصیت باقی رہی، اگر سعودی حکومت کے دور میں حرم شریف کی توسیع و تعمیر کے سلسلے میں اس کے تمام قدیم آثار حرمین شریفین کے اسی قسم کے دیگر آثار و علائم کی طرح ختم کر دیئے گئے اور اسے اب نئی عمارت کی شکل میں قرآنی تعلیم کا مدرسہ بنا دیا گیا ہے۔ (البلاغ، مارچ، اپریل ۱۹۵۶ء)

---

[1] الرحلۃ الحجازیۃ، لعباس حلمی باشا الثانی خدیو مصر ص ۵۵

(handwritten) ۹۳/۱۰/۱۲

(۵)

مدارسِ اسلامیہ کے ارتقائی ادوار

اسلام سراسر تعلیمی و تبلیغی دین ہے اور وہ چند اصول و روایات کے مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں انسانی زندگی کے ہر گوشہ کے لیے تعلیم ہے، جس کا سیکھنا سکھانا بقدرِ ضرورت ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے دوسرے تمام مذاہب و ادیان کے مقابلہ میں اسلام میں تعلیم و تعلم کو اہمیت حاصل ہے اور مسلمانوں میں پڑھنے پڑھانے کا رواج ان کی تاریخ کے پہلے دن سے آج تک دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ ہے، آج بھی مجموعی اعتبار سے یہ قوم اور اس کے افراد زیادہ لکھے پڑھے ہوتے ہیں۔

اسلام میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ ابتدا ہی سے احوال و ظروف کے حسبِ حال جاری تھا اور جیسے جیسے حالات بدلتے گئے اس میں باقاعدگی اور تنظیم آتی گئی، مکہ مکرمہ اور اس کے قرب و جوار میں اسلام کی آمد کے زمانہ میں کوئی تعلیمی نظام نہیں تھا، البتہ بعض علوم و فنون جو عربوں کی زندگی سے متعلق تھے روایاتی اور تجرباتی طور سے غیر منظم طور سے پائے جاتے تھے جیسے شاعری، طب، النجوم، قیافہ اور کہانت وغیرہ، ان کے جاننے والے عموماً بدوی اور بے پڑھے لکھے لوگ ہوا کرتے تھے، اور ان کے یہ علوم خاندانی ورثہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے، البتہ ان میں کچھ افراد ایران اور روم کے علوم و فنون سے واقف تھے شام کی حدود میں رومی تہذیب و تمدن اور علوم و آثار پائے جاتے تھے اور سریانی علوم کا چرچا تھا، اسی طرح عراق اور اس کے اطراف ایرانی علوم و فنون سے کسی نہ کسی حد تک روشناس تھے، اندرون عرب کے بعض حکماء و اطباء کے بارے میں مورخین نے تصریح کی ہے کہ انھوں نے ایران جا کر ایرانی علوم و فنون حاصل کئے، مشہور طبیب عرب حارث بن کلدہ نے وہیں جا کر طب اور موسیقی سیکھی تھی، اور مکہ مکرمہ والوں کا تعلق ایرانی سلطنت اور ایرانی علوم سے پایا جاتا تھا، ان کے وفود کسریٰ کے دربار میں

جاتے تھے، اور ایک دوسرے کے افکار و خیالات سے واقف ہوتے تھے، بلکہ بعض اہل مکہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے مقابلہ میں ایران کے علمی و ادبی سرمایہ سے فائدہ اٹھایا اور ایرانی قصص و روایات کو اسلامی تعلیمات کے مقابلہ میں عوام کے سامنے پیش کیا، قاضی القضاۃ عبدالجبار ہمدانی معتزلی نے تثبیت دلائل النبوۃ میں لکھا ہے کہ بنو عبدالدار کا نضر بن حارث بن کلدہ اللہ و رسول کا بدترین دشمن تھا اس نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں ایران کا سفر کیا اور وہاں ایسی چیزیں تلاش کیں جن سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فتنہ برپا کر سکے، چنانچہ اس نے رستم و اسفندیار اور اہل فارس کی داستان خریدی، اور ان کو مکہ میں لاکر بیان کرنا شروع کیا، جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی جگہ سے اٹھ جاتے تو نضر بن حارث وہاں پہونچ کر ان ہی قصوں کہانیوں کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا اور کہتا کہ محمدؐ عاد و ثمود اور دوسری گذشتہ قوموں کے بارے میں جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ سب باتیں اسی کتاب کی ہیں بلکہ یہ کتاب ان سے زیادہ اچھی اور دلچسپ ہے[1] ابن ندیم نے الفہرست میں ایرانیوں کی کتابوں کے ذکر کتاب رستم و اسفندیار کا تذکرہ کیا ہے[2]

بہرحال عرب کے وسطی علاقہ میں کوئی چھوٹی بڑی باقاعدہ درسگاہ نہیں تھی اور نہ ہی عرب کے عوام میں علم و فنون کا کوئی خاص چرچا تھا البتہ بعض افراد دوسرے ملکوں میں جاکر وہاں کے بعض علوم حاصل کرتے تھے، مکہ مکرمہ میں کتابت اور لکھنے کا رواج اس طرح ہوا کہ یہاں کے چند لوگوں نے تجارتی اسفار کی بدولت حیرہ سے فن تحریر سیکھا اور مکہ آکر دوسروں کو سکھایا مگر یہ کام بھی بہت محدود اور خال خال لوگوں میں ہوا، اور علامہ بلاذری کی تصریح کے مطابق رسول اللہؐ کی بعثت کے وقت قبیلہ قریش میں صرف سترہ آدمی لکھنا جانتے تھے[3] حالانکہ مکہ تجارتی مرکز تھا اور دنیا کی مختلف مشرقی اور مغربی قوموں کے تاجر یہاں آتے جاتے تھے، خود قریش کا پیشہ تجارت

---

[1] تثبیت دلائل النبوۃ ج ۱ صـ ۵۳ طبع بیروت، [2] کتاب الفہرست صـ ۴۲۴،
[3] فتوح البلدان، امر الخط صـ ۴۷۷۔

تھا جس کا تعلق یمن اور شام سے تھا، اس کے باوجود ان میں علم کی کمی کا یہ حال تھا کہ صرف سترہ آدمی قلم پکڑنا جانتے تھے، اسی سے دوسرے علاقوں کی علمی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مکہ مکرمہ کی اسلامی درسگاہیں

ان حالات میں مسلمانوں نے مکہ مکرمہ میں قرآن کی تعلیم کا کام شروع کر کے وقت کی نزاکت اور ضرورت کے مطابق تعلیمی سلسلہ جاری کیا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی مکہ کی دس سالہ زندگی سراسر لامرکزیت کی تھی، رات دن افکار و حوادث کا ہجوم رہتا تھا، مسلمانوں کا کوئی محفوظ مرکز نہیں تھا جہاں وہ سکون و اطمینان اور امن و امان سے اسلامی احکام کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے اس زمانہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی متحرک مدرسہ تھی جس کے ذریعہ بازاروں میلوں، اور خصوصی و عمومی جگہوں میں تعلیم و تبلیغ کا کام ہوتا تھا، نیز اس دور میں جو حضرات اسلام لاتے چند اصولی باتوں کی تعلیم حاصل کر کے دوسروں تک پہنچا دیا کرتے تھے، اس بارے میں چند حضرات امتیازی شان رکھتے تھے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضؓ اور حضرت خباب ابن ارت رضؓ وغیرہ اس دور کے معلّم و مدرس کہے جا سکتے ہیں، اور مندرجہ ذیل مقامات کو مکہ میں اسلامی مدرسہ کہا جا سکتا ہے۔

مدرسہ مسجد ابو بکر رضؓ

مکی دور میں اگرچہ باقاعدہ مدارس مدرسین نہیں تھے مگر اس پرفتن دور میں جس جگہ مسلمانوں کو پُرسکون لمحے مل جاتے وہیں قرآن کے پڑھنے پڑھانے کا خصوصی اور وقتی انتظام کر لیا جاتا تھا، اس دور کے ایسے مقامات کو ہم مدرسہ کہہ سکتے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کی وہ مسجد ہے جسے مدرسہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جس پر آپ نماز پڑھتے اور قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے، اس سے پہلے یہ ایک کھلی ہوئی جگہ تھی۔ اس لیے کفار کے لڑکے اور عورتیں اس وقت حضرت ابو بکر کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور قرآن سنتے، یہ بات کفار کو ناگوار گزری اور انہوں نے حضرت ابو بکر کو اس مرکز کے چھوڑنے پر مجبور کیا، اور جب آپ ہجرت کے ارادہ سے نکلے تو ابن دغنہ آپ کو واپس لایا اور کہا کہ آپ باہر نہ جائیں البتہ گھر کے اندر نماز پڑھیں اور قرآن کی تلاوت کریں، آپ نے کچھ دنوں تک گھر کے اندر نماز اور تلاوت کا عمل جاری

رکھا پھر گھر کے سامنے ایک مسجد بنا کر اسی میں یہ کام کرنے لگے، صحیح بخاری میں ہے۔

ثم بدا لأبی بکر فابتنی	اس کے بعد حضرت ابو بکر نے اپنے گھر کے سامنے
مسجداً بفناء دارہ، وکان	ایک مسجد بنائی جس میں نماز پڑھتے اور قرآن
یصلی فیہ ویقرأ القرآن[1]	پڑھتے تھے۔

مدرسۂ بیت فاطمہ بنت خطاب

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا ان سے پہلے اپنے شوہر سعید بن زید کے ساتھ مسلمان ہو چکیں، اور دونوں اپنے گھر میں قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے، جن کو حضرت خباب بن ارت قرآن پڑھاتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے اپنی بہن کے گھر گئے تو اس وقت بہن بہنوئی دونوں قرآن پڑھ رہے ہیں سیرت حلبیہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبانی منقول ہے کہ:۔

وقد ضم الی زوج اختی رجلین	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بہنوئی کے یہاں دو مسلمانوں
ممن أسلم احدھما خباب بن	کے کھانے کا انتظام کیا تھا، ان میں سے ایک خباب بن
الارت والاٰخر لم اقف علی	ارت تھے اور دوسرے کا نام مجھے معلوم نہ ہو سکا خباب
اسمہ ...... وانہ کان یختلف	بن ارت ان دونوں کے یہاں آتے جاتے تھے
الیھما لیعلمھما القراٰن۔	اور ان کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے،

چنانچہ جس وقت حضرت عمر غصہ کی حالت میں ان کے یہاں پہونچے تو چند مسلمان بیٹھے ہوئے قرآن پڑھ رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

کان القوم جلوساً یقرؤن	ایک جماعت بیٹھی ہوئی صحیفہ پڑھ رہی تھی جو انکے
صحیفۃ معھم[2]	پاس تھا۔

صحیفہ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے اس وقت تک مکہ میں قرآن کا جس قدر حصہ نازل ہوا تھا کتابی شکل میں جمع کر لیا گیا تھا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، [2] سیرت حلبیہ جلد اصفحہ ۳۰۱

مدرسہ دار ارقم بن ابی ارقم یہ وہ مدرسہ ہے جسے علمائے تواریخ و سیر دار ارقم وغیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ مکان حضرتِ ارقم کی ملکیت میں تھا، کوہِ صفا کے اوپر واقع تھا، اور اس وقت دعوتِ اسلام کا مرکز تھا حتی کہ اسی زمانہ میں دار الاسلام کے نام سے مشہور ہو گیا تھا[1] جب کفارِ قریش کا ظلم وستم حد سے زیادہ ہو گیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو لے کر اسی مکان میں رہنے لگے تھے، یہ سب تقریباً چالیس صحابہ تھے جن میں مرد اور عورتیں سب ہی شامل تھے، اسی گھر میں قیام کے دوران حضرت عمرؓ اسلام لائے تھے، حضرت ابوبکرؓ حضرت حمزہؓ حضرت علی رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ... یہ اس میں رہتے تھے، آپ نے یہاں ایک ماہ تک قیام فرمایا تھا اور اس میں باقاعدہ دینی تعلیم کا انتظام تھا، مدرسہ دارِ ارقم کے انتظام پر حضرت عمرؓ کے بیان سے اچھی روشنی پڑتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتلاء و آزمائش کے نازک دور میں آپ نے کس طرح اسلامی تعلیم کو جاری رکھا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	مسلمان ہونے والوں میں سے ایک ایک دو دو کو
یجمع الرجل والرجلین اذا اسلما	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی صاحب استطاعت
عند الرجل بہ قوۃ یکونان معہ	کے یہاں بھیج دیا کرتے تھے، یہ اس کے ساتھ رہ کر
یصیبان من طعامہ[2]	کھانا کھایا کرتے تھے۔

سیر کی کتابوں سے مدرسہ دار ارقم کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ (۱) طلبہ کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی، (۲) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ حضرت خبّاب بن ارتؓ وغیرہ قرآن کا درس دیتے، (۳) یہی مدرسہ بھی تھا اور دار الاقامہ بھی (۴) صاحب حیثیت صحابہ کے یہاں ایک ایک طلبہ بطور وظیفہ اور مدد کے کھانا کھایا کرتے تھے، (۵) اس مدرسہ کی یہ شکل ایک ماہ کے قریب رہی[3] دار ارقم پر ہمارا ایک مستقل اور مفصل مقالہ ہے، مزید معلومات کے لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

مدرسہ شعب ابی طالب کفار قریش نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر مکہ مکرمہ

---

[1] تفصیل کے لیے المستدرک حاکم جلد ۳ صفحہ ۵۰۳ ملاحظہ ہو۔ [2] سیرت حلبیہ ج ۱ صفحہ ۳۰۱ [3] کتاب ہذا

کی گلیاں تنگ کر دیں اور ان کا ہر طرح کا مقاطعہ کیا جس کی وجہ سے آپ سنہ ۷ نبوی سے سنہ ۱۰ نبوی تک شعب ابی طالب میں محصور رہے، اس تین سال کی مدت میں ہر قسم کی تکلیف و تنگی کے باوجود تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا، قرآن کا نزول ہوتا تھا اور اس کی تعلیم بھی ہوتی تھی، شعب ابی طالب میں خاندان رسالت کے دوسرے صحابہ کی موجودگی کا ثبوت تاریخوں سے ملتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ان سالوں میں وہاں تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری رہا ہو۔[1]

مدرسۂ ارضِ حبشہ

رجب سنہ ۵ نبوی میں کفار و مشرکین کے ظلم و ستم سے تنگ صحابہ کرام کی ایک جماعت ارضِ حبشہ کی طرف ہجرت کر گئی، اسلام میں یہ پہلا غیر ملکی بحری سفر تھا ان میں مرد اور عورتیں سب ہی شامل تھے جن کی تعداد ۸۳ تھی[2] ان میں حضرت عثمان بن عفان، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے جو بعد میں علومِ اسلامیہ کے ترجمان و ناشر ہوئے، ان کے امیر حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ تھے[3] ایک موقع پر حضرت جعفر بن ابو طالب رضی اللہ عنہ نے شاہ حبش کے بھرے دربار میں علمائے نصاریٰ کے سامنے قرآن کی تلاوت کی اور اسلام پر جامع تقریر کی، صحابہ کرام کی اتنی تعداد حبشہ میں قرآن کے پڑھنے پڑھانے اور اس وقت تک اسلامی احکام کے سیکھنے سکھانے میں مصروف رہا کرتی تھی، اس لحاظ سے ارضِ حبشہ کا مدرسہ غیر ملک میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

مکہ مکرمہ کے باہر کے مدارس

اسلام کے مکی دور میں یہی چند مقامات تھے جہاں دین کی تعلیم کسی نہ کسی طور سے ہوا کرتی تھی، اور اس میں اجتماعیت پائی جاتی تھی، مکہ مکرمہ کے باہر بھی اس دور میں کچھ ایسے مقامات تھے جن کو اس دور کے مدارس میں شمار کیا جا سکتا ہے، اس زمانہ میں کئی ایسے حضرات تھے جو باہر سے آ کر اسلام لاتے اور حالات کی نزاکت کی وجہ سے ان کو رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے ضروری تعلیمات دے کر ان کے قبیلہ اور وطن میں بھیج دیا اور فرمایا کہ تم موجودہ حالت میں اپنے یہاں رہ کر دین کا کام کرو، جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو میرے پاس آ جانا، ایسے حضر

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۲۶، [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۰۵ [3] مواہب لدنیہ ج ۱ ص ۵۱۔

…ے اپنے اوطان و قبائل میں اسلامی تعلیم کی خدمت انجام دیتے تھے، اور ان کے گھر مدرسہ تھے، اور بعض …امات پر مستقل طور سے معلمین قرآن بھیجے جاتے تھے، چنانچہ مدینہ منورہ میں قرآن کی تعلیم کا سلسلہ …زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔

ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ میں مدرسہ دار سعد بن ضرارہ

مدینہ منورہ میں قرآن کی تعلیم ہجرت سے پہلے ہی ہو رہی تھی، اور آخر میں وہاں سے اس کا تقاضا شدید ہو گیا کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر طے پایا کہ ایک عالم صحابی مستقل معلم قرآن بن کر مدینہ آئیں چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کام کے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو منتخب فرمایا اور انہوں نے مدینہ پہونچ کر حضرت سعد بن ضرارہؓ کے مکان میں باقاعدہ تعلیم قرآن کا سلسلہ جاری کیا، جس کا نتیجہ ہوا کہ معدودے چند کے علاوہ تمام انصار نے اسلام سے مشرف ہو کر اپنے بت توڑ ڈالے، اور حضرت مصعب بن عمیرؓ مقری یعنی عالم قرآن کے لقب سے یاد کئے جانے لگے، معجم کبیر طبرانی کی روایت ہے،

قدم مصعب إلى النبي صلى الله عليه وسلم كان يدعى المقرى [1]

جب مصعب بن عمیرؓ مدینہ منورہ سے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو مقری کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے،

اسلام میں سب سے پہلے مقری یعنی معلم و استاذ کا لقب حضرت مصعبؓ کے نصیب میں تھا، اس دور مدینہ منورہ کے اس مدرسہ سے قرآن کی تعلیم کا چرچا عام ہو چکا تھا اور بہت سے تلامذہ و طلبہ نے یہاں پر قرآن کی تعلیم حاصل کی، حضرت براء بن عازبؓ کا بیان ہے،

قدم النبي صلى الله عليه وسلم علينا فما قدم حتى حفظت سوراً من المفصل [2]

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری سے پہلے ہی میں نے طوال مفصل کی کئی سورتیں زبانی یاد کر لی تھیں،

مدرسہ دار سعد بن خیثمہؓ

ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ میں اور بھی مقامات تھے جہاں دینی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا، ان میں مدرسہ دار سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہ زیادہ اہمیت

[1] مجمع الفوائد ج ۲ ص ۲۸ طبع ہند، [2] طبقات ابن سعد … و اسعاف المبطأ فی رجال الموطأ ص ۱۸۴،

رکھتا ہے، حضرت سعد بن خیثمہؓ مجرد تھے اس لیے ہجرت عامہ سے پہلے کے مجرد مہاجرین کے لیے ان کا گھر دارالاقامہ تھا جس میں قرآنی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

مدرسۂ مسجد بنی زریق

انصار مدینہ میں بنو زریق کی مسجد قرآنی تعلیم کا سب سے پہلا مدرسہ ہے اور حضرت رافع بن مالکؓ اس کے اولین استاد ہیں، دس سال کی مدت میں قرآن کا جس قدر حصہ نازل ہوا تھا حضرت رافع بن مالکؓ نے اہل مدینہ کو اسی مسجد میں پڑھایا، سورۂ یوسف بھی آپ نے سب سے پہلے یہیں پڑھائی، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کی سلامتیٔ طبع اور استقامت حال پر تعجب فرمایا کرتے تھے[1]

مدرسۂ مسجد بنی بیاضہ

ہجرت عامہ سے پہلے بنی بیاضہ کی یہ مسجد بھی مدینہ منورہ میں مرکزیت حاصل کر چکی تھی اور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے اس میں سب سے پہلا جمعہ پڑھایا اور مدینہ کے مسلمانوں کو جمع کیا[2] اس وقت کے عام حالات کے مطابق یہاں بھی قرآن کی تعلیم ہوتی تھی، کیونکہ مدینہ منورہ کی مسجد کے امام وہاں کے معلم بھی ہوا کرتے تھے۔

مدرسۂ مسجد قُبار

ہجرت عامہ سے پہلے ہی صحابہ کرامؓ کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، اس دور میں مہاجرین عموماً مدینہ منورہ کے باہر مقام قُبار میں قیام کرتے تھے، ہجرت سے پہلے ان کا ایک گروہ یہاں آکر تعلیم و تعلّم میں مشغول رہتا تھا جو حضرات قُبار اور اس کے قریب مقام عصبہ میں مقیم تھے، انہیں حضرت سالم مولیٰ ابن حذیفہؓ نماز پڑھایا کرتے تھے، کیونکہ ان سب میں قرآن کے بڑے عالم وہی تھے[3] حالانکہ قُبار میں اجلۂ صحابہ کا مجمع رہتا تھا جن میں حضرت عمرؓ، حضرت ابو سلمہؓ، حضرت زیدؓ، حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہم جیسے علمار و مشاہیر صحابہ تھے، لیکن ان کی امامت حضرت سالم ہی کیا کرتے تھے، بعد میں حضرت معاذ اور حضرت سعد بن عبید رضی اللہ عنہما قُبار میں نماز پڑھایا کرتے تھے، اور حضرت سعد تو عہد صدیقی بلکہ ابتدائے عہد فاروقی تک اس

---

[1] وفاء الوفا باخبار دار المصطفےٰ ج ۲ ص ۵۹ و اصابہ ج ۲ ص ۱۹۰، [2] وفاء الوفا ج ۲ ص ۳۰

[3] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ ج ۱ ص ۸۸۔

خدمت پر مامور رہے، اور ان کے انتقال پر حضرت عمرؓ نے حضرت مجمع بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو یہ خدمت سپرد کی[1]

ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ کے مدرسۂ دار ارقم اور مدینہ منورہ کے مدرسۂ مسجد قبا ر دونوں میں تعلیم و تعلم کا نہایت معقول اور مستقل انتظام تھا، بلکہ مدرسہ قبا میں تعلیمی سرگرمی زیادہ تھی، حضرت عبدالرحمٰن بن غنمؓ کا بیان ہے۔ حدثنی عشرۃ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قالوا:

کنا نتدارس العلم فی مسجد قباء	مجھ سے دسیوں صحابہ نے بیان ہے کہ ہم مسجد
اذا خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ	قبا میں پڑھتے پڑھاتے تھے، کہ رسول اللہؐ
علیہ وسلم فقال تعلموا ما شئتم،	آئے اور ہم کو دیکھ کر فرمایا کہ تم لوگ جو چاہو
ان تعلموا فلن یاجرکم اللہ	پڑھو مگر سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ اسی وقت تم کو
حتیٰ تعملوا[2]	اجر دے گا جب کہ تم لوگ اپنے علم پر عمل کرو گے

اس مدرسہ میں اجلۂ صحابہ موجود تھے اور وہ آپس میں تعلیم و تعلم کا کام کرتے تھے، ویسے مدینہ منورہ اور دوسرے مقامات میں مسجدوں کے ائمہ وہاں کے اساتذہ ہوا کرتے تھے!

اس دور کے دیگر مدارس

ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ میں ان مساجد مدارس کے علاوہ بھی اور بہت سی مسجدیں اور مدرسے تھے جن میں نماز اور تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا، جو حضرات ہجرت سے دو سال پہلے یہاں آئے انہوں نے مسجدوں کی تعمیر میں بہت زیادہ حصہ لیا اور محلہ محلہ مسجدیں بنائیں، حضرت جابرؓ کا بیان ہے۔

لقد لبثنا بالمدینۃ قبل	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف
ان یقدم علینا رسول اللہ صلی اللہ	آوری سے دو سال پہلے ہی ہم لوگ مدینہ بھیج
علیہ وسلم سنتین نعمر المساجد	دئے گئے تھے، اور ہم مسجدوں کی تعمیر اور
ونقیم الصلوٰۃ[3]	اقامت صلوٰۃ میں مصروف تھے۔

---

[1] وفار الوفار ج ۱ ص ۲۱۔ [2] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۶، [3] وفار الوفا ج ۱ ص ۱۷۹،

چنانچہ ہجرت سے پہلے ہی بنو نجار، بنو عبد الاشہل، بنو ظفر، بنو عمرو بن عوف، بنو بیاضہ اور بنو زریق وغیرہ کے محلے مساجد سے معمور اور تعلیم کے مرکز بن گئے تھے، اور یہاں پر اس تیزی سے اسلام کی اشاعت ہوئی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کایا پلٹ گئی اور مدینہ دار الاسلام، اور دار العلم بن گیا، معجم کبیر طبرانی کی روایت ہے:۔

حتی قل دارٌ من دور الانصار	انصار کا بہت کم گھرانا ایسا رہ گیا تھا جس کے
الا اسلم فیہا ناس، واسلم اشرافہم	افراد مسلمان نہ ہوئے ہوں، شرفاء انصار اور
واسلم عمرو بن الجموح، وکسروا	عمرو بن جموح مسلمان ہوئے، اور اپنے بتوں کو
اصنامہم فکان المسلمون أعزّ	توڑ ڈالا، اہل اسلام کی وجہ سے مسلمان وہاں
اھلہا وصالح امرھم[1]	کے معزز ترین باشندے بن گئے اور ان کے
	تمام معاملات درست ہو گئے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ مدینہ کے انصار جو پہلے یہودیوں کے زیر اقتدار رہ کر مذہبی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور تمدنی اعتبار سے بالکل گئے گزرے تھے دو ہی سال کے اندر اندر اسلام اور اسلامی تعلیمات کی اشاعت کی بدولت عزّ و شرف کے اعلیٰ ترین مقام پر پہونچے اور ان کے تمام بگڑے ہوئے کام بن گئے، یہی نہیں بلکہ ان میں دینی و ایمانی غیرت و حمیت اور خدا پر یقین و ایمان کے بعد خود اعتمادی کی قوت اتنی زیادہ پیدا ہو گئی کہ انہوں نے معلم کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، اور اسلام اور مسلمانوں کی ہر طرح اور ہر قسم کی مدد کا یقین دلایا، حتی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام مدینہ آگئے اور مدینہ اسلام اور اسلامی علوم و معارف کا مرکز بن گیا۔

اس زمانہ تک اسلامی مدارس کا یہی طور طریقہ تھا، اور ان میں قرآن کی تعلیم بنیادی حیثیت رکھتی تھی، اس کے علاوہ کچھ اور دینی تعلیمات دی جاتی تھیں جن میں اخلاق کا عنصر غالب رہتا تھا، اور ہر معاملہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل معیار رہتا، بالفاظ دیگر ان میں کتاب و سنت کی

---

[1] مجمع الفوائد ج ۲ ص ۲۸۔

تعلیم ہو رہی تھی، اور عموماً مسجدوں میں مدرسے ہوا کرتے تھے، معلمی اور مدرسی کی خدمات صحابہ میں سے وہ حضرات انجام دیتے تھے جو قرآن کا زیادہ علم رکھنے کی وجہ سے ائمہ مساجد مقرر کیے جاتے تھے،[۱] ان کے علاوہ بھی بعض حضرات اپنے حلقوں میں قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے، امامت کی طرح درس و تدریس کا کام خالص دینی فریضہ سمجھا جاتا تھا اور ان دونوں کاموں کے لیے دنیاوی اجرت کا سوال نہیں تھا۔

ہجرت کے بعد جامعہ صفہ کا قیام

جب مکہ مکرمہ سے دین و ایمان اور علوم و معارف کا کاروان مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوا، اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہاں نزولِ اجلال فرمایا تو سب سے پہلے آپ نے ایک اسلامی مرکز کی بنیاد ڈالی تاکہ اس مصدر و منبع سے علم و عمل کے چشمے پھوٹیں، اور عبدیت و عبادت کی تعلیم اور اس کا عملی ظہور ہو، مسجد نبوی کی تعمیر اسی مقصد کے لیے ہوئی، اندرونی حصہ نماز کے لیے رکھا گیا اور بیرونی حصہ میں ایک مقام صفہ کے نام سے مخصوص کیا گیا جہاں قرآن اور اسلامی احکام کی باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی، اور جوں جوں اسلامی احکام میں اضافہ ہوتا گیا اس کا نصاب بھی اونچا ہوتا گیا، اسی چبوترہ اور سائبان کو ہم جامعہ صفہ سے تعبیر کرتے ہیں گویا یہ مکہ مکرمہ کے مدرسہ دار ارقم کی نشاۃ ثانیہ تھی، حجرۂ مبارکہ کی پشت پر شمال کی جانب بابِ جبرئیل کے سامنے آج بھی ایک وسیع چبوترہ ہے جسے دکۃ الاغوات کہتے ہیں یہی مقام صفہ کہا جاتا تھا اور اس پر بیٹھ کر پڑھنے پڑھانے والوں کو اصحاب صفہ کہا جاتا تھا، جو حضرات اسلام لاتے اور اس جرم میں اپنے گھر بار سے باہر کر دیے جاتے تھے وہ یہیں آکر پناہ لے کر دینی تعلیم حاصل کرتے تھے، دن کے کچھ حصے کسب معاش کے لیے ہوتے تھے جن میں باہر سے لکڑیاں وغیرہ لا کر فروخت کرتے تھے اور رات کو اسی صفہ پر آرام کرتے تھے، ان اضیافُ الاسلام میں سے بعض رات کو دوسرے صحابہ کے گھروں پر تعلیم حاصل کرنے کے لیے جایا کرتے تھے، اور صبح کو فجر کے بعد سے دن چڑھے تک رسول اللہ صلے اللہ علیہ کی خاص مجلس سے استفادہ کرتے تھے، ان کے طعام کا انتظام یہ تھا کہ بعض مالدار اور صاحب حیثیت صحابہ ان غربار اسلام کو اپنے ساتھ لے جاتے اور کھانا کھلاتے، ان میں حضرت سعد بن عبادہؓ

---

[۱] مجمع الفوائد ج ۲ ص ۲۰،

نہایت فیاض تھے، نیز ان کے لئے کھجوروں کے خوشے اور کھانے کی دوسری چیزیں ہدیہ اور تحفہ کے طور پر صحابہ کرام حاضر کیا کرتے تھے، ان کی تعداد کبھی کبھی اسّی تک پہونچ جاتی تھی، جو لوگ یہاں رہ کر فارغ التحصیل ہو جاتے وہ باہر جاکر زندگی بسر کرنے لگتے تھے، یہ حضرات عام طور سے دن میں دیگر معلمین سے بھی قرآن کی تعلیم حاصل کرتے، اصحاب صفہ کی مجموعی تعداد چار سو کے قریب ہے مگر ایک وقت میں کبھی اتنی زیادہ نہیں تھی، حضرت ابوہریرہؓ کے ذمہ ان حضرات کے کھانے کا انتظام تھا، جامعہ صفہ کے فضلار قرار کہلاتے تھے، اور بوقت ضرورت ان کو قرآن اور اسلامی احکام کی تعلیم کے لیے باہر قبائل میں بھیجا جاتا تھا، یہاں کا تعلیمی نظام بہت مضبوط اور مستحکم تھا اور یہاں کے فضلار و فارغین نے دنیا میں اسلامی علوم کی تبلیغ و اشاعت کی، اصحاب صفہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، یہاں پر تفصیل مقصود نہیں ہے۔

دیگر درسگاہیں مسجد نبوی اور اس کے جامعہ صفہ کے علاوہ عہد رسالت میں مدینہ منورہ میں کئی ایسی مسجدیں تھیں جن میں جامعہ صفہ کے فضلار، فارغین اور دوسرے صحابہ امامت و معلمی کی خدمت انجام دیتے تھے، اس زمانہ میں نو ایسی مسجدیں تھیں جن میں مستقل نماز باجماعت ہوا کرتی تھی اور ان کے امام وہاں کے معلم ہوا کرتے تھے[۱] ان کے علاوہ دوسری مساجد میں بھی نماز و تعلیم کا سلسلہ جاری تھا، علامہ سمہودی نے وفاء الوفا میں اس دور کی چالیس مساجد کے بارے میں لکھا ہے کہ ان میں نماز اور تعلیم کا انتظام تھا۔

مختلف قبائل اور مقامات کے مدارس مدینہ منورہ کے علاوہ عرب کے دیگر علاقوں میں ائمہ و معلمین بھیجے جاتے تھے اور بہت سے قبائل مدینہ آکر مسلمان ہوتے اور ان کی طلب اور خواہش پر قرآن اور شرائع اسلام کی تعلیم کے لیے قرار روانہ کئے جاتے تھے یا ان ہی میں سے جو قرآن اور شرائع اسلام سے زیادہ واقف ہوتا اسی کو امام اور معلم بنایا جاتا تھا، چنانچہ ۹ھ میں طائف کے بنو ثقیف کا وفد مدینہ آیا تو اس وفد کے سب سے کم عمر رکن حضرت عثمان بن حکم ابو العاصیؓ موقع پاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ اور ابی بن کعب کی خدمت میں آتے اور قرآن کی تعلیم حاصل

[۱] وفاء الوفا ج ۲ ص ۶۲

تے جب یہ وفد واپس ہونے لگا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عثمان کو باوجود ان میں سب سے کم سن ہونے کے ان کا امام اور معلم مقرر فرمایا ابن سعد کا بیان ہے۔

وذٰلك انہ کان احرصهم علی	اس کی وجہ یہ تھی کہ عثمان ارکان وفد میں سب
التفقہ فی الاسلام وتعلم القراٰن	سے زیادہ تفقہ اور قرآن کی تعلیم کے حریص تھے'
فقال ابوبکر لرسول اللہ صلی اللہ	چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
علیہ وسلم، یارسول اللہ انی رایت	سے کہا کہ یارسول اللہ! میں نے اس لڑکے کو
ھذا الغلام منهم من احرصهم علی	تفقہ اور قرآن کی تعلیم کا سب سے زیادہ
التفقہ فی الاسلام وتعلم القراٰن [1]	شیدائی پایا ہے'۔

عثمان اس کے بعد سے عہد صدیقی اور اس کے بعد عہد فاروقی تک طائف کے امام و معلم رہے اور ثقیف کو نماز پڑھانے کے ساتھ ان کو تعلیم ۔ بھی دیا کرتے تھے' اسی طرح حضرت عمر بن سلمہؓ بھی اپنی قوم کے ارکان وفد میں سب سے کم عمر تھے مگر انہوں نے خدمت نبوی میں رہ کر قرآن کی تعلیم زیادہ حاصل کی تھی' اس لیے وہی امام و معلم بنائے گئے' نیز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خود نومسلم قبائل کی تعلیم کے لیے صحابہ کرام کو مختلف مقامات میں بھیجا کرتے تھے' چنانچہ آپ نے اہل عمان کے یہاں حضرت ابوزید انصاریؓ کو بھیجا جو ان چند صحابہ میں سے تھے جنہوں نے عہد رسالت میں پورا قرآن جمع کر لیا تھا [2] اس سلسلہ میں ان ستر قراء کا واقعہ بہت مشہور ہے جو تعلیم کے لیے روانہ کئے گئے' مگر راستہ میں دھوکہ سے شہید کر دیئے گئے! ہجرت کے بعد عہد رسالت کی تعلیم میں قرآن کے علاوہ تفقہ فی الاسلام اور شرائع اسلام کے مضامین بھی شامل تھے' جن کو سنت کے جامع لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں' اسلام مکمل دین کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور عبادات و معاملات کے تمام مسائل و جزئیات اور اوامر و نواہی سب کی تعلیم مسلمانوں کے لیے ضروری ہو گئی تھی اس لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور ان کی روشنی میں تفقہ کی تعلیم دی جاتی تھی اسی کے ساتھ سیاسی ضرورت کی بنا پر بعض صحابہ نے غیر عربی زبان بھی حاصل کی' اس میں صحیح بخاری میں حضرت زید بن حارثہ کے سریانی زبان سیکھنے کا واقعہ درج ہے اور انہوں نے یہودیوں سے خط و کتابت کے لیے رسول اللہ

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۵۰۸ و ص ۵۰۹، [2] فتوح البلدان ص ۸۴

کے حکم سے بیس دن سے کم ہی مدت میں یہ زبان حاصل کرلی اس زمانہ میں دینی تعلیم کا عام رواج مساجد میں اور وہی مدارس کا کام دیتی تھیں،

خلافت راشدہ کے مکاتب و مدارس

خلافت راشدہ میں بھی اسلامی علوم و معارف کی تعلیم کے لیے خصوصی انتظام تھا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے باقاعدہ معلم و مدرس مقرر کیے اور ان کو تنخواہ دی، ابن جوزی سیرۃ العمرین میں لکھتے ہیں۔

ان عمر بن الخطابؓ وعثمان بن عفانؓ کانا یرزقان المؤذنین والائمۃ والمعلمین۔	حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما مؤذنوں اور اماموں اور معلموں کو تنخواہ دیتے تھے۔

مدینہ منورہ میں بچوں کے مکتب کے معلموں کو حضرت عمرؓ ماہوار پندرہ پندرہ درہم دیا کرتے کنز العمال میں ہے،

ثلثۃ کانوا بالمدینۃ یعلمون الصبیان وکان عمر بن الخطاب یرزق کل واحد منھم خمسۃ عشر درھما کل شھر۔[1]	مدینہ میں تین معلم بچوں کو تعلیم دیتے تھے، حضرت عمرؓ ہر ایک کو ماہوار پندرہ پندرہ درہم دیا کرتے تھے۔

آپ نے مدینہ کے باہر بھی تعلیم کے لیے معلم و مدرس رکھے حتیٰ کہ صحراؤں میں اس کا انتظام کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں یہی انتظام تھا جیسا کہ ابن جوزی کی تصریح گزر چکی اس دور میں اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ علمائے صحابہ مختلف مقامات میں کتاب و سنت اور شرائع اسلام کی تعلیم کے لیے روانہ کیے گئے اور ان حضرات نے اپنے کاشانوں اور مساجد و جوامع کو تعلیمی مرکز اور درسگاہ بنایا، اس دور میں بچوں کی تعلیم کے لیے مکاتب کا رواج ہو چکا تھا مگر اونچی تعلیم کے لیے عموماً مساجد و جوامع کا استعمال ہوتا تھا، اس وقت مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ کوفہ، بصرہ، مصر، دمشق اور یمن وغیرہ اسلامی علوم و معارف کے مرکز تھے جہاں اجلۂ صحابہ درس دیا کرتے تھے، اس وقت کی تعلیمی سرگرمی اور...

---

[1] کنز العمال ج ۲ ص ۱۹۲۔

کے لیے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے مدرسہ کی مثال کافی ہے، وہ دمشق کی جامع مسجد میں تعلیم دیا کرتے تھے، ان کا قاعدہ تھا کہ جامع دمشق میں فجر کی نماز ادا کیا کرتے تھے، اور نماز کے بعد لوگ آپ کو قرآن پڑھنے کے لیے گھیر لیتے تھے، آپ دس دس طالب علموں کی جماعت بناتے اور ہر جماعت میں ایک عریف یعنی نگران اور مانیٹر مقرر کر کے خود محراب میں تشریف رکھتے اور دائیں بائیں پڑھنے والوں کی جماعتوں کی نگرانی کرتے، جب کوئی طالب علم غلطی کرتا تو وہ اپنے عریف کی طرف رجوع کرتا اور وہ اسے بتا دیتا، اور جب عریف غلطی کرتا تو وہ حضرت ابو الدرداءؓ کی طرف مراجعت کرتا اور آپ اس کی تصحیح فرما دیا کرتے تھے ایک دن حضرت ابو الدرداءؓ نے اپنے ان طالب علموں کا شمار کیا تو ان کی تعداد سولہ سو نکلی[1] حضرت عمرؓ کے زمانہ میں باقاعدہ مکاتب کھولے گئے، اور ان کی نگرانی کے لیے آدمی مقرر کئے گئے، چنانچہ آپ نے ابوسفیان نامی ایک شخص کو چند آدمیوں کے ساتھ اس کے لیے مقرر کیا کہ وہ مکاتب میں جا جا کر طالب علموں کا امتحان لے اور جسے قرآن شریف یاد نہ ہو اسے سزا دے[2] ان مکاتب میں قرآن شریف کے ساتھ عربیت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی الغرض خلافتِ راشدہ میں تعلیم و تعلم کا چرچا عام ہو گیا اور خانگی مکاتب سے لے کر مساجد و جوامع تک میں بچوں اور بڑوں کی دینی تعلیم کا معقول انتظام ہوا۔

اگرچہ عہد رسالت میں صحابہ کے گھروں میں بھی بچوں کی تعلیم ہوتی تھی مگر اس کی حیثیت خانگی اور شخصی تھی، البتہ خلافتِ راشدہ میں بچوں کی تعلیم کے لیے باقاعدہ مکاتب جاری کئے گئے، مگر ان کے لیے مستقل عمارت کا پتہ نہیں چلتا، ان میں قرآن، قراءت، کتابت، نحو اور لغت کی تعلیم کا انتظام ہوتا تھا، ایسے ابتدائی مدارس کو کتاب اور مکتب کہتے تھے، لسان العرب میں ہے۔

الکتاب موضع التعلیم والجمع الکتاتیب کتاب تعلیم کی جگہ کو کہتے ہیں، اس کی جمع کتاتیب والمکاتیب ..... قال المبرد المکتب اور مکاتیب ہے، اور مبرد کا قول ہے کہ مکتب موضع التعلیم والمکتِب المعلم والکتاب درسگاہ ہے اور مکتِب معلم ہے اور جو بچے تعلیم الصبیان، من جعل الموضع الکتاب حاصل کرتے ہیں ان کو کتاب کہا جاتا ہے۔

[1] الحقوق والواجبات ص شیخ عبد القادر جزائری، الاغانی جلد ۹ ص ۵ بحوالہ

فقد أخطأ[1] — اور جس نے درس گاہ کو کتاب سمجھا اس نے غلطی کی۔

اس دور میں ان مکاتب کی بڑی اہمیت تھی، امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے شیخ سفیان بن عیینہؒ کو دیکھا کہ ایک مکتب کے دروازے پر کھڑے ہیں، میں نے دریافت کیا کہ آپ اس جگہ کیوں کھڑے ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔

احب ان اسمع کلام ربی — میں چاہتا ہوں کہ اس بچے کی زبان سے اپنے

من فم هذا الغلام۔ — رب کا کلام سنتا رہوں۔

معلموں کی اجرت

ان مکتبوں میں بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی، اور ان کے معلموں کے لیے باقاعدہ خلافت کے بیت المال سے ماہانہ تنخواہ مقرر تھی، اور خلافت ہی کی طرف سے ان کے لیے نگراں بھی مقرر تھے، اور اونچی تعلیم عام طور سے مسجدوں اور گھروں میں ہوتی تھی اور یہی مدارس کا کام دیتے تھے، بعد میں یہی طریقہ باقی رہا اور ان میں اجلۂ صحابہ درس دیتے تھے، جن صحابہ کو حضرت عمرؓ نے مختلف شہروں میں دین کی تعلیم کے لیے بھیجا تھا ان کے لیے بیت المال کے عام وظائف کے علاوہ تعلیم پر کوئی وظیفہ مقرر نہیں تھا عام تابعین نے بھی قرآن و حدیث اور شرائع اسلام کی تعلیم پر اجرت نہیں لی، مجاہد کا بیان ہے کہ میں عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کے پاس سونا لایا تو انہوں نے اس کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کر کے واپس کر دیا اور کہا کہ شاید تم تعلیم کی اجرت دینا چاہتے ہو[2] ابو عبد الرحمن سلمی کی خدمت میں عمرو بن حریث نے کچھ چیزیں اس لیے بھیجیں کہ وہ ان کے بچوں کی تعلیم دیتے تھے، تو عبد الرحمن سلمی نے یہ کہہ کر ان کو واپس کر دیا کہ تم ان کو لے جاؤ ہم اللہ کی کتاب کی تعلیم پر اجرت نہیں لیتے ہیں[3] ضحاک بن مزاحم نے اپنا ذاتی مکتب جاری کیا تھا جس میں قرآن و حدیث کے علاوہ عربیت کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے، مگر اجرت نہیں لیتے تھے[4] اسی طرح عبد اللہ بن حارث بھی تعلیم پر اجرت نہیں لیتے تھے[5] مگر مکتبوں کے معلم و مدرس عام طور سے اجرت لیتے تھے، کیونکہ نہ ان کی مالی حالت زیادہ بہتر ہوتی تھی۔ اور نہ وہ خاص علمی اور دینی مقام کے

---

[1] لسان العرب مادہ کتب، [2] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۷۵، [3] ر ج ۶ ص ۱۹۵، [4] معارف ابن قتیبہ ص — و طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۱۰۱ [5] ر ج ۶ ص ۲۱۳۔

مالک ہوتے تھے، ان میں سے بعض تو گھر گھر کی روٹیاں بھی لیتے تھے حجاج کا باپ یوسف اور خود حجاج اپنے ابتدائی زمانہ میں طائف کے مکتب میں پڑھاتا تھا اور اجرت میں روٹیاں لیا کرتا تھا، ابو البیدار ریاحی بدوی بصرہ میں اجرت پر بچوں کو تعلیم دیتا تھا۔

چند مشہور معلمین

اس زمانہ میں جو لوگ خاص طور سے معلمی کا کام کرتے تھے اور اس ۔ بارے میں مشہور تھے ان میں سے کچھ کے نام ابن قتیبہؒ نے کتاب المعارف میں گنائے ہیں، انھوں نے لکھا کہ ابو صالح بچوں کو تعلیم دیتے تھے، ابو عبد الرحمن سلمی دونوں آنکھ سے معذور تھے اور معلمی کرتے تھے۔ معبد جہنی قدری بھی معلم تھا، سفیان بن عیینہ کا بیان ہے کہ ضحاک بن مزاحم اور عبد اللہ بن حارث تعلیم دیتے تھے مگر اجرت نہیں لیتے تھے، قیس بن سعد، عطار بن ابی رباح، ابو امیہ عبد الکریم، حسین معلم، قاسم بن مخیمرہ ہمدانی، کمیت بن زید شاعر کا پیشہ معلمی تھا، خلف الاحمر کا بیان ہے کہ میں نے کوفہ کی مسجد میں کمیت کو بچوں کو تعلیم دیتے ہوئے دیکھا ہے، عبد الحمید الکاتب، ابو البیدار، ابو عبد اللہ الکاتب حجاج بن یوسف طائف میں معلم تھا اور اس کا باپ بھی یہی کام کرتا تھا، علقمہ بن ابو علقمہ کا ایک مکتب تھا جس میں عربیت، نحو اور عروض کی تعلیم دیتے تھے، انہوں نے امام مالک سے روایت بھی کی ہے، ابو معاویہ نحوی محدث ہونے کے باوجود داؤد بن علی کے بچوں کو پڑھاتے تھے[۱]

خلفاء و امراء کے خصوصی معلمین و مودبین

خلفاء و امراء اور صاحب حیثیت افراد اپنے گھروں میں معلموں اور مودبوں کو بلا کر اپنی اولاد کی خصوصی تعلیم کا انتظام کرتے تھے، بنو امیہ کے یہاں بھی اس کا رواج تھا مگر وہ معلمین و مودبین کے انتخاب میں عربیت کا خاص خیال رکھتے تھے اور عجمیت سے بہت زیادہ گھبراتے تھے، کیونکہ مجموعی اعتبار سے ان کا مزاج خالص عربی و اسلامی تھا، خلفائے بنی عباس اور ان کے امراء میں دیگر امور کی طرح اس بارے میں بڑی وسعت نظر تھی، اور وہ معلموں اور مودبوں کے انتخاب میں ان باتوں کا خیال نہیں کرتے تھے، ابو جعفر منصور عباسی نے ایک مرتبہ امام مالکؒ سے خواہش کی کہ آپ میرے لڑکوں کو تعلیم دیا

---

[۱] کتاب المعارف ص ۱۳۵، ۱۳۹۔

کریں مگر دوسرے طلبہ شریک درس نہ ہوں، امام صاحب نے خلیفہ منصور کی یہ درخواست منظور نہیں کی، منصور نے اپنے لڑکے مہدی کی تعلیم کے لیے انساب و عربیت کے مشہور عالم شرقی بن قطامی کو مقرر کیا تھا، امام ادب و لغت مفضّل ضبّی[2] بھی مہدی کو تعلیم دیتے تھے، اور انہوں نے اس کو پڑھانے کے لیے معیاری اشعار کا ایک منتخب مجموعہ تیار کیا تھا جو اب مفضّلیات ضبی کے نام سے مشہور کتاب ہے، امام نحو کسائی ہارون رشید کے لڑکے امین کے معلم تھے[3] ابو محمد یزیدی خلیفہ مہدی کے ماموں یزید بن منصور کو پڑھاتے تھے، اسی مناسبت سے یزیدی کی نسبت سے مشہور ہوئے[4] نیز یزیدی مامون کو ادب پڑھاتے تھے، فرار نحوی خلیفہ مامون کے دونوں لڑکوں کو پڑھاتے تھے، اور مشہور امام لغت عربیت ابن سکیت ابن طاہر کے بچوں کو ادب کی تعلیم دیتے تھے، ان خلفاء و امراء کے درباروں سے متعلق معلمین کو شاہی وظیفہ کے طور پر بڑی بڑی تنخواہ ملتی تھی۔

مگر عام مکاتب مسلمانوں کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوئے اور ان کی افادیت کے پیش نظر مقام پر ان کا انتظام و اہتمام کیا گیا، اور آبادیوں کے علاوہ صحراؤں اور میدانوں میں مکاتب قائم کیے گئے، چنانچہ ابو مزوان عکلی اعرابی بادیہ اور صحراہیں تعلیم دیتا تھا، ا فار بن لقیط بدوی ایک عام بیٹھ کر اپنے شاگردوں کو تعلیم دیا کرتا تھا اور ابومالک عمرو بن کرکرہ اعرابی بھی بادیہ کا معلم تھا، اصبہان میں دینی تعلیم اور اسلامی علوم کے رواج دینے کا سہرا ابومسلم خراسانی کے گورنر عاصم بونس کے میر منشی سعد بن ایاس کے سر ہے، جو سرکاری کاغذات کو فارسی سے عربی میں منتقل کرتا تھا، رستہ کا بیان ہے کہ سعد بن ایاس نے اصبہان کے مسلمانوں کا امتحان لیا تو صرف تیس آدمی لکھے پڑھے نکلے، اور ان میں صرف تین حافظ قرآن تھے، اس کے بعد اس نے تعلیم قرآن کا ایسا معقول انتظام کیا کہ سال پورا ہونے سے پہلے ہی عام لوگوں نے قرآن کو سیکھ لیا اور اسے حفظ کر لیا، (الاعلاق النفیسہ)

ائمۂ دین اور دیگر علمائے علم و فن کی درسگاہیں

اس دور میں ایک طرف امراء و عوام اپنے خاص خاص مکتبوں اور مدرسوں میں بچوں کو قرآن

---

[1] الفہرست ص ۱۰۲، [2] ص ۱۰۲، [3] الفہرست ملاحظہ ہو علی الترتیب ص ۶۵ و ص ۶۶۔

۔۔۔ و قراءت، حافظہ، کتابت، حساب اور نحو و ادب وغیرہ کی عام تعلیم دیتے تھے اور دوسری طرف
۔۔۔ صحابہ و تابعین اپنے کاشانوں اور جوامع و مساجد میں کتاب و سنت، تفقہ اور شرائع اسلام
۔۔۔ تعلیم دے رہے تھے، ان کے یہاں عام طور سے اجرت اور تنخواہ کا سوال نہیں تھا۔ ان کی بدولت
۔۔۔ اسلام میں اسلامی علوم و معارف کی تبلیغ و اشاعت ہو رہی تھی، حضرت سعید بن مسیبؒ مسجد
۔۔۔ ی میں تعلیم دیا کرتے تھے، حضرت قاسم بن ابوبکرؒ اور حضرت سالم بن عبد اللہؒ کے حلقہا ئے
۔۔۔ ں مسجد نبوی میں ایک ہی جگہ قائم ہوتے تھے۔ ان دونوں حضرات کے بعد حضرت عبد الرحمن بن
۔۔۔ م اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے اسی جگہ اپنا حلقۂ درس قائم کیا، اور ان کے بعد اسی جگہ پر حضرت
۔۔۔ م مالکؒ نے اپنا حلقۂ درس قائم کیا، یہ مقام قبر شریف اور منبر شریف کے درمیان خوخۂ عمر کے
۔۔۔ ن تھا[1] امام شافعیؒ کے زمانہ میں حرم مکی میں علماء و محدثین کا حلقۂ درس قائم ہوتا تھا، آپ
۔۔۔ ت سے نکل کر اسی حلقہ میں شامل ہوئے[2] امام ربیعہ رائیؒ مسجد نبوی میں درس دیتے تھے جس میں
۔۔۔ م مالک اور دیگر اعیان و اشراف مدینہ شریک ہوتے تھے اور طلبہ ہر وقت امام ربیعہ کو گھیرے
۔۔۔ تے تھے[3] بصرہ کی جامع مسجد میں امام حسن بصریؒ کا حلقۂ درس قائم ہوتا تھا، رئیس المعتزلہ واصل
۔۔۔ عطاء امام صاحب کے اسی حلقہ درس میں شریک ہوتا تھا اور آپ سے اختلاف کر کے الگ ہو گیا
۔۔۔ ن نے اسی مسجد میں اپنا حلقہ قائم کر لیا، بصرہ کی جامع مسجد میں مختلف علوم و فنون کے اساتذہ
۔۔۔ حلقے بھی ہوا کرتے تھے اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق لوگ جس میں چاہتے شریک ہوتے تھے، حماد
۔۔۔ سلمہ بسا اوقات امام حسن بصریؒ کے حلقہ سے اٹھ کر علمائے عربیت کے حلقوں میں بیٹھ جاتے
۔۔۔ بغداد میں فجر کی نماز کے بعد امام کسائی کی مجلس ہوتی تھی جس میں فراء، خلف الاحمر، ابن سعدان
۔۔۔ ائمۂ نحو و عربیت کا اجتماع ہوتا تھا۔ ابو عبیدہ بصرہ کی مسجد میں ایک ستون سے لگ کر بیٹھ جاتے
۔۔۔ ابو محمد یزیدی اور خلف الاحمر، دوسرے ستون سے لگ کر بیٹھا کرتے تھے، امام شافعیؒ نے مصر کی
۔۔۔ عمرو بن عاص میں اپنا حلقۂ درس قائم کیا تو شعر و ادب کے طلبہ کے لیے بھی ایک خاص وقت مقرر

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۴۲، [2] مناقب الشافعی رازی ص ۔۔، [3] ابن خلکان، ذکر ربیعۃ الرائی۔

کیا جس میں دوسرے طلبہ نہیں ہوا کرتے تھے۔

خالص علمی و تحقیقی مجالس

ملکی فتوحات اور دوسری قوموں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے مسلمانوں میں ذہنی وفکری وسعت پیدا ہوئی اور منقولات کے پہلو میں معقولات نے بھی جگہ پائی جس کا لازمی نتیجہ آراء و افکار اور نظریات وخیالات میں اختلاف تھا، پھر خالص اسلامی علوم میں بھی فقہاء و محدثین کے الگ الگ نقطہائے نظر کی وجہ سے اہل حجاز اور اہل عراق کے دو مکاتیب فکر بنے تیزاسی دور میں مرجیت، قدریت، جبریت، اور اعتزال وغیرہ کے افکار مذہبی راہ سے سیاست کے میدان میں آئے، اور علماء نے علم وفن کے ساتھ ساتھ خلفاء و امراء نے ان کے باہمی علمی اور فکری اختلافات ختم کرنے کی کوشش کی اور بعض شعوری یا غیر شعوری طور سے جانبدار بن گئے ان میں سے بعضوں نے امت مسلمہ کو ایک فقہ پر جمع کرنے کی کوشش کی، بعضوں نے مختلف فیہ مسائل کے تصفیہ کے لیے بحث و مناظرہ کی مجلسیں منعقد کیں اور علماء کو دربار میں بلا کر مناظرے کرائے، ہم ایسی علمی و دینی مجلسوں کو آج کی اصطلاح میں مجلس" تحقیقات شرعیہ" "مجلس تحقیقات اسلامی" "اسلامک اسٹڈیز" اور" اسلامی سیمنار" کہہ سکتے ہیں، اس سلسلہ میں سب سے پہلا اہم کارنامہ حضرت عثمان کا ہے کہ آپ نے جب دیکھا کہ قرآن کی بعض قراءات میں لوگ اختلاف کرتے ہیں تو قرآن اور اس کی قراءتوں کے ماہر صحابہ اور حفاظ قرآن کو جمع کر کے قرآن کا ایک مستند نسخہ مرتب کرایا اور اس کی نقل مختلف دیار و امصار میں روانہ کی، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے والد عبد العزیز بن مروان امیر مصر نے مصحف عثمانی کو سامنے رکھ کر نہایت حزم و احتیاط سے قرآن کا ایک نسخہ مرتب کیا اور اعلان کیا کہ جو شخص اس میں ایک غلطی نکالے گا، اسے ایک گھوڑا اور تیس دینار نقد انعام دیئے جائیں گے چنانچہ ایک حافظ قرآن نے اس میں ایک غلطی نکالی اور نعجۃ کی جگہ نجعۃ لکھا ہوا دکھایا، اور انعام حاصل کیا، خود حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس سلسلہ میں نہایت زریں کارنامہ انجام دیا ہے آپ نے اپنے دورِ خلافت میں احادیث نبوی کے ذخیروں کو یکجا کرنے کا حکم دیا اس سے پہلے مدینہ منورہ کی گورنری کے زمانہ میں فقہائے مدینہ آپ کے مصاحب و ندیم تھے، خلفائے عباسیہ میں مامون پہلا

ہے جس نے علمائے دین کی علمی مجلس قائم کر کے ان کے اختلافات کو ختم کرنا چاہا، دوسرے عباسی خلفاء نے بھی اپنے درباروں میں ائمہ علم و فن کو جمع کیا، اور اپنے سامنے مختلف مسائل میں مباحثہ کرایا، اس میں علماء کے مختلف طبقے شریک ہوتے تھے، مامون نے ایک مرتبہ حکم دیا کہ بغداد شہر کے فقہاء و متکلمین اور دوسرے اہل علم جمع کئے جائیں تاکہ ان سے علمی و دینی مسائل میں گفتگو کی جائے، چنانچہ ایک سو فقہاء بلائے گئے، پھر ان میں سے دس علماء منتخب کئے گئے جو مامون کے ندیم و مصاحب ہوئے اسی طرح اس نے ادباء کی ایک جماعت کو اپنے دربار کے لیے منتخب کیا تھا، ایک مرتبہ ایک علمی مجلس سے متاثر ہوکر مامون نے کہا:۔

إنی لأرجوان یکون مجلسنا هذا	اللہ کے فضل و کرم اور اس کی توفیق سے مجھے امید
بتوفیق الله وتائیدہ علی اتمامه	ہے کہ ہماری یہ علمی مجلس اس بات کا سبب
سببًا لاجتماع هذہ الطوائف علی	بنے گی کہ علماء ایسی چیز پر متفق ہو جائیں جو
ماهوارضی واصلح للدین۔	دین کے حق میں زیادہ بہتر اور مناسب ہے

ابو جعفر منصور نے امام مالکؒ سے کہا تھا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں آپ کی کتاب مؤطا کو خلافت کی طرف سے نقل کراکر مختلف ممالک میں بھیج دوں تاکہ لوگ اسی پر عمل کریں مگر امام مالکؒ نے کہا کہ علماء کے پاس دوسرے طریقوں سے جو صحیح احادیث پہونچی ہیں ان پر بھی تو امت کا عمل ہونا چاہیے، میں اپنا علم سب کے سر ڈالنا نہیں چاہتا، خلفاء اور امراء کی ان علمی اور تحقیقی مجلسوں میں نہایت اہم مسائل زیربحث آتے تھے، مختلف علوم و فنون کے علماء میں بحث و مباحثہ کی مجلسیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں ہر طبقہ کے علماء اپنے اپنے ذوق اور فن کے مسائل پر کھل کر بحث کرتے تھے، ایسی خالص علمی و تحقیقی مجلسوں کے تذکرے کتابوں میں موجود ہیں اور ان کے حالات میں مستقل کتابیں لکھی گئیں ہیں، چنانچہ مجالس علماء نامی کتاب حال ہی میں دولت کویت کی طرف سے شائع ہوئی ہے، جس میں ایسی ہی بہت سی تحقیقی مجالس کا تذکرہ ہے، مکاتب و مدارس اور جوامع و مساجد کے تعلیمی مشاغل کے بعد ان خالص علمی و تحقیقی مجالس کی وجہ سے اسلامی علوم و معارف اور مسلمانوں کے علم و فن کو

بڑا وسیع میدان مل گیا مگر ان میں فقہاء و محدثین کے مقابلہ میں عقلاء و فلاسفہ اور متکلمین زیادہ شریک ہوتے تھے، اور اپنے فکر و فن کی جولانی دکھاتے تھے۔

موجودہ طرز کے مدارس کی ابتداء تیسری صدی کے وسط تک اسلامی علوم اور فنون کی تعلیم و اشاعت کے یہی مرکز تھے جن میں موجودہ دور کی درسگاہوں، اور دانش گاہوں کی طرح باقاعدگی نہیں تھی، پھر بھی یہ عجیب بات ہے کہ یہی دور اسلامی علوم و معارف کے شباب کا زمانہ ہے، اسی دور کے علماء و ائمہ اور ان کی کتابیں بعد کے ادوار میں سند و ماخذ قرار پائیں اور بعد میں آنے والے علمائے اسلام نے اسی چمن کی گل چینی کر کے اپنے گلدستے سجائے جہاں تک ہمیں معلوم ہے موجودہ مدارس کا نقشہ سب سے پہلے خلیفہ عباسی معتضد باللہ (۲۷۹ھ تا ۲۸۹ھ) کے خیال میں آیا اور اس نے علم کی اونچی اور معیاری تعلیم کے لیے عمارت بنوائی، اور اعلیٰ مدرسین کا انتظام کیا مگر یہ نقش اول تھا جو نقش ثانی سے کافی مختلف تھا، علامہ مقریزی نے کتاب الخطط والآثار میں لکھا ہے:

ان الخليفة المعتضد بالله لما اراد بناء قصره فى الشماسية ببغداد استزاد فى الذرع بعد ان فرغ من تقدير ما اراد، فسئل عن ذلك فذكر انه يريد ليبني فيه دورا ومساكن ومقاصير يرتب فى كل موضع رؤساء كل صناعة ومذهب من مذاهب العلوم النظرية والعلمية ويجرى عليهم الارزاق السنية ليقصد كل من اختار علما او صناعة رئيس ما يختاره فيأخذ عنه[1]	جب خلیفہ معتضد باللہ نے بغداد کے محلہ شماسیہ میں اپنا محل بنوانا چاہا تو ضرورت سے زیادہ زمین نپوائی۔ اس کی وجہ دریافت کی گئی تو بتایا کہ میں اس زائد زمین میں مکانات حجرے اور خاص خاص کمرے تعمیر کروں گا اور ان میں ہر نظری و علمی علم و فن اور ہر مذہب کے بڑے بڑے اساتذہ کو رکھ کر ان کو بھاری تنخواہ دوں گا تاکہ جو شخص علم و فن کو حاصل کرنا چاہے، اسکے ماہر و مستند عالم سے استفادہ کرے

[1] کتاب الخطط والآثار ج ۲ ص ۳۶۲۔

معتضد کا یہ دارالعلم ہارون رشید کے بیت الحکمہ کی طرح علمی و تحقیقی مرکز تھا جس میں فلسفہ اور علم کلام وغیرہ کے بارے میں مستند تعلیم کا انتظام تھا، ساتھ ہی مذہبی علماء و اساتذہ بھی اس میں رکھے گئے تھے، مگر یہ موجودہ مدارس سے مختلف تھا اور اس میں علامہ مقریزی کی محتاط عبارت کی رو سے خالص دینی علوم کا انتظام کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا، اور موجودہ شکل کے مدارس کی تعمیر چوتھی صدی کے بعد ہوئی، اور اس میں اولیت کا سہرا باشندگان نیسا پور کے سر ہے، علامہ مقریزی کا بیان ہے۔

ان المدارس مما حدث فی الاسلام	مدارس کی ایجاد اسلامی دور میں ہوئی، صحابہ
ولم تکن تعرف فی زمن الصحابۃ ولا	اور تابعین کے زمانہ میں موجودہ مدارس نہیں
التابعین، وانما حدث عملها بعد الاربعمائۃ	تھے، بلکہ چوتھی صدی ہجری کے بعد ان کا وجود
من سنی الھجرۃ، واول من حفظ	ہوا، اور مدرسہ کے سب سے پہلے بانی اہل
عنہ انہ بنی فی الاسلام اھل نیسابور	نیسا پور ہیں، جہاں سب سے پہلے مدرسہ
فبنیت بها المدرسۃ البیھقیۃ[1]	بیہقیہ کی بنیاد ڈالی گئی۔

اس کے بعد پورے عالم اسلام میں تیزی کے ساتھ بڑے بڑے مدارس قائم کئے گئے اور پہلے کی تمام تعلیم گاہوں کے علوم و فنون ان ہی میں سمٹ آئے، اور بغداد کے مدرسہ نظامیہ اور مدرسہ مستنصریہ کے علاوہ سینکڑوں اسلامی مدارس علوم و علماء اور اساتذہ و تلامذہ کے مرکز بن گئے،

---

[1] کتاب الخطط والآثار ج ۲ ص ۳۶۲۔

(۶)

ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم اور علماء

اسلام نے جس قدر علم دین پر زور دیا ہے، مسلمانوں نے اسی قدر اسے حاصل کیا ہے، دنیا کی کوئی اگلی پچھلی قوم مجموعی اعتبار سے اس بارے میں بھی مسلمان قوم کی ہمسری نہیں کرسکتی ہے، ہر طبقہ اور ہر پیشہ سے تعلق رکھنے والوں نے علم دین کو اپنی میراث سمجھ کر حاصل کیا ہے، اور قول رسول "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ" کو اصول بنا کر ہر زمانہ میں دینی علوم و معارف کو اصل سرمایۂ افتخار سمجھا، مسلمانوں نے کوئی پیشہ کیا، کوئی روزگار کیا اور کوئی کام کیا وہ علم دین سے جدا نہیں ہوئے، بلکہ معاشی کاروبار کے ساتھ علمی کاروبار کو جاری رکھا، اور ثابت کردیا کہ جس طرح ہر انسان کے لیے اس دنیا میں کسب معیشت ضروری ہے اسی طرح علم دین بھی ضروری ہے، اور دین و دنیا کی جامعیت ہر مسلمان کی زندگی کا بہترین مظہر ہے، اسی طرح چرواہوں نے اپنی چراگاہ کو حکمت و معرفت کا مدرسہ بنایا، کاشت کاروں نے اپنے کھیتوں میں علم و فضل کی کاشتکاری کی، کارخانہ داروں اور مزدوروں نے اپنے کو علم کے سانچے میں ڈھال کر مخدومیت کا شرف حاصل کیا، کاریگروں نے اپنی دست کاری اور صنعت حرفت کے جھمیلوں میں قال اللہ وقال الرسول کا شغل جاری رکھا، اور تاجروں نے اپنی دکانوں سے علم دین کی متاع گراں مایہ مفت لٹائی۔

ـــــــــــــ

لہ یہ مقالہ جب "البلاغ تعلیمی نمبر" میں نکلا تو حضرت مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی نے اس کے مقالات کو خاص طور سے ذکر کر کے اس مقالہ کو پہلے نمبر پر رکھا اور لکھا کہ "ان میں سے پہلا مقالہ پڑھ کر اچھے پڑھے لکھوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں" (صدق ۵ار فروری ۱۹۵۵ء) اور حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم نے لکھا کہ "مولانا اطہر کے مضامین مندرجہ البلاغ معلوماتی ہوتے ہیں دل چسپی کے ساتھ اپنے بیماری کی حالت میں اسے پڑھتا ہوں" (مکتوب مولانا گیلانی ۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۵ء تا مندرجہ البلاغ مارچ ۱۹۵۶ء)

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اسلام میں رزقِ حلال کے لیے کوئی پیشہ اختیار کرنا باہمی
یق کا باعث نہیں ہے، اور کوئی صنعت و حرفت اپنی معاش و معیشت کے لیے انتخاب کرنا معیوب
یں ہے، اسلام میں پیشہ کی حیثیت وسیلۂ رزق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، کوئی پیشہ ذاتی ہو یا خاندانی
معیوب نہیں ہے، پیشہ کی طرف نسبت کرنا عجم کی پیداوار ہے، اور پھر اسے باہمی فرق و امتیاز
عث قرار دینا عجمی ذہن و مزاج کی بات ہے، جس کا رواج بہت بعد میں عجم میں ہوا علامہ سمعانی
کتاب الانساب میں ایک مقام پر تصریح کی ہے کہ

قد جرت العادة فی عدة من البلاد
ینسب اهلها الی الحرف مثل
رزم وجرجان، وآمل، وطبرستان[1]

خوارزم (خیوہ روس) جرجان، آمل اور طبرستان
وغیرہ کے چند شہروں اور ملکوں میں عادت چل
پڑی ہے کہ وہاں کے باشندے حرفتوں اور
پیشوں کی طرف نسبت کرنے لگے ہیں۔

پیشوں کی طرف نسبت ایک علاقہ کے باشندوں کی عادت تھی جس نے آگے چل کر امت میں
ن فتنہ کی شکل اختیار کر لی مگر شریعت میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہم مختلف پیشوں اور طبقوں کے چند علمائے دین اور ائمہ اسلام کے حالات پیش کرتے ہیں
ذات پر قیامت تک اسلامی علوم اور مسلمان قوم کو ناز رہے گا، اور الحمد للہ کہ آج بھی مسلمانوں
یہاں علم دین اسی طرح عام ہے۔

اہوں میں علم و علماء

مسلمانوں نے عہد رسالت ہی میں چراگاہوں اور میدانوں کو اسلام کی کھلی ہوئی یونیورسٹی بنا دیا تھا، جس میں چرواہے تعلیم پاتے تھے۔

ل اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نبی امی ہونے کا روشن کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی ہی میں علم
ق مسلمانوں میں اس قدر عام فرما دیا تھا کہ اونٹوں کے چرواہے میدانوں اور ریگستانوں میں
ٹ کے چرانے کے ساتھ دینی علوم کی تحصیل کرتے تھے، چنانچہ حضرت براء ابن عازبؓ کا بیان ہے۔

[1] کتاب الانساب ورق ۳۹۲ طبع لندن۔

قال ما كل الحديث سمعنا من رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يحدث اصحابنا وكنا مشتغلين فى رعاية الابل [1]

ہم لوگوں نے رسول اللہؐ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ساری حدیثیں نہیں سنی ہیں، بلکہ ہمارے دوست احباب ان کو ہم سے بیان کرتے تھے اور ہم لوگ اونٹوں کے چرانے میں مشغول رہا کرتے تھے۔

مسلمان جرواہوں نے دنیا میں علمی زندگی اور علمی ذوق کا کس قدر اونچا معیار قائم کیا اور انہوں نے علم دین کی تعلیم کے لیے کیا انتظام کیا تھا، اگر علوم اسلامیہ کے ان گلہ بانوں کا یہ ا... واہتمام نہ ہوتا تو علم دین کی کتنی قدریں دوسری راہ پے ہوتیں اور آج ہم ان سے مستفیض نہ ...

کسانوں میں علم اور علماء

میدانوں اور ریگستانوں کی طرح کھیت اور باغ باغیچے بھی عہد ... ہی میں اسلامی مکاتب و مدارس بن گئے تھے، اور اس دور کے ... اور باغبانوں نے اپنی جائداد اور زمین کی کاشت اور نگہداشت کے ساتھ علم دین کی کاشت ... کا ذمہ بھی لے لیا تھا اور مالک و مزدور اپنے ذاتی کام کے ساتھ علمی کام بھی کیا کرتے تھے، مدینہ منورہ میں صحابہ کرام جس شان سے کھیتی باڑی کرتے تھے اسی شان سے تعلیمی کام بھی کرتے ... حضرات نے ایسی ترکیب نکالی تھی جس سے نہ کھیتی باڑی میں رکاوٹ ہو اور نہ دینی تعلیم میں ح... ہو، اس کے لیے کچھ ایسے خاص آدمی مقرر کیے تھے، جو باری باری رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ک... میں حاضر ہوا کرتے تھے، اور وہاں سے واپس آکر آپ کی حدیثیں بیان کرتے تھے، اسی ... شخص کو درگاہِ رسالت میں باری باری سے شرف باریابی کا موقع بھی ملتا تھا اور کھیتی باڑی کا نق... نہیں ہوتا تھا، اور نہ ہی دینی تعلیم میں کسی قسم کی کوتاہی ہوتی تھی، حضرت براءؓ ہی سے ... روایت یہ ہے،

ليس كلنا يسمع حديث رسول الله ہم سب لوگ رسول اللہؐ کی حدیث براہ را...

[1] المستدرک حاکم کتاب العلم ج ۱ ص ۹۵ طبع حیدر آباد۔

صلی اللہ علیہ وسلم کانت	آپ سے نہیں سنتے تھے کیونکہ ہماری کھیتی باڑی اور
لنا ضیعۃ واشغال، ولکن	دوسرے کام اس کا موقع نہیں دیتے، البتہ اس
الناس کانوا لایکذبون	زمانہ میں لوگ جھوٹ نہیں بولتے تھے اس لئے
یومئذٍ فیحدث الغائب	دربار رسالت کے حاضر باش لوگ دوسروں
الشاھد [۱]	سے حدیث بیان کردیا کرتے تھے۔

اسلام نے کس سادگی اور آسانی سے مسلمانوں کے دل میں علم دین کا بیج بودیا تھا، اور وہ اپنی کھیتی باڑی کی آبیاری کے ساتھ علم کی آبیاری بھی کرتے رہتے تھے ان کے کھیتوں کی سرسبزی و شادابی کی طرح ان کے علم کا کشتِ زار بھی سدا بہار رہتا تھا،

دست کاروں میں علم اور علماء

بہت سے مسلمان خاندان جن کے یہاں نسلاً بعد نسلٍ دست کاری اور صنعت گری ذریعۂ معاش تھی، اور صدہا آدمی کاروبار میں مشغول رہتے تھے، ان میں اپنے پیشہ اور کاروبار کی طرح علم دین کا چرچا بھی نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا تھا، اور ان کے علم وفضل کا لوہا دنیا مانتی تھی، ایک ایسے خاندان کا حال علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ "دیوکش" لقب کا علمی خاندان مروشہر میں بہت مشہور ہے، ان لوگوں کو "دیوکش" اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے یہاں ریشم سازی کا کاروبار ہوتا ہے، اور ریشم کے کیڑوں (کوؤں) کو دھوپ میں رکھا کر ان سے ریشم نکالا جاتا ہے، فارسی میں ان کیڑوں کو "دیو" کہتے ہیں، یہ خاندان بڑا علمی تھا، اور اس میں کئی بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، چنانچہ ابومحمد عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن دیوکش فقیہ، عالم، صالح اور نیک سیرت بزرگ تھے، انہوں نے حدیث کا سماع احمد بن اشر بحری وغیرہ لوگوں سے، اور ابواحمد عبدالرحمٰن اور ابومحمد عبداللہ سے کیا تھا، اور ان کے تلامذۂ حدیث میں علامہ سمعانی کے والد، ابوطاہر محمد بن محمد بن عبداللہ سنجی اور ابوبکر عتیق بن علی غازی وغیرہ ہیں، سنہ ۵۰۰ھ کے حدود میں انتقال کیا، ان کے صاحبزادے محمد بن عبداللہ دیوکش بھی زبردست

---

[۱] المستدرک، باب العلم ج ۱ ص ۱۲۷۔

عالم تھے، علامہ سمعانی نے ان سے ملاقات کی ہے اور ان کے خاندانی واقعات سنے ہیں[1]

پارچہ بافوں میں علم اور علماء

کپڑا بننے والے کو عربی میں حائک اور نساج کہتے ہیں، پارچہ بافوں میں بہت سے علمائے اسلام اور فضلائے امت گزرے ہیں جنہوں نے تانے بانے کی زندگی میں رہ کر علم دین کی چادریں بنی ہیں اور جبہ اسلام کے لیے حلّے اور پیرہن تیار کئے ہیں، اور ان کے "لباس التقویٰ" میں بڑی خیر و برکت پائی گئی ہے، بعض لوگوں نے اس پیشہ کے علماء و مشائخ کے حالات میں مستقل کتابیں لکھی ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں، ابو محمد مجمع بن سمعان نساج تیمی حضرت سفیان بن عیینہؒ وغیرہ کے شیخ ہیں، اپنے زمانہ کے عباد و زہاد میں شمار کئے جاتے تھے، ابو محمد حرب بن عبد اللہ نساج علمائے بصرہ میں بڑے مقام و مرتبہ کے مالک ہیں، تابعی ہیں اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں، آپ نے امام حسن بصری، ثابت بکریؒ، اور عبد اللہ مزنیؒ وغیرہ سے حدیث پڑھی ہے اور آپ سے موسیٰ بن اسمٰعیل بنودی، حماد بن زیدؒ، علی بن عثمان واقفی وغیرہ نے پڑھا ہے، حدیث میں بہت ہی ثقہ مانے گئے ہیں، ابو القاسم بکر بن یحییٰ بن کثیر بن صالح نساج شہر واسط میں رہتے تھے، اور وہیں حدیث کی روایت کی، آپ کے تلامذۂ حدیث میں حافظ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ، اور قاضی ابو العلا محمد بن علاء وغیرہ ہیں سنہ ۳۳۰ھ کے حدود میں انتقال فرمایا، حضرت ابو الحسن خیر بن عبد اللہ نساجؒ اولیا کاملین میں ہیں، سرمن رائی کے رہنے والے تھے مگر مستقل قیام بغداد میں تھا، آپ نے شیخ ابو حمزہ بن ابراہیم صوفی کی صحبت میں فیض اٹھایا اور آپ کی صحبت سے حضرت جنید بغدادی اور ابو العباس بن عطار، اور ابو محمد جریری نے فیض پایا کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم خواصؒ اور حضرت ابو بکر شبلیؒ نے بھی آپ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے، کتابوں میں آپ کے بارے میں عجیب و غریب واقعات

---

[1] کتاب الانساب طبع فوٹو ورق ۲۳۸، اس مقالہ کے اکثر مضامین کتاب الانساب ہی سے ماخوذ ہیں، ویسے اس موضوع پر راقم کی مستقل کتاب تیار ہوچکی ہے جس میں تاریخ و طبقات اور رجال کے ذخائر سے استفادہ کیا گیا ہے، اور کہنا چاہئے کہ مسلمانوں کی معاشی اور علمی تاریخ بن گئی ہے،

ملے ہیں، اور آپ کی فضیلت کے لیے یہی کیا کم ہے کہ آپ کے حلقہ سے جنید و شبلی نکلے ہیں، ابو منصور مقرب بن حسن بن حسین نساج بغدادیؒ نے ابویعلی محمد بن حسین قراز، ابو الحسن محمد بن علی بن مہتدی باللہ، ابو جعفر محمد بن احمد بن مسلمہ وغیرہ سے حدیث کی روایت کی ہے، علامہ سمعانی کو دوسرے اہل علم کے واسطہ سے ان کی روایتیں پہنچی ہیں، اور ان کے اساتذہ و مشائخ نے ان کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے، نہایت نیک و صالح اور بزرگ تھے، قرآن کریم کی تلاوت ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا، ربیع الاول ۵۲۳ھ میں بغداد میں فوت ہوئے، احمد بن مقرب نساج ان کے صاحبزادے ہیں، یہ بھی اپنے والد ماجد کی طرح نہایت بزرگ اور باخدا عالم اور فقیہ تھے، ابو الخطاب نصیر بن احمد قاری، ابو عبد اللہ ابن حسین بن احمد بن طلحہ وغیرہ سے احادیث کا درس لیا تھا علامہ سمعانی نے ان سے حدیث کا سماع کیا تھا[۱]

پارچہ فروشوں میں علم اور علماء کپڑے تاجروں اور پارچہ فروشوں میں بڑے بڑے علماء، فقہاء اور محدثین پیدا ہوتے ہیں اور انہوں نے علم دین کے لیے عمدہ سے عمدہ لباس مہیا کیا ہے، عام پارچہ فروش بزاز کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے اور گاڑھے گزی اور سوت کے موٹے کپڑے بیچنے والے کو کرابیسی کہتے تھے، مصر و دمشق میں تاجران پارچہ کو طاطری کے نام سے یاد کرتے تھے رجال و طبقات کی کتابوں میں بزاز، کرابیسی اور طاطری کی نسبت سے جن علماء کا ذکر ملتا ہے وہ اسی طبقہ سے تھے اور ان کا یہی پیشہ تھا، مثلاً امام ابوسلیمان بصری اودی صاحب الکرابیس، ابو علی حسین بن علی کرابیسی بغدادی، اور ابو الحسن عباد بن لیث صاحب الکرابیس[۲]

سوتی موٹے اور سفید کپڑوں کے تاجر طاطری دمشق میں جامع دمشق کے پاس قطار در قطار بیٹھتے تھے ان میں سے مروان بن محمد طاطری دمشقی نے امام مالک، سلیمان بن بلال، اور یزید بن ... سے حدیث کی روایت کی اور ان سے ان کے لڑکے ابراہیم بن مروان طاطری، محمد بن عبد الرحمٰن جوہری اور شام کے علماء کی ایک جماعت نے علم حاصل کیا، ۲۱۰ھ میں فوت ہوئے، ہیثم بن رافع باہلی طاطری

[۱] الانساب ورق ۵۵۷ و ۵۵۸، [۲] ایضاً ورق ۴۷۶

زبردست عالم دین تھے، بصرہ کے باشندے تھے، حضرت عطار سے حدیث کی روایت کی، اور ان سے ابوسلمہ موسیٰ بن اسمعیل اور قتیبہ بن سعد نے روایت کی[1] یہ چند حضرات بطور مثال کے پیش کئے گئے، ورنہ اس طبقہ اور پیشہ میں بے شمار فقہاء و محدثین گزرے ہیں۔

درزیوں میں علم اور علماء جو لوگ کپڑے کی سلائی کا کاروبار کرتے تھے انکو خیاط یعنی درزی کہا جاتا تھا۔ اس طبقہ میں بھی بے شمار ارباب علم و فضل اور محدث و فقیہ اور ائمۂ دین گزرے ہیں جنہوں نے جسم انسانی کے علم و فضل کی قبائیں سی ہیں اور ظلم و جہالت کو علم و تقویٰ کی پوشاک دی ہے، ابوعبداللہ صالح بن راشد خیاط بصری نے حضرت حسن بصری اور حضرت مالک بن دینار وغیرہ سے روایت کی، اور ان سے حرمی بن عمارہ بنودکی وغیرہ نے روایت کی، ابوسلیمان خیاط حجازی تابعی ہیں اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث کی روایت کی ہے، اور آپ سے زید بن عیاش بن جعدہ وغیرہ نے روایت کی ہے، ابوغالب نافع خیاط بھی تابعین سے ہیں، انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، سالم خیاط حضرت حسن بصری اور محمد بن سیرین کے تلامذۂ حدیث میں سے ہیں، عمران خیاط نے ابراہیم نخعی اور زید بن وہب سے دین علم کی تعلیم حاصل کی اور ان کے تلامذہ میں عبد اللہ بن عون ہیں، ابوالحسن علی بن محمد بن عیسیٰ خیاط مصری "ابن العسرار" کی کنیت سے مشہور ہیں، اپنے زمانہ کے زبردست عالم دین شمار کئے جاتے ہیں، محمد بن میمون خیاط مکی نے امام سفیان بن عیینہ اور امام ابوسعید وغیرہ سے حدیث کی روایت کی، اور ان سے ابوالحسن ساجی اور یحییٰ بن صاعد وغیرہ نے روایت کی، احمد بن موسیٰ ابن ابی عمران خیاط معدّل ہیں یعنی اسلامی عدالت کے گواہوں کی عدالت و ثقاہت کا فیصلہ دیتے تھے اس کے بعد وہ شہادت دے سکتے تھے، انہوں نے سورہ بن حکم، محمد بن عباد بن معاذ عنبری، عبد اللہ بن عبدالوہاب وغیرہ سے روایت کی اور ان سے محمد بن مخلد وغیرہ نے روایت کی ہے[2]۔

علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں ان حضرات کے علاوہ بیسیوں علمائے دین کا تذ

---

[1] الانساب ورق ۳۶۳۔

گیا ہے جو خیاط یعنی درزی تھے اور لکھا ہے کہ جماعة من شیوخنا یعملون عمل الخیاطة یعنی ہمارے شیوخ و اساتذہ کی ایک جماعت سلائی کا کام کرتی ہے۔[1] اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ درزی یا کپڑوں کی سلائی کرنے والوں نے علوم اسلامیہ میں کیا کمال پیدا کیا ہے، اور اسلام کی بزم علم و فضل میں ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔

دھوبیوں میں علم اور علماء

کپڑے کی دھلائی کرنے والے کو قصّار کہتے ہیں، اسلام نے اس طبقہ اور پیشہ میں بھی علم دین کی دولت، یوں پہنچائی کہ ان میں بڑے بڑے علماء فقہاء اور محدثین پیدا ہوئے، جنہوں نے ظاہری اور باطنی کثافتوں کو اپنے علم و معرفت کے آبِ مصفّا سے دھو کر ختم کیا اور انسانیت کو علم و دیانت کا صاف و شفّاف لباس عطا فرمایا، چنانچہ ابوحماص قصّار بہت بڑے عالم دین اور بزرگ انسان تھے، معاویہ بن ہشام قصّار نے امام سفیان ثوری اور امام مالکؒ سے قرآن و حدیث اور دین کا علم حاصل کیا تھا، ابوحاتم نوح بن ایوب بن نوح قصّار بخاری نے حفص بن داؤد ربعی، عبدالرحمن بن محمد بن ہاشم، اسحاق بن حمزہ، ولید بن اسمٰعیل اور سعید بن حیاج سے روایت کی، اور ان سے ابوصالح خلق بن محمد خیام نے روایت کی، ۲۹۳ھ میں انتقال کیا۔ ابواسحاق ابراہیم بن عبداللہ بن اسحاق قصّار اصفہانی کا لقب قصّار اس لیے پڑ گیا کہ آپ زہد و تقویٰ اور اتباع سنت کے جذبہ سے مردوں کو غسل دیا کرتے تھے، اور آخر عمر تک درس حدیث دینے کے ساتھ مُردوں کے غسل و کفن کا کام کرتے رہے۔ ۲۶۷ھ میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے، اور ۱۳۰ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔[2]

موچیوں میں علم اور علماء

عربی میں جوتا بنانے والے کو حذاء کہتے ہیں، اس طبقہ اور پیشہ سے متعلق حضرات نے اسلامی علوم و فنون سے پورا پورا حصّہ لیا اور اسلام نے بہت سے موچیوں کو علم و فضل کی مسند پر جلوہ گر کیا، ان حضرات نے علم دین کے پاپوش میں آفتاب کی کرن لگائی۔ ان جفت ساز علماء نے دین کی شاہراہ پر چلنے چلانے کے لیے مسلمانوں

---

[1] کتاب الانساب ورق ۲۱۴، [2] ؍؍ ورق ۴۵۴۔

کے پائے عزم وثبات کو بڑی استقامت واستواری بخشی، اور دنیا کو دکھا دیا کہ نسل، قوم، ذات برادری، طبقہ اور پیشہ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اصل چیز ہے اسلام کی راہ سے آیا ہوا تقویٰ اور خدا کی دی ہوئی استعداد وصلاحیت، علامہ سمعانی نے لکھا ہے کہ علماء کی ایک جماعت حذاء یعنی جفت ساز یا موچی ہے، مثلاً عبد اللہ بن عبد الرحمٰن بن معاویہ خذاء واسطی جو کہ عبل کے لقب سے مشہور ہیں، جابر حذاء نے ابن عمر بصری سے حدیث کی روایت کی، اور ان سے محمد بن سیرین تابعی جیسے جلیل القدر عالم دین نے شاگردی کی تھی محمد بن سالم حذاء واسطی کا لقب حمدان ہے محدث وفقیہ تھے کثیر بن عبید حمصی حذاء بھی مشہور محدث اور فقیہ ہیں، ابو عقیل یحیٰ المتوکل مدینی حذاء علمائے دین میں سے ہیں ۱۹۷ھ میں فوت ہوئے، ابو اسحاق عاصم بن سلیمان تمیمی حذاء بصری بھی اپنے زمانے کے مشاہیر علماء میں شمار کیے جاتے ہیں[۱]

روغن سازوں میں علم اور علماء

جو حضرات تیل اور روغن تیار کرتے تھے یا ان کی تجارت کرتے تھے، ان کو دھان کہتے ہیں، اس طبقہ اور پیشہ میں بہت سے علماء اور محدثین گزرے ہیں جو روغن فروش تھے، ان کے یہاں اس کے بڑے بڑے کارخانے اور دکانیں تھیں، ساتھ ہی ان کے علم کی ہماہمی بھی رہتی تھی۔ اور کولھو کے چکر کے ساتھ درس وتدریس اور تعلیم وتعلم کا دور بھی ہوتا تھا، حضرت ابو الازہر صالح بن درہم دھان بصریؒ نے علمائے عراق سے حدیث کی روایت کی تھی، اور ان سے امام شعبہ بن حجاج جیسے جلیل القدر محدث نے روایت کی، ابو علی محمد بن حمزہ ابن احمد بن جعفر بن حرب دھان بغدادی کا حال خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے، ابو بکر علی کوفی، اور علی بن عبد الرحمٰن کوفی وغیرہ سے روایت کی، اور ان سے ابو احمد بن علی بن ثابت خطیب بغدادی نے روایت کی، ۴۳۰ھ میں فوت ہوئے، ابو احمد محمد بن عبد اللہ ابن احمد بن قاسم بن جامع دھان بغدادی نہایت بزرگ صالح اور ثقہ محدث تھے حدیث کی تعلیم کے بڑے شیدائی اور حریص تھے، آپ نے ابو رجاء محمد بن حمدویہ سنجی، احمد بن

---

[۱] کتاب الانساب ورق ۱۶۰ الف

بن علاء جوزجانی، قاضی ابوعبداللہ حسین بن اسمٰعیل محاملی، محمد بن مخلد عطار، اور حسین بن یحییٰ بن عیاش قطان وغیرہ سے روایت کی، اور آپ سے ابوبکر برقانی، ابوالقاسم ازہری، ابوالفضل بن داؤد ہاشمی، حسن بن محمد بن عمر نرسی، ابوالحسین محمد بن علی ابن مہتدی باللہ ہاشمی نے روایت کی۔[1]

قصابوں میں علماء اور علماء بکری اور دیگر حلال جانوروں کو ذبح کرکے ان کا گوشت فروخت کرنے والے کو قصاب کہتے ہیں اس پیشہ کے لوگوں میں بے شمار مشاہیر علمائے اسلام گزرے ہیں، اور ان کی ذات سے علوم دینیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا ہے جیسے امام حسن بن عبداللہ قصاب نے حضرت نافع مولیٰ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے علم دین حاصل کیا اور تابعین کرام کے طبقہ علماء میں اپنی جگہ پائی، ابوعبداللہ حبیب بن ابوعمرہ قصاب کوفی نے حضرت سعید بن جبیرؒ سے روایت کی، اور آپ سے امام سفیان ثوری جیسے جلیل القدر امام اسلام نے روایت کی ؎ ۱۴۲ھ میں فوت ہوئے، عبدالعزیز بن موسیٰ قصاب مروزی اہل مرو کے شیخ ہیں، ان کے شیوخ حدیث میں ابوالحسین عبدالرحمٰن بن محمد دہان ہیں، علامہ سمعانی کے دادا ابوالمظفر سمعانی نے ان سے روایت کی ہے، ابورافع بن قصاب اپنے زمانہ کے شیخ شمار کئے جاتے ہیں، ہرات کے باہر محلہ فیروزآباد میں رہتے تھے، ابوعبداللہ محمد بن علی سے حدیث کی روایت کی ہے اور علامہ سمعانی نے شیخ محمد بن جنید کی خانقاہ میں ان سے حدیثیں سنی ہیں، ابوخباب عباد بن ابی عون قصاب مصری نے حضرت قتادہ اور حضرت زرارہ بن ابی اوفیٰ سے روایت کی، اور آپ سے اہل بصرہ نے روایت کی، ابوحمزہ میمون تمار قصاب کوفی حدیث میں امام ابراہیم نخعی، اور امام حسن بصری سے تلمذ رکھتے ہیں اور ان سے عبدالحمید بن منصور بن معتمر، امام سفیان ثوری، اور حماد بن سلمہ نے روایت کی ہے، ابوعبدالکریم عبدربہ قصاب بصری نے ابورجاء عطاردی، اور محمد بن سیرین سے علم حدیث حاصل کیا، آپ کا شمار ممتاز علمائے بصرہ میں ہوتا ہے آپ سے عبدالصمد بن عبدالوارث نے روایت کی، ان حضرات کے علاوہ اور بہت سے قصاب علماء کا تذکرہ علامہ سمعانی نے کیا ہے۔[2]

---

[1] کتاب الانساب ورق ۲۲۴ [2] ایضاً ورق ۴۵۴۔

حلوائیوں میں علم اور علماء مٹھائی بنانے والے کو حلوائی کہتے ہیں اسلام میں جن شیرینی اور مٹھائی بنانے بیچنے والوں نے دین و دیانت کی شیرینی سے مسلمانوں کے کام و دہن کی تواضع کی ہے، اور روح کو لذت بخشی ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، چند حضرات یہ ہیں:

امام ابو محمد عبد العزیز بن احمد بن نصر بن صالح حلوائی جن کا لقب شمس الائمہ ہے احناف کے بہت بڑے امام و مقتدی ہیں اور شمس الائمہ حلوائی کے نام سے مشہور ہیں، ۴۹۸ھ میں مقام کش میں انتقال فرمایا اور بخارا میں لے جا کر دفن کئے گئے، محمد حلوائی بھی زبردست محدث تھے علامہ سمعانی نے لکھا ہے کہ آپ شیخ وقت اور مختلف علوم کے عالم ہیں محدیث اور محدثین کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے، وہ درحقیقت حدیث پر عامل تھے، البتہ فتویٰ علمائے کوفہ یعنی احناف کے مسلک پر دیا کرتے تھے، مقام کش میں وفات پائی، ابو المعالی عبد اللہ بن احمد ابن محمد حلوائی مروزی اپنے کو بزاز لکھتے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مٹھائی فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ پارچہ فروشی بھی کرتے تھے، فقیہ، عالم، اور حافظ حدیث تھے ۵۳۴ھ میں فوت ہوئے، ابو المحاسن عبد الرحیم بن عبد اللہ حلوائی کے بارے میں سمعانی نے لکھا ہے کہ وہ ہمارے قدیم شیوخ میں سے ہیں اور میں نے ان سے بلخ اور مرو میں احادیث کا سماع کیا ہے[1]

اسی طرح بہت سے شیرینی فروشوں نے صرف دودھ اور شکر کی ہی شیرینی نہیں تیار کی ہے بلکہ علم و عمل کی وہ شیرینی بنا کر تقسیم کی ہے جس کی لذت نے مسلمانوں کے ذوق میں بڑی لطافت پیدا کر دی ہے۔

آٹا پیسنے والوں میں علم اور علماء جو لوگ دوسروں کا آٹا پیستے تھے اور ان کے یہاں آٹا کی پسائی کے لیے چکی، پن چکی، اور ہوائی چکی ہوتی تھی اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا ان کو طحان کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مسلم طحانوں میں ایسے ایسے علماء و فضلاء پیدا کئے ہیں جن کی نظیر دوسری قوموں میں نہیں ملتی، انہوں نے چکی چلانے کے ساتھ علم و فن کی مشق میں عجیب عجیب کام کئے ہیں واقعی ان کی طبیعت ایک طرفہ تماشا تھی اور ان کے علم و فضل کی چکی نے وہ فیضان عام جاری کیا ہے کہ بے شمار روحوں کو ان سے غذا ملی، اور جسد ملت میں ان کی علمی و روحانی غذا سے

---

[1] کتاب الانساب ورق ۱۶۸،

تاب و توان آئی، ابوموسیٰ حبیب بن صالح طحّان کا شمار ملک شام کے ممتاز علماء میں تھا، آپ نے زید بن شریح سے روایت کی ہے، اور آپ سے جریر بن عثمان اور ابوہشیم نے روایت کی ہے، خالد بن عبداللہ طحّان واسطی نے حمید الطویل، ابوعثمان اصبحی، عراک بن مالک، مشکان بن ابوعمر، راشد بن سعد سے روایت کی ہے اور آپ سے قتیبہ بن سعید، عمرو بن عون، سعید بن منصور خراسانی صاحب السنن، سعید بن سلیمان وغیرہ نے روایت کی ہے، حضرت امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ خالد طحّان نہایت ثقہ اور دینداری میں صالح و نیک آدمی ہیں، مجھے معلوم ہے کہ انہوں نے تین بار اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کے ہاتھ فروخت کیا ہے، ہمارے نزدیک خالد طحان ہشیم سے زیادہ محبوب و معتمد ہیں، ۱۸۲ھ یا ۱۷۹ھ میں فوت ہوئے، ابویزید رستم طحّان کوفی تابعی ہیں، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث کی روایت کی ہے، ان سے خالد بن مخلد نے روایت کی ہے، ابونعیم ضرار بن ضرر طحّان کوفی نے معتمر اور دراوردی سے روایت کی ہے، کوفہ کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے، فقہ اور فرائض کے عالم تھے[1]

صابون سازوں اور صابون فروشوں میں علم اور علماء

صابون کی نسبت سے وہ علمائے اسلام مشہور و متعارف ہیں جو صابون سازی اور صابون فروشی کرتے تھے یا ان کے آباء و اجداد اس پیشہ سے حلال روزی کماتے تھے، انہوں نے علم کے صابون سے قلب و روح کے میل کچیل کو صاف کیا ہے، اور مسلمانوں کی صورت و سیرت میں ان کی وجہ سے حسن و خوبی کی بڑی قدریں پیدا ہوئی ہیں، امام ابوعثمان اسمٰعیل بن عبدالرحمٰن بن احمد صابونی شیخ الاسلام کے لقب سے مشہور ہیں، آپ مفسر قرآن، محدث، فقیہ، واعظ اور خطیب تھے ساٹھ سال تک اپنے وعظ و نصیحت سے عامۃ المسلمین کی ہدایت کی، اس فن میں یکتائے زمانہ تھے، اور کوئی ہمسر نہیں تھا، تقریباً بیس سال تک نیساپور کے منبر پر خطابت فرمائی، ۴۴۹ھ میں فوت ہوئے، ابویعلی اسحاق بن عبدالرحمٰن صابونی حضرت شیخ الاسلام صابونی مذکور کے بھائی اور زبردست عالم دین ہیں، ابومحمد عبیداللہ بن حسین بن عبدالرحمٰن صابونی فقیہ

---

[1] کتاب الانساب ورق ۳۴۸۔

محدث تھے شام کے شہر انطاکیہ کے رہنے والے تھے ابو محمد عبداللہ بن احمد بن موسیٰ صابونی جرجانی بڑے عابد و زاہد اور اللہ والے بزرگ تھے زہد کی صفت ان کے تذکرے میں خاص طور سے بیان کی گئی ہے' ابو الطیب محمد بن عمر بن سعید صابونی بغدادی بھی اس فن و پیشہ کے علماء میں ہیں[1]

صیقل گروں میں علم اور علماء صیقل گر یعنی قلعی کرنے والے خاندان بھی دوسرے خانوادوں کی طرح علم دین کے گہوارے رہے ہیں' اور انہوں نے زنگ آلود دلوں اور بے رونق روحوں کو علمی و دینی صیقل گری سے چمکایا ہے' ابو سہل نصر بن عبدالملک مزنی بلخی صیقل کا اصل نام عبدالکبیر ہے' آپ نے حضرت امام جعفر الصادق اور حضرت امام ابو حنیفہ اور حضرت امام شعبہ بن حجاج سے حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی' ابو غالب محمد بن غالب بن محمد بن ابراہیم بن احمد صیقل جرجانی نہایت بزرگ' ثقہ نیک اور سیدھے سادے تھے' حسن اخلاق میں شہرت رکھتے تھے' کرمان کے صوفیائے کرام کے پیشوا تھے' شہر دامغان آپ کا وطن تھا' ۳۲۰ھ میں فوت ہوئے' ابو یوسف حجاج بن ابو زینب صیقل مسلمی بھی اس طبقہ کے علماء میں ہیں' اور ابو الحسن علی بن احمد بن سلیمان صیقل معدل مصری ۳۹۲ھ میں فوت ہوئے[2]

شیشہ گروں میں علم اور علماء علمائے اسلام میں بہت سے حضرات کو دنیا زجاجی کے لقب اور نسبت سے یاد کرتی ہے' ان بزرگان دین کے گھرانوں میں شیشے کے سامان و آلات زیبائش و آرائش بنتے تھے اور فروخت ہوتے تھے' اور وہ علم و فضل کی دنیا میں شمس و قمر بن کر یوں چمکے کہ ان کی روشنی آج دنیا کو منور کرتی ہے' شیشہ گروں میں جو حضرات زیادہ مشہور ہیں ان میں سے چند یہ ہیں' ابو القاسم اسمعیل بن محمد زجاجی نے یوسف بن موسیٰ سے حدیث کی روایت کی ہے' اور ان سے احمد بن علی بن ابراہیم بندونی نے روایت کی ہے' محمد بن سعید بن عمرو زجاجی سرخسی نے حدیث کی تعلیم اسحاق بن ابراہیم معدل مروزی سے حاصل کی' اور آپ سے حافظ احمد بن علی بن محمد اصفہانی نے تحصیل علم کی' ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن ابراہیم زجاجی مروزی نے بغداد آکر

---

[1] کتاب الانساب ورق ۳۵۶ و ۳۵۷' [2] ر ورق ۳۵۸ و ۳۵۹۔

ابو حامد احمد بن عباس اور ابو احمد علی بن محمد حبیبی سے حدیث پڑھی اور ان سے ابو بکر محمد بن عبد الملک نے شرف تلمذ حاصل کیا، ابو بکر احمد بن علی بن عبد اللہ بن منصور زجاجی مولد کے اعتبار سے طبری ہیں مگر بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر کے وہیں ابو حفص عمر بن ابراہیم کیانی مقری سے حدیث پڑھی اور ان سے ابو بکر احمد بن علی خطیب بغدادی اور ابو القاسم خلف بن احمد خرقی مصری نے پڑھا۔ عبد الرحمن بن ابو بکر احمد بن علی بن عبد اللہ زجاجی نے ابو احمد فرض بنی بکران وغیرہ سے پڑھا اور ان سے ابو القاسم بن سمرقندی اور ابو بکر انصاری نے پڑھا، ۴۹۰ھ میں فوت ہوئے[1] ان بزرگوں کے علاوہ بہت سے ارباب علم و فضل شیشہ گراں میں گزرے ہیں۔

لوہاروں میں علم اور علماء

علامہ سمعانی نے لکھا ہے کہ حدّاد کی نسبت لوہے کی خرید و فروخت اور لوہے کا کام کرنے کی طرف ہے، اس لقب سے اہل علم کی ایک جماعت مشہور ہے اس لیے کہ ان علماء کے باپ دادا میں کوئی نہ کوئی لوہے کی چیزوں کو بناتا تھا، ان لوہاروں نے بھی علم دین حاصل کر کے علم کے فولاد کو اپنی قوتوں اور سخت جانیوں سے موم بنایا ہے، اور ان کی بھٹیاں صرف لوہے کے گرمانے اور نرم کرنے کے کام نہیں آتی تھیں بلکہ ان میں کام کرنے والے دین و دیانت اور علم و فضل کے نرم گرم حالات کو بھی درست کرتے تھے، چنانچہ ان میں امام ابو بکر محمد بن احمد بن جعفر کنانی حدّاد شافعی مذہب کے بہت بڑے امام و فقیہ اور عالم تھے، مصر کے قاضی تھے۔ فقہ شافعی کی فروعات میں ان کو بڑا عبور حاصل تھا ۳۴۴ھ میں انتقال کیا، حسن بن یعقوب بن یوسف صوفی حدّاد نیساپور کے رہنے والے تھے، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ حسن صوفی پرہیزگار و زاہد تھے، ان کی مستقل خانقاہ تھی اور ان کے گھر میں زاہدوں اور صوفیوں کا مجمع رہا کرتا تھا۔ رجب ۳۳۶ھ میں فوت ہوئے، ابو حفص عمرو حدّاد بھی نیساپور کے صوفیائے کرام میں ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ علم اور تقویٰ دونوں میں خراسان کے بعد والے چند لوگوں میں سے ہیں، ۲۶۴ھ یا ۲۶۷ھ میں نیساپور میں فوت ہوئے، ابو المقدام ثابت بن ہرمز حدّاد

[1] کتاب الانساب ورق ۲۳۴

تبع تابعین میں سے ہیں، حضرت سعید بن مسیّبؒ، حضرت زید بن وہبؒ، اور حضرت سعید بن جبیرؒ جیسے علمائے تابعین سے حدیث پڑھی، اور ان سے ان کے لڑکے عمرو بن ثابت اور حضرت سفیان ثوریؒ اور حکمؒ نے روایت کی ابو بکر احمد بن سندی بن حسن حدّاد، ہمارے ملک ہندوستان کے علاقہ سندھ کے رہنے والے تھے، مگر بغداد میں مستقل قیام تھا، بہت باخدا بزرگ اور محدث تھے، آپ نے فریابیؒ اور محمد بن عباس مودبؒ وغیرہ سے حدیث پڑھی تھی ادریس بن عبد الکریم حدّاد مشہور قاری اور حضرت امام احمد بن حنبل کے تلامذہ میں سے ہیں[1] ان حضرات کے علاوہ اور بہت سے علماء و فقہاء اور محدثین اور دوسرے علوم و فنون کے ماہرین حدّاد گزرے ہیں۔

بڑھیوں میں علم اور علماء

جو حضرات لکڑی کے سامان بنانے کا پیشہ کرتے تھے ان کو نجّار بڑھی کہا جاتا ہے اس طبقہ سے بھی بہت سے علماء اسلام پیدا ہوئے، جنہوں نے علوم اسلامیہ میں کسی طبقہ سے کم حصہ نہیں لیا ہے، بلکہ کاروان علم کے شانہ بشانہ چل کر منزل مقصود پائی ہے۔

صالح بن دینار نجار مدینہ منورہ کے رہنے والے تابعی تھے، حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کی ہے، اور ان سے ان کے لڑکے نے روایت کی ہے، ابو بکر محمد بن جعفر بن عباس بن جعفر نجّار بغدادی نہایت ثقہ بزرگ اور محدث تھے حفظ قرآن کا خصوصی اہتمام کرتے تھے، ابو نحوی المعروف بابن النجار کوفی نہایت ثقہ عالم تھے، محمد بن حسین اشنانی، عبد اللہ بن ثابت حریری، اسحاق بن محمد بن عرفطہ، نفطویہ، ابو روق احمد بن بکر ہزانی، ابو بکر محمد بن یحیٰ صولی وغیرہ سے روایت کی، اُن سے ابو القاسم زہری، محمد بن احمد بن عبد العزیز عکبری وغیرہ نے روایت کی، ان کی ولادت ۳۰۳ھ میں ہوئی، اپنے زمانہ میں شیخ الکوفہ تھے، جمادی الاولیٰ ۴۰۲ھ کوفہ ہی میں فوت ہوئے، ابو بکر محمد بن بکر بن دوین نجار بغدادی ارباب صلاح و خیر کے

[1] کتاب الانساب ورق ۱۵۸،

پیشوا مانے جاتے تھے، بڑے بڑے علمائے وقت سے پڑھا اور بڑوں بڑوں کو پڑھایا، ابوبکر محمد بن عثمان بن خالد نجّار عسکری بغدادی نے حسن بن عرفہ سے روایت کی، اور ان سے محمد بن جعفر بن عباس نجّار، ابوزرعہ محمد بن سعد بن عبدالوہاب عکبری نے روایت کی، حسین بن محمد نجّار فرقہ نجاریہ کے متعلق انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے، ابوایوب سلیمان بن داؤد بن محمد بن سعد بن نجّار یمامی بصری نے قلیح بن محمد، عمارہ بن عقبہ یمانی، یحیی بن مروان حنفی، ابوثمامہ حربی سے روایت کی، اور ان سے ابوزرعہ، ابوحاتم رازی وغیرہ نے روایت کی، ابوحاتم نے ایک مرتبہ ان کے بارے میں یحیی بن معین سے کہا کہ میں نے ان کو بصرہ میں بہت عافیت و آرام کی حالت میں چھوڑا ہے، اس پر یحیی بن معین نے ان کی تعریف کی اور فرمایا کہ تم یوں کہو کہ میں نے یمامہ میں ان سے زیادہ حدیث کا سمجھنے والا کسی کو نہیں پایا[1]

لکڑہاروں میں علم اور علماء حطّاب اس شخص کو کہتے ہیں جو صحرا اور جنگل سے لکڑیاں لاکر ان کو فروخت کرتا ہے، اس پاک کمائی کے کرنے والوں میں بڑے بڑے علماء و فضلاء گزرے ہیں اور لکڑہاروں میں بھی علم دین کی روشنی پھیلی ہے اور ان کے جھونپڑے علم کی دولت سے رشک فردوس بنے ہیں۔

زید بن عبدالحمید حطّاب نے حضرت عمر بن عبدالعزیز اور اہل مدینہ سے روایت کی ہے اور ان سے امام اوزاعی نے روایت کی ہے، وہ لکڑی چن کر بیچنے والوں میں سے تھے اور تابعی تھے، ابوبکر محمد بن حسین بن محمد بن عبدالخالق حطّاب ۲۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۴۸ھ میں فوت ہوئے، انہوں نے ابوخلیفہ فضل بن حباب، جعفر بن محمد فریابی، احمد بن حسین بن اسحاق صوفی وغیرہ سے حدیث کی تعلیم پائی اور ان سے ابوالقاسم عبداللہ بن عمر بن بقّال اور حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ وغیرہ نے تعلیم پائی، جعفر بن محمد بن مرزبان بن حطّاب جوہری بغدادی نے احمد بن محمد، اور یحیی بن سعید قطان سے روایت کی، اور ان سے

[1] کتاب الانساب ورق ۵۵۳۔

ابوالقاسم سلیمان بن احمد بن ایوب طبرانی اور ابوالحسن علی بن عمر نے روایت کی، محمد بن عبداللہ حطاب رقی نے علی بن عبداللہ فراطیسی سے تحصیل علم کیا، اور ان سے ابوحفص محمد بن احمد نے حدیث پڑھی، نصر بن احمد حطاب نے علی بن یعقوب بن عمرو رقی سے روایت کی، اور ان سے امام ابوعبداللہ حاکم نیساپوری نے روایت کی، ابوایوب سلیمان بن عبداللہ حطاب کرخی آپ خیر و برکت اور صدق و صفا کا مجسمہ تھے، عبداللہ عمرو سے حدیث کی روایت کی، اور آپ سے ابوحفص عمر بن احمد نے مکہ مکرمہ جاتے ہوتے کوفہ میں حدیث کا سماع کیا۔[1]

اسلام کا یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے کہ لکڑ ہارے بھی اسلامی علوم و معارف کی مسند پر جلوہ گر نظر آتے ہیں، اور قرآن و حدیث کی امانت کے محافظ و ضامن بن کر امامت و سیادت کے مرتبہ کو پہونچے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان لکڑ ہاروں نے جنگلوں کو بھی دارالعلوم بنایا ہے۔

شکاریوں میں علم اور علماء

علامہ سمعانی نے لکھا ہے کہ جو شخص پرندوں، مچھلیوں اور جانوروں کا شکار کرتا ہو اسے صیاد (شکاری) کہتے ہیں، اس طبقہ اور پیشہ والوں نے اس حدیث پر پورے طور سے عمل کیا ہے جس میں حکم دیا گیا ہے کہ قیدوا العلم بالکتاب، علم کے بدکے ہوئے مضامین و معانی کو حفظ و تحریر کے ذریعہ مقید کرو، جنگلوں، درختوں، باغوں، دریاؤں اور کہساروں میں صید و شکار کرکے دونوں نے علم کی تلاش میں دنیا کی خاک چھانی ہے اور ہر جگہ سے علم کو شکار کرکے کتابوں اور درسگاہوں میں مقید کیا ہے، ان چڑی ماروں شکاریوں میں بھی بڑے بڑے علمائے دین گزرے ہیں، ان میں سے چند حضرات یہ ہیں:

ابومحمد احمد بن یوسف بن وصیف صیاد بغدادی کا تذکرہ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں کیا ہے، بہت ثقہ اور مستند محدث و عالم تھے، حدیث کی تعلیم ابوحامد محمد بن حضرمی، اسمعیل بن عباس وراق، اور نفطویہ نحوی وغیرہ سے پائی، اور ان سے ابوالقاسم عبدالعزیز بن علی ازجی نے روایت کی ابوبکر محمد بن احمد بن یوسف صیاد بغدادی، آپ

[1] کتاب الانساب ورق ۱۷۱۔

احمد بن یوسف صیاد مذکور کے لڑکے ہیں، حدیث کے بارے میں بہت ہی سخت اور محتاط محرم ۳۴۲ھ میں پیدا ہوئے، ابوبکر شافعی، ابوعبداللہ محمد بن احمد بن محرم، احمد بن ... بن خلاد، ابوبکر بن مالک قطیعی، احمد بن جعفر بن حمدان سقطی بصری سے روایت کی ہے۔

... سعید بن نعیرہ صیاد مصیصی نے عامر بن یساف، ابواسحاق فزاری، عیسیٰ بن یونس، خالد ... بن مبارک سے روایت کی، ابوحاتم رازی کا بیان ہے کہ جس وقت آپ نے کتاب السیرۃ ... دینا شروع کیا تو اہل مصیصہ اپنی اپنی دکانوں کے دروازے بند کر کے آپ کے حلقۂ درس ... آکر بیٹھے۔[1]

... دوروں میں علم اور علماء جو لوگ دوسروں کا سامان اور بوجھ لے آتے لے جاتے ہیں اور لوگوں کا مال واسباب ایک جگہ سے دوسری جگہ پر اجرت ... مزدوری پر پہونچاتے ہیں ان کو حمّال کہتے ہیں، ان باربردار مزدوروں اور اجیروں میں ... سے علماء فقہاء اور محدثین گزرے ہیں، جنہوں نے علم دین کی باربرداری اخلاص وللہیت ... مزدوری پر کی ہے، اور اسلام کی امانت کا بار اپنے سروں پر اٹھا کر دنیا کے گوشے گوشے ... پہونچایا ہے، چند ایسے حضرات یہ ہیں،

... مشکان حمّال تابعی ہیں اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے حدیث کی روایت ... ابوموسیٰ ہارون بن عبداللہ بن مروان حمّال بھی بہت بڑے محدث تھے، پہلے بزازی ... کام کرتے تھے، اور کپڑے بیچتے تھے مگر بعد میں لوگوں کے اسباب وسامان کی باربرداری ... پر کرنے لگے تھے، اور اسی پیشہ سے کھاتے تھے، انہوں نے حضرت سفیان بن عیینہ، ... بن حاتم، معن بن عیسیٰ، روح بن عمارہ، ابوعاصم نبیل، ابوعامر عقدی، عبداللہ بن ... وغیرہ سے روایت کی ہے،

امام ابراہیم حربی کا قول ہے کہ ہارون بن عبداللہ اس قدر سچے تھے کہ اگر بالفرض

[1] کتاب الانساب ورق ۳۵۷۔

جھوٹ بولنا حلال اور جائز ہوتا تب بھی وہ جھوٹ نہ بولتے" ابو عمران موسیٰ بن ہارو
عبد اللہ حمّال، ابو موسیٰ ہارون حمّال مذکور کے لڑکے ہیں آپ امام فی الحدیث تھے، شعب
۲۹۴ھ میں انتقال کیا، رافع بن علی حمّال فقیہ تھے، کعبۃ اللہ کے جوار میں زندگی بسر
تھے، اور مکہ مکرمہ ہی میں انتقال کیا، بہت بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے، ابو اسحاق شیر
اور ابو یعلیٰ فرار نے آپ کی بدولت حدیث و فقہ میں امامت کا درجہ پایا، مزدوری کر
پاتے تھے اس میں سے ان دونوں حضرات کو بھی دیتے تھے، جس کی وجہ سے وہ تعلیم حاصل کر

مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور پیشوں میں سے ان چند علماء کے حالات مثال
پر پیش کئے گئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں میں علم کا رواج ہوا تو انہوں
کس ذوق و شوق سے علم حاصل کیا اور اس میں ان کے کام دھندے اور پیشے حارج
ہوئے، پھر مسلمانوں نے ہر طبقہ اور ہر پیشہ کے علماء و فضلاء کو سر پر بٹھایا اور ان کی اما
سیادت میں علم دین کی منزلیں طے کیں، جو لوگ بعض طبقوں اور پیشوں کے بارے میں
خیالات رکھتے ہیں اور تنگ نظری کا ثبوت دیتے ہیں وہ غور کریں کہ وہ کس طبقہ اور
کو معیوب قرار دے کر ان علمائے اسلام پر حرف گیری کریں گے، کون سا پیشہ ہے جسے ع
اسلام نے اختیار نہیں کیا ہے اور کون سا طبقہ ہے جس میں فوج در فوج ائمہ دین پید
ہوئے ہیں؟

ل کتاب الانساب ورق ۱۷۴

(۷)

علمائے اسلام کے القاب

دینی علوم اور اسلامی تعلیمات ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے ضروری ہیں، البتہ ان میں تجرد انہماک خاص خاص لوگوں کا حصہ ہے، اور جو حضرات یہ حصہ پاتے ہیں ان کو علمائے اسلام اور علمائے دین کہا جاتا ہے، اور ان کے لیے منصب و حیثیت کے اعتبار سے خاص خاص القاب ہوتے ہیں جن کو ان کے ناموں کے ساتھ استعمال کر کے تعظیم و تکریم ظاہر کی جاتی ہے، اسلام میں علماء کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو ہندو مذہب اور عیسائیت میں برہمنوں اور پادریوں کو حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کے گویا سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں اور عوام مذہبی زندگی میں ان کے ہاتھ میں مجبور ہوتے ہیں، البتہ علمائے دین کی تعظیم و تکریم اور اچھے القاب و خطابات سے ان کو یاد کرنا اخلاقی فرض ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اہل علم و فضل کے لیے القاب بہت زیادہ ملتے ہیں، اس مقالہ میں ہم ان القاب کا تاریخی پس منظر پیش کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوگا کہ علمائے دین کے لیے آج جو القاب و خطابات استعمال ہو رہے ہیں، ان میں کیا روح کارفرما تھی اور اب وہ کس طرح پامال ہو رہے ہیں۔

عالم کا لقب صدر اسلام سے لے کر آج تک دینی علوم و فنون کے حاملین اور ان کے پڑھنے پڑھانے والوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، قرآن حکیم میں یہ لقب علمائے دین کے حق میں آیا ہے، چنانچہ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ اور ان یعلمہ علماء بنی اسرائیل میں علماء سے مراد دین کے عالم ہیں، احادیث میں بھی یہ لقب اسی معنی میں بولا گیا ہے، جیسا کہ فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم وغیرہ میں ہے۔

اور جب "عالم" کو متعلم کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے تو اس سے مدرس و معلّم بھی مراد ہوتا ہے، جیسا
اس حدیث میں ہے۔ اغد عالماً او معلماً

ابتدا میں عالم کا اطلاق کسی خاص علم و فن یا کسی خاص مقام کی طرف اضافت کر
میں ہوتا تھا، جیسے عالم المدینہ، عالم الکوفہ، عالم اہل المدینہ، عالم اہل خراسان، عالم اہل
اور عالم المغازی والسیر، عالم الناسخ والمنسوخ اور عالم الحدیث والآثار وغیرہ، مگر بعد
بغیر اضافت کے استعمال ہونے لگا۔

علامہ علامہ مبالغہ کا صیغہ ہے، یہ لقب مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھنے والے علما
پر استعمال ہوتا ہے، عرب میں قدیم زمانہ سے انساب، عربیت، شاعری ا
وحروب کے جاننے والوں کو علامہ کہا جاتا تھا، عہد رسالت میں بھی ان علوم کے جا
کو علامہ کہتے تھے، چنانچہ علامہ ابن عبد البر اندلسیؒ نے جامع بیان العلم میں حضرت ا
روایت کی ہے کہ:۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل	ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
المسجد فرای جمعاً من الناس	مسجد نبویؐ میں تشریف لائے اور دیکھا
علی رجل فقال وما ھذا، قالوا	کہ لوگوں کی ایک جماعت ایک آدمی کے گرد
یا رسول اللہ رجل علامۃ، قال	جمع ہے، آپ نے دریافت فرمایا کیا معا
وما العلامۃ، قالوا اعلم الناس	ہے لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ
بانساب العرب واعلم الناس	ایک علامہ شخص ہے، آپ نے فرمایا کہ علا
بعربیۃ، واعلم الناس بشعر واعلم	کیا ہوتا ہے؟ لوگوں نے کہا علامہ وہ شخص
الناس بما اختلف فیہ العرب،	ہے جو انساب عرب، عربیت، شعر و شاعر
فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	اور عربوں کے حالات کا سب سے بڑا عا
وسلم ھذا علم لا ینفع	ہے، آپ نے فرمایا یہ ایسا علم ہے کہ نہ

وجھل لا یضر[1] جاننا مفید ہے اور نہ جاننا مضر ہے۔

اس ارشاد نبوی کے بعد ضرر اور غیر مفید علوم کے جاننے والوں کے لیے علامہ کا لقب صحابہ کرام کے نزدیک کچھ زیادہ دقیع نہیں رہ گیا، غالباً یہی وجہ ہے کہ عہد رسالت اور صحابہ و تابعین کے زمانہ میں علمائے دین کے لیے یہ لقب نہیں استعمال ہوتا تھا، اور تاریخ و رجال کی کتابوں میں بھی صدر اسلام کے علماء کے لیے یہ لقب نہیں ملتا ہے، مگر بعد میں اس کا عام رواج ہوگیا۔

معلم دینی تعلیم دینے والے کو اسلام میں سب سے پہلے معلم کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، یہ وہ مقدس لقب ہے جسے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں پسند فرمایا ہے، اور انما بعثت معلماً فرما کر اس کی عظمت بتائی ہے، اس لقب سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی نوازا، چنانچہ وہ صحابہ میں اس لقب سے مشہور رہے، علامہ ابن سعدؒ نے حفاف بن ابجار سے روایت کی ہے کہ میں حضرت عبد الرحمن بنؓ عوف کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھا کرتا تھا۔

فاذا خطب عمر یقول	اور جب حضرت عمرؓ جمعہ کا خطبہ پڑھتے تو میں عبد الرحمن بن
اشھد انك معلمٌ	عوف کو یہ کہتے ہوئے سنتا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ معلم ہیں،

یہ واقعہ سن کر اس کے راوی حضرت عبد الرحمن بن ابی الزنادؒ کو تعجب ہوا تو انہوں نے ان سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث بیان کی۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ
وسلم قال ما من نبی الا فی	ہر نبی کی امت میں دو ایک معلم ہوا کرتے ہیں،
امتہ معلم او معلمان، وان	اگر میری امت میں کوئی معلم ہے تو عمرؓ بن خطاب
یکن فی امتی احد فابن الخطاب،	ہے حقیقت یہ ہے کہ حق عمر کی زبان اور

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۳ طبع مصر و کنز العمال ج ۵ ص ۲۳۶ طبع اول حیدر آباد

ان الحق علی لسان عمر وقلبہ[1] دل ہے۔

چونکہ یہ لقب تعلیم دینے والے کے مفہوم کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے، اور اس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں اور حضرت عمرؓ کے بارے میں استعمال فرمایا ہے، اس لیے اسے بعد میں بڑا حسنِ قبول حاصل ہوا، اور مکاتب کے معلموں سے لے کر حدیث و فقہ کے پڑھانے والوں تک کو معلم کے لقب سے پکارا گیا، ابن قتیبہؒ نے کتاب المعارف میں اور ابن رستہ نے الاعلاق النفیسہ میں "اسماء المعلمین" کے عنوان سے ایسے بہت سے بزرگوں کا ذکر کیا ہے، جو معلم کے لقب سے مشہور تھے، مثلاً

(۱) ابو صالح صاحب الکلبی، یہ بچوں کو تعلیم دیتے تھے (۲) ابو عبد الرحمٰن اسلمی، یہ دونوں آنکھ کے اندھے تھے (۳) معبد جہنی (۴) ضحاک بن مزاحم (۵) عبد اللہ بن حارث، یہ دونوں حضرات بلا اجرت تعلیم دیتے تھے (۶) قیس بن سعد (۷) عطاء بن ابی رباح مکی (۸) ابو امیہ عبد الکریم، (۹) قاسم بن عیمرہ ہلالی (۱۰) کمیت بن زید شاعر، یہ کوفہ کی مسجد میں بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے (۱۱) عبد الحمید الکاتب، یہ بنو امیہ کے میر منشی بھی تھے (۱۲) ابو البیداء (۱۳) ابو عبد اللہ، یہ خلفائے بنو امیہ کے خطوط و فرامین بھی لکھا کرتے تھے (۱۴) حجاج بن یوسف، عراق کی گورنری سے پہلے طائف میں روٹی لے کر بچوں کو پڑھایا کرتا تھا (۱۵) حجاج کا باپ یوسف بھی معلم تھا (۱۶) علقمہ بن ابی علقمہ مولی حضرت عائشہؓ ان کا ذاتی مکتب تھا جس میں عربیت نحو اور عروض کی تعلیم دیتے تھے، (۱۷) ابو معاویہ شیبان بن عبد الرحمٰن نحوی، مولیٰ بنو تمیم، یہ محدث تھے، اور داؤد بن علی کے بچوں کو ادب کی تعلیم بھی دیتے تھے (۱۸) ابو سعید محمد بن مسلمہ بن ابی الوضاح قضاعی، یہ خلیفہ مہدی کے معلم تھے (۱۹) ابو اسمٰعیل ابراہیم بن سلیمان مودب، آپ محدث تھے (۲۰) ابو عبید قاسم بن سلام، یہ بہت بڑے عالم اور محدث و فقیہ اور طرسوس کے قاضی تھے، ۲۲۴ھ میں مکہ مکرمہ میں[2] فوت ہوئے، ان میں سے اکثروں کے ساتھ لفظ معلم

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ قسم ۲ ص ۹۹ طبع لیڈن۔ [2] کتاب المعارف طبع مصر ص ۲۳۸۔

با لالتزام استعمال کیا جاتا تھا، جیسے حسین بن ذکوان حسین المعلم اور حلبیب مولی معقل بن یسار حلبیب المعلم۔

یہ ایک سرسری فہرست ان چند ناموں کی ہے جو عہد صحابہ و تابعین اور تبع تابعین سے لے کر تیسری صدی تک معلم کے لقب سے خاص طور سے مشہور ہوئے، بلکہ چوتھی صدی تک دنیائے اسلام کے بعض علاقوں میں عام طور سے علمائے دین کو معلم کے لقب سے پکارا جاتا تھا، علامہ مقدسی بشاریؒ نے (جنہوں نے ۳۷۵ھ میں اپنی کتاب احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم لکھی ہے) اقلیم دیلم کے بیان میں لکھا ہے کہ

یسمون العالم معلما و ربما	یہاں کے لوگ عالم کو معلم کے لقب سے یاد
تعلقوا بی وقالوا لوك معلم	کرتے ہیں اور بسا اوقات مجھے لوگ معلم یعنی
واللوك هوا لجيل[1]	زبردست عالم کہہ کر میرے پیچھے پڑ جاتے تھے

اس کا مطلب یہ ہے کہ قومس، جرجان، شہرستان، طبرستان، آمل، دیلمان، دامغان، سمنان، بسطام، بیار، استر آباد، طالقان وغیرہ میں عام علماء کو معلم کے لقب سے پکارا جاتا تھا، مقدسی نے ان تمام مقاموں کو اقلیم دیلم میں شمار کیا ہے۔

مگر بعد میں یہ مقدس اور قدیم لقب، دوسرے القاب کے مقابلہ میں بہت کم استعمال ہونے لگا، اور عام طور سے معلم کی جگہ مدرس نے لے لی، ہمارے علم میں تعلیم کے اصول و آداب پر سب سے پہلی کتاب امام محمد بن سحنون بن سعید متوفی ۲۵۶ھ کی آداب المعلمین ہے۔ جو بلاد مغرب میں عام طور سے رائج ہے۔ البتہ اس تعلم کے آداب و اصول پر سب سے مشہور کتاب شیخ برہان الدین مرغینانی کی تعلیم المتعلم ہے۔

مقری پڑھنے پڑھانے والے علمائے دین کے لیے معلم کی طرح مقری کا لقب بھی رسول اللہؐ کے زمانہ میں بولا جانے لگا تھا، مگر اس میں معلم کی طرح تعلیم دینے کا عمومی مفہوم نہیں

[1] احسن التقاسیم ص ۳۶۹

تھا، بلکہ اس کی ابتدا قرآن کی تعلیم دینے والوں سے ہوئی۔ اور اس کے مفہوم میں خاص طور سے قرآن کے معلم کا تصور تھا، اس لقب کا اطلاق سب سے پہلے حضرت مصعب بن عمیرؓ پر ہوا، جب ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو اہل مدینہ کی خواہش پر قرآن کی تعلیم کے لیے روانہ فرمایا تھا، اس وقت مدینہ کے لوگوں نے ان کو مُقرِی کے لقب سے ملقب کیا، اور یہ ان کا مستقل لقب ہوگیا۔ امام طبرانیؒ نے معجم کبیر میں روایت کی ہے کہ:۔

ورجع مصعب الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکان یدعی المقری[1]

اور مصعبؓ مدینہ سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اسوقت ان کو مقری کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

چونکہ مقری کے لقب میں شروع ہی سے قرآن کی تعلیم کا تصور تھا۔ اس لیے بعد میں بھی اسے معلمین قرآن ہی کے لیے استعمال کیا گیا، البتہ قرآنی تعلیم کے عام مفہوم کے علاوہ اس میں صرف تجوید و قرارت کے ساتھ پڑھانے کا تصور بھی شامل ہوگیا، چنانچہ تیسری صدی تک کے مجودین و قراء اسی لقب سے یاد کیے جاتے تھے، چند مشہور مقریوں کے نام یہ ہیں:

(۱) ابوجعفر یزید بن قعقاع مقری مدینہ (۲) ابوعبدالرحمٰن سلمی کوفی یہ مقری کے ساتھ ساتھ فقیہ بھی تھے (۳) شیبہ بن نصاح مقری مدینہ، مولیٰ حضرت ام سلمہؓ آپ اپنے وقت میں اہل مدینہ کے امام تھے (۴) نافع بن عبدالرحمٰن مقری مدینہ، آپ فن تجوید و قرارت کے زبردست اور مشہور امام ہیں (۵) طلحہ بن عوف، اہل کوفہ کے قاری و مقری ہیں (۶) یحیی بن وثاب کوفی۔ (۷) حمزہ زیات (۸) عاصم بن ابی النجود (۹) حمید الاعرج مقری اہل مکہ (۱۰) ابن کثیر وغیرہ[2]۔ یہ لقب ان میں سے بعض بزرگوں کے نام کا جزو لاینفک ہوگیا تھا۔ مثلاً امام ابوعبدالرحمٰن المقری، عبداللہ بن ابی اسحاق المقری وغیرہ، ہندوستان میں عام طور سے قاری اور مقری دونوں کے لیے قاری کا لقب استعمال ہوتا ہے۔

قاری | جس طرح ابتدا میں مقری کا لقب قرآن پڑھانے والوں کے لیے مخصوص تھا اسی طرح

[1] جمع الفوائد ج ۲ ص ۲۹ [2] کتاب المعارف ص ۲۳۰ و ۲۳۲

قاری کا لقب قرآن پڑھنے والوں کے لیے مخصوص تھا، مگر قرآن پڑھنے کا مطلب صرف اس کے الفاظ کی تجوید و قراءت کے ساتھ ادائیگی ہی نہیں تھا بلکہ جملہ قرآنی علوم و فنون اس میں شامل تھے، چنانچہ دورِ رسالت کے بعد یہی قراء فقیہ، محدث وغیرہ کے القاب سے یاد کئے جانے لگے، اور یہ جامع لفظ مختلف الفاظ میں تقسیم ہوگیا، علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں اس کی تفصیل یہ بیان کی ہے۔

ثم ان الصحابة كلهم لم يكونوا اهل فتيا ولا كان الدين يوخذ عن جميعهم وانما كان ذالك مختصًا بالحاملين للقرآن العارفين بناسخه ومنسوخه ومتشابهه ومحكمه وسائر دلالته بما تلقوه من النبي صلى الله عليه وسلم اوممن سمعه منهم من عليتهم وكانوا يسمون لذالك القراء الذين يقرؤن الكتاب لان العرب كانوا امة امية فاختص من كان منهم قارئا لكتاب الله بهذا الاسم لغرابته يومئذ وبقى الامر كذالك صدر الملة ثم عظمت امصار الاسلام وذهبت الامية من العرب

پھر تمام صحابہؓ نہ مفتی تھے اور نہ سب سے دینی علوم حاصل کئے جاتے تھے، بلکہ یہ چیز صرف عاملین قرآن کے ساتھ مخصوص تھی۔ جو اس کے ناسخ و منسوخ اور متشابہ و محکم اور اس کی دوسری تمام دلالتوں کے عالم تھے، جن کو انہوں نے رسول اللہؐ سے حاصل کیا تھا، یا ان لوگوں سے جنہوں نے رسول اللہؐ سے حاصل کیا تھا اس لیے جو لوگ قرآن پڑھتے تھے ان کو قراء کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، کیونکہ اس وقت عرب امی قوم تھے، اس لیے کتاب اللہ پڑھنے والوں کے لیے یہ لقب مخصوص ہوگیا صدرِ اسلام تک یہ اصطلاح جاری رہی، پھر جب اسلامی شہروں کی کثرت ہوئی اور قرآن کی ممارست کی وجہ سے عربوں سے امیت جاتی رہی اور دینی مسائل کے استنباط کا رواج ہوا اور علم فقہ مکمل ہوکر

بمما دسنه الکتاب و تمکن الاستنباط و کمل لفقہ ۔ ایک مستقل فن بن گیا، تو لوگوں نے قراء کے
واصبح صناعۃ وعلما فبدلو باسم الفقہاء والعلماء من القراء[1] بجائے فقہاء اور علماء کے نام رائج کیے۔

جس طرح جماعتِ صحابہؓ میں مقری کا لقب سب سے پہلے حضرت مصعب بن عمیرؓ کے لیے استعمال کیا گیا، اسی طرح قاری کا لقب سب سے پہلے جماعت صحابہؓ میں حضرت سعد بن عبیدؓ کے لیے استعمال ہوا، طبقات ابن سعد میں ہے۔

وکان یسمی القاری ولم یکن احد من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسمی القاری غیرہ[2] ۔ حضرت سعد بن عبیدؓ کو قاری کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، جماعت صحابہ میں انکے علاوہ کوئی دوسرا قاری نہیں کہلاتا تھا۔

قاری کا لقب صحابۂ کرام میں اگرچہ سب سے پہلے حضرت سعد بن عبیدؓ کے لیے استعمال کیا گیا، مگر یہ لقب حاملین علوم قرآن کے لیے زمانۂ رسالت ہی میں عام ہو گیا تھا، اور جن صحابہ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں قرآن پڑھا اور حفظ کیا تھا ان کو قاری کہنے لگے، یہ صحابہ عام طور سے قرآن کی تعلیم پر مامور ہوتے تھے، مسجد نبوی اور مدینہ منورہ کے مختلف مقامات پر ان کی مجلس درس جاری رہتی تھی، اور بوقت ضرورت ان کو نومسلم قبائل کے لیے باہر بھی بھیجا جاتا تھا، اسی سلسلہ میں ان ستر قراء صحابہ کا واقعہ بہت مشہور ہے، جن کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھانے کے لیے روانہ فرمایا تھا، مگر وہ راستہ میں شہید کر دیے گئے۔

صدر اسلام کا یہ لقب پہلی صدی تک جاری رہا اور علمائے دین قراء کہلاتے رہے! چنانچہ بنو امیہ کے خلاف عبدالرحمٰن بن اشعث کی سرکردگی میں یہی قراء ظلم و فساد کے خلاف جنگ کے لیے نکلے تھے، مگر جب باقاعدہ دینی علوم کی تدوین ہوئی تو یہی قراء، فقہاء اور محدثین وغیرہ کے لقب سے یاد کیے جانے لگے اور جس کو جس علم و فن سے زیادہ تعلق تھا اس کو اسی کی مناسبت سے ملقب کیا گیا، بعد میں قاری کا لفظ اپنے قدیم مفہوم و معنی سے ہٹ کر قرآن

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۷۴ [2] طبقات ابن سعد جلد ۳ قسم ۲ ص ۳

کو تجوید و قراءت سے پڑھنے پڑھانے والے کے لیے استعمال ہونے لگا، بعض حضرات اس فن میں اتنے مشہور ہوئے کہ یہ لقب ان کے نام کا جز ہو گیا، جیسے متقدمین میں سلّام القاریؒ اور متاخرین میں ملا علی قاری وغیرہ۔

کامل کامل کا لقب زمانۂ جاہلیت اور صدرِ اسلام میں علمی اور فنی مہارت کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا تھا، جس کے مفہوم میں عربی لکھنے پڑھنے کے ساتھ تیراکی اور تیر اندازی میں بھی مہارت شامل تھی، علامہ ابن سعدؒ حضرت اوس بن خولیؓ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

وکان اوس بن خولی من الکملۃ	اوس بن خولی کاملین میں شمار ہوتے تھے،
وکان الکامل عندھم فی الجاھلیۃ	عربوں کے نزدیک زمانۂ جاہلیت اور صدر
واول الاسلام الذی یکتب	اسلام میں کامل وہ شخص ہوتا تھا جو عربی
بالعربیۃ ویحسن العوم والرمی	زبان میں لکھتا تھا اور تیراکی اور تیراندازی
وقد کان اجتمع ذالک فی اوس	اچھی طرح جانتا تھا، یہ سب باتیں اوس
بن خولی[1]	بن خولی میں پائی جاتی تھیں۔

اس لیے صحابہ میں بھی جو بزرگ ان چیزوں میں مہارت رکھتے تھے، وہ کامل کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے، چنانچہ حضرت اسید بن حضیرؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت رافع بن مالکؓ عنہم کامل کے لقب سے مشہور تھے[2]۔

چونکہ کامل کے لقب میں صرف علوم دینی ہی میں مہارت و کمال کا تصور نہیں بلکہ دوسرے فنون بھی شامل تھے، اس لیے بعد میں اس کا استعمال علمائے اسلام کے لیے خاص نہیں رہا اور نہ اس کا رواج ہوا، بلکہ بطور صفت کے ہر علم و فن کے ماہر کو کامل کہا جانے لگا۔

کاتب کاتب کا لقب زمانۂ رسالت میں بہت باعظمت تھا، اور وہ حضرات کاتب کے لقب سے ملقب کیے جاتے تھے، جو وحی الٰہی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۳ قسم دوم ص ۹۱ [2] طبقات ابن سعد ج ۳ قسم اوّل بالترتیب ص ۱۳۶، ۱۴۲، ۱۴۴،

فرامین اور خطوط کی کتابت کیا کرتے تھے، جماعت صحابہ میں یوں تو بہت سے کاتب تھے مگر حضرت حنظلہ بن ربیعؓ خاص طور سے کاتب کے لقب سے مشہور تھے، علامہ ابن سعدؒ ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

کتب للنبی صلی اللہ علیہ وسلم مرۃ کتابا لذلک الکاتب۔ حنظلہ بن ربیعؓ نے ایک مرتبہ رسول اللہؐ کے لیے ایک تحریر لکھی تھی اس وقت سے وہ کاتب کے نام سے مشہور ہو گئے۔[1]

صحابۂ کرام میں جو بزرگ وحی و احکام رسول کے خصوصی کاتب تھے ان کے نام علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں درج کئے ہیں (۱) حضرت ابوبکرؓ (۲) حضرت عمرؓ (۳) حضرت عثمانؓ (۴) حضرت علیؓ (۵) حضرت زبیرؓ (۶) حضرت عامر بنؓ فہیرہ (۷) حضرت عمرو بنؓ عاص (۸) ابیؓ بن کعب (۹) حضرت عبداللہ بنؓ ارقم (۱۰) حضرت زیدؓ بن ثابت بن قیس بن شماس (۱۱) حضرت حنظلہ بن ربیع اسدی (۱۲) حضرت مغیرہؓ بن شعبہ (۱۳) حضرت عبداللہ بنؓ رواحہ (۱۴) حضرت خالدؓ بن ولید (۱۵) حضرت خالد بنؓ سعید بن عاص، کہا جاتا ہے کہ کتابت وحی کی خدمت سب سے پہلے انہی نے انجام دی (۱۶) حضرت امیر معاویہؓ (۱۷) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم آپ تمام کاتبین وحی و احکام میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔[2]

خلفائے راشدین کے زمانہ تک جو لوگ مکاتیب و فرامین لکھنے پر مامور تھے ان کو بھی کاتب کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، اور بعد میں بعض علماء و مصنفین کے شاگرد جو استاد کا لکھنے کا کام انجام دیتے تھے وہ بھی کاتب کے نام سے مشہور ہوئے، جیسے واقدی کے کاتب علامہ محمد بن سعد صاحب طبقات کاتب الواقدی سے مشہور ہیں۔

بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں کتابت و انشاء کا عہدہ سکریٹریٹ کا ہم معنی بن گیا اور سرکاری دفاتر میں کام کرنے والوں کو کاتب اور منشی کہنے لگے، اموی دور میں عبدالحمید الکاتب

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۳۶۔ [2] زاد المعاد ج ۱ ص ۴۱۔

نے اس میں بڑی شہرت حاصل کی، وہ اس درجہ کا کاتب تھا کہ اس نے کتابت کے اعتبار سے عربی رسم الخط میں کئی شکلیں ایجاد کیں اور طرز تحریر میں نئے نئے اسلوب ایجاد کئے، اسی طرح ابو العباس احمد بن محمد الکاتب متوفی ۲۷۰ھ، ابن العمید الکاتب، ابو الفضل محمد بن عبید الکاتب، ابو عبید اللہ حسین ابن سعد الکاتب متوفی ۳۶۶ھ، ابن العماد الکاتب، ابو علی محمد بن علی بن حسین بن مقلہ الکاتب متوفی ۳۲۸ھ، ابن ابجان الکاتب، اور ابو الفوارس حسین بن علی بن حسین الکاتب متوفی ۵۰۰ھ وغیرہ فن کتابت و انشار میں اتنے مشہور ہوئے کہ ان کے نام کے ساتھ یہ لقب بھی استعمال کیا جانے لگا۔[1]

بعد میں یہ لقب ان لوگوں کے لیے بولا جانے لگا جو انشار پردازی اور خوشنویسی میں درجہ کمال رکھتے تھے، آج کل لغوی معنوی کے ساتھ عربی اخبارات و رسائل کے مدیر اور مقالہ نگاروں کو بھی کاتب اور منشی کہتے ہیں۔

مکتب مکتب کے لقب سے وہ لوگ پکارے جاتے تھے جو عربی رسم الخط کی کتابت میں کمال رکھتے تھے، اور بچوں کو اس کی تعلیم بلکہ عربی رسم الخط کی تعلیم کے ساتھ ادب و لغت کی بھی تعلیم دیتے تھے، علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے:

هذه النسبة الى تعليم الخط	مکتب کی نسبت عربی رسم الخط کی طرف ہے اور جو
ومن يحسن ذالك ويعلم	آدمی خوشنویس ہوتا ہے اور بچوں کو رسم الخط اور
الصبيان الخط والادب[2]	ادب کی تعلیم دیتا ہے اس کو مکتب کہتے ہیں۔

جو لوگ ابتدار میں مکتب کے لقب سے مشہور ہوئے علامہ سمعانی نے ان کے یہ نام بتائے ہیں: ابو سالم المکتب کوفی، حسین بن زکوان المعلم المکتب بصری، عتبہ بن عمر المکتب کوفی، ابو الطیب محمد بن جعفر بن یزید المکتب بغدادی، ابو بکر محمد بن علی بن حسن المکتب عنبری بغدادی، عبید بن عمر المکتب، ہمارے خیال میں مکتب کا لقب قدیم زمانہ میں اسی معنی کو ظاہر کرنا

[1] ان کے حالات کے لیے تاریخ ابن خلکان میں ان کے تذکرے ملاحظہ ہوں۔ [2] کتاب الانساب لفظ مکتب

تھا جیسے ہمارے زمانہ میں "میاں صاحب" اور "میاں جی" کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں۔

مؤدّب مسلمان بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کے لیے محلوں میں چھوٹے چھوٹے مکاتب ہوا کرتے ان میں تعلیم دینے والوں کو معلم اور مکتب وغیرہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، خلافت راشدہ اور اس کے کچھ بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا، ان مکاتب میں عام مسلمانوں کے بچے پڑھتے تھے، مگر بعد میں جب خلفاء اور امراء کے بچوں کو ان کے گھروں پر تعلیم دینے کا رواج ہوا اور ان کی مخصوص ضرورت کے مطابق دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ تاریخ، شعر و ادب اور اخلاق وغیرہ کی بھی تعلیم دی جانے لگی تو اس قسم کے معلمین مؤدّب کے لقب سے پکارے جانے لگے یہ لوگ عام طور سے علم الانساب، تاریخ و ثقافت اور شعر و ادب میں ماہر ہوا کرتے تھے، فقہاء و محدثین خلفاء و امراء کے بچوں کو عام تعلیمی حلقوں سے الگ تعلیم دینا پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے وہ اس سے عام طور سے الگ رہے، علامہ سمعانی کا بیان ہے:-

المودب ھذا الاسم لمن یعلم الصبیان والناس الادب واللغۃ۔ — مودب اس شخص کا نام ہے جو بچوں اور عام لوگوں کو ادب اور لغت کی تعلیم دیتا ہے۔

مندرجہ ذیل مؤدّب اپنے اپنے دور میں خاص شہرت کے مالک ہوئے (۱) صالح بن کیسان المودب مدنی، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مؤدّب تھے (۲) ابوزکریا یحییٰ بن محمد بن قیس المودب مصری بنی جعفر کے مودب تھے (۳) ابو اسمٰعیل ابراہیم بن سلیمان بن رزین المودب آل عبید اللہ کے مودب تھے (۴) ابوسعید المودب، مشہور مودبوں میں سے ہیں[1]

ماہر انساب و عربیت شرقی بن قطامی کا خلیفہ منصور نے اپنے لڑکے مہدی کا مودب مقرر کیا تھا، امام ادب مفضل ضبیؔ بھی مہدی کو لغت و ادب کی تعلیم دیتے تھے، امام کسائی نحوی ہارون رشید کے لڑکے امین کے مؤدّب تھے، ابو محمد یزیدی، خلیفہ مہدی کے ماموں یزید بن منصور کو تعلیم دیتے تھے اسی لیے یزید کی نسبت سے مشہور ہوئے[2] فراء نحوی خلیفہ مامون

---

[1] کتاب الانساب لفظ مودب [2] فہرست ابن ندیم ص ۱۰۲ [3] ایضاً ص ۴۷۔

کے دونوں لڑکوں کو پڑھاتے تھے امام ابن سکیت امیر ابن طاہر کے لڑکے کو ادب کی تعلیم دیتے تھے، چونکہ اس زمرہ میں فقہاء و محدثین بہت کم شامل ہوئے اور اس میں ادیبوں ہی کا زیادہ حصہ رہا اس لیے یہ لقب زیادہ رواج نہ پا سکا۔

منشی علامہ سمعانی منشی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ھذہ النسبة الی انشاء المکتب الدیوانیة والرسائل[1]	منشی کی نسبت سرکاری دفتروں اور خطوط و فرامین لکھنے کی طرف ہے۔

منشی کے لقب سے یہ حضرات مشہور ہوئے۔

۱۔ ابو اسمٰعیل حسین بن علی بن عبد الصمد المنشی اصفہانی عراق کے صدر دیوان تھے، اور اس فن میں دنیا میں مشہور تھے (۲) ابو الفضل محمد بن عاصم المنشی سلطان سنجر بن ملک شاہ کے یہاں انشاء کی خدمت پر مامور تھے، ۵۴۱ھ یا ۵۴۲ھ میں انتقال کیا (۳) ابو الفرج عبد اللہ بن احمد حضرمی ابن المنشی متقدمین میں مشہور تھے[2]

بعد میں یہ لقب خاص طور سے انشاء پردازوں کے لیے استعمال ہونے لگا، آج کل عربی اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر اور رئیس التحریر کو بھی منشی کہتے ہیں۔

خطیب خطیب کا لفظ خطبہ اور خطابت سے ماخوذ ہے، ابتدا میں ان فصحاء و بلغاء کو خطیب اور خطباء کہا جاتا تھا جو فن خطابت میں کمال رکھتے تھے اور زبان دانی و زبان آوری میں مشہور تھے۔ اور تقریر کے ذریعہ سحر بیانی کرتے تھے، مگر بعد میں یہ لقب ایسے علماء کے لیے مخصوص ہو گیا جو منبروں پر جمعہ کا خطبہ دیتے تھے، اور وعظ کہتے تھے، علامہ سمعانی کا بیان ہے۔

ھذہ النسبة الی الخطابة علی المنابر[3]	خطیب کی نسبت منبروں پر خطابت و تقریر کرنے کی طرف ہے۔

جمعہ کے خطیب عام طور سے امامت بھی کیا کرتے تھے، چند خطیبوں کے نام یہ ہیں (۱) ابوبکر

---

[1] کتاب الانساب لفظ منشی [2] کتاب الانساب لفظ منشی [3] کتاب الانساب ورق ۲۰۴۔

احمد ابن علی بن ثابت خطیب بغدادی صاحب "تاریخ بغداد (۲) شکیب بن شبیہ خطیب بصری
یہ خطیب منبر نہیں تھے، بلکہ فصیح و بلیغ خطیب تھے (۳) ابو محمد عقیل بن عمرو بن ابکر بن سلیمان
خطیب نیشاپوری سب سے پہلے ان کے دادا بکر بن سلیمان کو خطیب کا لقب ملا، پھر ان
کے والد عمرو بن بکر خطیب ہوئے، ابو محمد عقیل نیشاپور کے حاکم بھی تھے، اور اپنی حکومت کے زمانہ
میں خطابت کی خدمت بھی انجام دیتے تھے۔ ۲۸۶ھ میں ان کا انتقال ہوا،

چوتھی صدی میں خطیبوں کا خاص لباس ہوتا تھا۔ اور وہ عبا، وقبا، پہن کر خطبہ دیتے تھے
مگر خراسان کے خطیب ان کے بجائے دراعہ نامی لباس استعمال کرتے تھے، مقدسی کا بیان ہے۔

ولا یتردی الخطیب ولا ینتقبی — خراسان کا خطیب جمعہ کا خطبہ دیتے وقت چادر اور قباء
انما علیہ دراعۃ ولا یسرع — استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کے جسم پر دراعہ ہوتا ہے،
الخروج[1] — نیز خطیب اپنے حجرہ سے نکلنے میں جلدی نہیں کرتا۔

ان خطیبوں اور اماموں کے لیے صاحب علم وفضل ہونے کے ساتھ ساتھ موثر انداز خطابت
رکھنا ضروری تھا،

مذکر مذکر کا لفظ تذکیر سے ماخوذ ہے، جس کے معنی یاد دلانے والے اور نصیحت کرنے والے کے
ہیں، یہ لقب سب سے پہلے قرآن نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال کیا
ہے، اِنَّمَا اَنْتَ مُذَکِّرٌ دوسری جگہ فرمایا گیا، وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ
بعد میں یہ لقب ان وعظ ونصیحت کرنے والے علماء کے لیے بولا جانے لگا جو عام مسلمانوں
کو دینی احکام بتاتے اور عذاب وثواب اور جنت و جہنم وغیرہ کو یاد دلاتے تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں

ھذا اللفظۃ لمن یذکر — یہ لفظ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے
و یعظ[2] — جو وعظ و نصیحت کرتا ہے،

---

[1] احسن التقاسیم ص ۳۲۷۔ بڑی بڑی مسجدوں میں امام اور خطیب مسجد سے متصل اپنے حجروں میں رہتے تھے اور
خطبہ اور نماز کے قریب نکلتے تھے دہلی کی جامع مسجد میں آج تک یہ دستور قائم ہے [2] کتاب الانساب ورق ۷

جو علمائے دین خاص طور سے مذکر کے لقب سے مشہور ہوئے، ان میں سے چند یہ ہیں :۔
(۱) ابو محمد عبد الواحد ابن احمد زہری المذکر صائم الدہر تھے، ہر دوسرے دن قرآن ختم کرتے مشہور صحابی حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ کی اولاد میں سے تھے، ۳۸۲ھ میں انتقال فرمایا (۲) محمد بن عبد اللہ بن عبد العزیز بن شاذران المذکر رازیؒ بڑے شیریں زبان اور بلند کہ بزرگ علم حدیث کے ساتھ تصوف کے اسرار وحقائق کے بھی عارف تھے، ۳۷۶ھ میں وفات پائی۔
(۳) ابوبکر محمد بن علی بن حسین المذکر نیساپوری، آپ کوچہ عیسی بن ماسرجس کی مسجد میں وعظ و تذکیر فرماتے تھے، ۳۴۸ھ میں وفات پائی (۴) ابو العباس احمد بن محمد بن علی بن عمر المذکر نیساپوری متوفی ۳۶۴ھ (۵) ابو محمد عبد اللہ بن ابی القاسم عمر بن عبد اللہ ابن ہثیم المذکر اصفہانی بڑے دیندار اور فاضل بزرگ تھے، حدیث کے بھی بڑے عالم تھے[۱]۔

بعد میں یہ لقب واعظ کے ہم معنی ہو گیا، اور چوتھی صدی تک وہ واعظ، مذکر کے خطاب سے یاد کئے جانے لگے جو فن وعظ و تذکیر میں مہارت رکھتے تھے، علامہ مقدسی بشاری نے احسن التقاسیم میں (جو ۳۷۵ھ کی تصنیف ہے) ہر اقلیم اور ہر مقام کے مذکروں کا حال بیان کیا ہے، مثلاً اقلیم شام کے شہر ایلیا کے بیان میں لکھتے ہیں :۔

والمذکرون بہ قصاص[۲] — ایلیا کے مذکر قصہ گو ہوتے ہیں۔

اقلیم خراسان کے بیان میں لکھتے ہیں :۔

وللمذکرین بہ صیت عجیب[۳] — یہاں مذکروں کی بڑی شہرت ہے۔

اقلیم دیلم کے بیان میں لکھتے ہیں :۔

ورسمھم بجرجان ان التذکیر للفقہاء واھل الروایات[۴] — جرجان میں رسم ہے کہ وعظ و تذکیر فقہاء اور اہل روایات کے لیے مخصوص ہے۔

رے کے بیان میں ہے :۔

---

[۱] کتاب الانساب ورق ۵۱۸ [۲] احسن التقاسیم ص ۱۸۲ [۳] ص ۳۲۳ [۴] ص ۳۸۶

ولمذکّریھم فنٌّ[1] — یہاں کے مذکروں کو تذکیر کا فن آتا ہے۔

اقلیم سندھ کے بیان میں ہے:۔

ولیس للمذکرین بہ صیت — یہاں پر مذکروں کا چرچا نہیں ہے اور نہ

ولا لھم رسوم تذکیر[2] — یہاں کے باشندوں میں اس کا رواج ہے

چوتھی صدی کے بعد مذکر کا رواج کم ہوگیا اور اس کی جگہ واعظ کے لقب نے لے لی۔

واعظ مذکر اور واعظ دونوں تقریباً ہم معنی ہیں، مگر واعظ کی اصطلاح مذکر کے مقابلہ نئی ہے، علامہ سمعانی نے چند مشہور واعظوں کے نام لکھے ہیں، جیسے (۱) ابوالقا... بکر بن شاذان الواعظ، متوفی ۴۰۵ھ (۲) ابونصر عبدالرحمٰن بن محمد بن جعفر عقیلی الواع... متوفی ۴۳۲ھ[3]

واعظوں کی فہرست بہت طویل ہے، اور بڑے بڑے علماء اس لقب سے مشہور رہیں

محتسب محتسب کا لفظ ان حضرات کے لیے بولا جاتا ہے جو عام مسلمانوں کے احتساب حسبہ کی خدمت انجام دیتے تھے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ... تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں:۔

ھو ان یامر الناس وینھی عن المنکر — احتساب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام ہے۔

اس خدمت پر مامور حضرات محتسب کے لقب سے پکارے جاتے تھے، چنانچہ (۱) ابوع... بن حسن بن یحییٰ بن اشعث بخاری المحتسب (۲) فقیہ ابوحفص احمد بن احمد بن حمران الحـ... (۳) ابونصر منصور بن محمد بن احمد بن حرب المحتسب (۴) ابوالحسن احمد بن علی بن حسین المحتسب اس خدمت کو انجام دیا کرتے تھے۔[4]

مسلمانوں کے دورِ اقبال میں محکمۂ احتساب ہر سلطنت میں رہتا تھا، آج کل ...

---

[1] احسن التقاسیم ص ۳۹۱ [2] ص ۴۸۱ [3] کتاب الانساب ورق ۵۷۷، [4] کتاب الانسا...

ب میں محتسب کو مطوّع کہتے ہیں، ہمارے ملک ہندوستان میں بھی مسلمان بادشاہوں کے دور
ن یہ محکمہ قائم تھا۔

اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئیں، جن میں احتساب کے حدود و شرائط اور اس کے آداب
ان کیے گئے، ہمارے علم میں اس موضوع پر سب سے پہلی اور جامع کتاب امام یحییٰ بن عمر الکنانی
لسی قیروانی متوفی ۲۸۹ھ کی احکام السوق ہے جس میں اسلام کے شہری حقوق اور بازار کے
ظام کے احتساب کا مفصل بیان ہے، نیز حضرت شیخ سنانی دہلوی کی کتاب نصاب الاحتساب
ن فن میں مشہور ہے، اور حال میں محتسب اسلام کے نام سے اس موضوع پر اردو میں ایک
اب لکھی گئی ہے۔

زکی — مزکی کا لفظ تزکیہ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی صفائی کرنے اور اسلامی عدالت کے گواہوں کے
بارے میں صحیح معلومات بہم پہونچا کر ان کی توثیق کرنے کے ہیں علامہ سمعانی کا بیان ہے:

ھذا اسم لمن یزکی الشھود	مزکی اس شخص کو کہتے ہیں جو گواہوں کی تحقیق
ویبحث عن حالھم ویبلغ	کرکے ان کے صحیح حالات معلوم کرتا ہے اور
القاضی حالھم۔	قاضی کو ان کی خبر دیتا ہے۔

مزکیوں میں یہ حضرات زیادہ مشہور ہیں (۱) ابوحامد احمد بن ابراہیم بن محمد بن یحییٰ المزکی،
ان کے والد بھی مزکی تھے، نہایت صالح اور اپنے زمانہ کے عبّاد و زہّاد میں سے تھے (۲) ابوالفضل
زکی مشہور مزکی اور محدث عصر تھے (۳) ابواسحٰق ابراہیم بن محمد بن یحییٰ المزکی، نیشاپور کے
ب سے بڑے عالم تھے (۴) اور ان کے بیٹے یحییٰ بن ابراہیم المزکی بھی اسی عہدہ پر فائز تھے،
یہ عہدہ ذاتی قابلیت کی بنا پر دیا جاتا تھا، مگر بعض خاندان کے افراد نسلاً بعد نسلٍ اس
دمت پر مامور ہوا کرتے تھے، علامہ سمعانی کا بیان ہے:۔

واشتھر بھذا النیسابوربیت	مزکی کے عہدہ میں نیسا پور کا ایک بڑا
کبیر فیھم جماعۃ من المحدثین	خاندان مشہور ہے جس میں بڑے بڑے

الکبار[1] محدث ہوئے ہیں۔

ابو اسحٰق ابراہیم مزکی اور ان کے صاحبزادے یحییٰ بن ابراہیم مزکی اسی خاندان کے افراد تھے
تزکیہ کی صورت یہ ہوتی تھی کہ جو لوگ اس عہدہ پر رکھے جاتے تھے وہ اسلامی عدالت
کے گواہوں کے حالات اور معاملات کی تحقیق کرتے اور ان کے ظاہری اور باطنی امور
بھی تفتیش کرتے، ان کے دفتروں میں علاقہ وار لوگوں کے نام، پتے اور حالات کی تفصیل
ہوتی اور بوقت ضرورت عدالتیں گواہوں کے بارے میں ان سے معلومات حاصل کیا کرتی
علامہ مقدسی بشاری خراسان کے ذکر میں لکھتے ہیں:-

ویشھد کل واحدٍ فی کل شیٔ	اس ملک میں ہر شخص ہر معاملہ میں گواہی دیتا ہے
غیر ان فی کل بلد عدۃ من	البتہ ہر شہر میں متعدد مزکی ہوا کرتے ہیں جن کا
المزکین، فان طعن الخصم	کام یہ ہے کہ اگر ایک فریق دوسرے فریق
علی الشاھد سئل عنہ	کے گواہ کو جھوٹا کہتا ہے یا اس میں عیب
المزکی ولا یتحنک فیہ الا	نکالتا ہے تو اس کے بارے میں مزکی سے
فقیہ او رئیس[2]	سوال کیا جاتا ہے اور اس مرتبہ پر فقیہ یا
	رئیس فائز ہوتا ہے۔

چونکہ یہ عہدہ اس اعتبار سے بہت اہم اور ذمہ دارانہ ہوا کرتا تھا کہ عامۃ المسلمین کے
میں اچھے برے ہونے کی رائے قائم کی جاتی تھی اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوا کرتا تھا، اس
اس منصب کے لیے بہت ہی ثقہ اور معتبر حضرات منتخب کیے جاتے تھے۔

معدّل | معدّل بھی تقریباً مزکّی کے ہم معنیٰ ہے۔ علامہ سمعانی لکھتے ہیں:-

ھذا اسم لمن عدّل وزکّی	معدل اس شخص کا نام ہے جو تعدیل و تزکیہ کر
وقبلت شھادتہ عند القضاۃ	اور اس کی شہادت قاضیوں کے نزدیک معتبر و مقبول

---

[1] کتاب الانساب ورق ۵۲۶ [2] احسن التقاسیم ص ۳۲۷۔

معدّلین ہیں (۱) ابوالحسن علی بن محمد بن عبداللہ المعدّل اور (۲) ابونصر احمد بن عبدالباقی المعدل زیادہ مشہور ہیں[1]

مولانا یہ لقب دو لفظوں سے مرکب ہے "مولا اور متکلم کی ضمیر "نا" مولا کے معنی یہاں پر آقا سردار اور محترم کے ہیں۔ یہ لقب اس ترکیبی شکل میں عہدِ رسالت میں نظر نہیں آتا عہدِ صحابہ و تابعین میں علمائے دین اور امرا کے لیے یہ رائج ہوا، چنانچہ علامہ ابن سعد نے حضرت امام حسن بصری متوفی ۱۱۰ھ کے حال میں لکھا ہے:۔

ان انس بن مالک سئل	حضرت انس بن مالکؓ سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا تو
عن مسئلۃ فقال علیکم	آپ نے سائلوں سے فرمایا کہ تم لوگ مولانا حسنؓ
مولانا الحسن، فقالوا یا ابا	کے پاس جاؤ، اس پر انہوں نے کہا کہ اے ابوحمزہ!
حمزۃ نسئلک وتقول	ہم آپ سے مسئلہ پوچھتے ہیں اور آپ فرماتے ہیں
سلوا مولانا الحسن فقال	کہ مولانا حسن سے پوچھو، اس پر آپ نے فرمایا کہ
انا سمعنا وسمع فحفظ ونسینا[2]	ہم نے اور حسن نے علم پڑھا اور سنا، مگر انہوں نے یاد رکھا اور ہم بھول گئے!

اس روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حسن بصری کے لیے مولانا کا لقب استعمال فرمایا ہے اور سائلوں نے بھی اسے دہرایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام کے دور میں اس کا استعمال شروع ہو چکا تھا البتہ عام رواج نہیں ہوا تھا۔

اسی طرح ابن ندیم نے ایک شیعی فقیہ حسن بن محبوب سراد (زراد) کے تذکرے میں لکھا ہے

من اصحاب مولانا الرضا	یہ فقیہ مولانا رضا اور ان کے صاحبزادے محمد
و محمد ابنہ[3]	کے شاگردوں میں سے ہے۔

امام رضا کو مولانا کے لقب سے یاد کرنا ان کے دور میں اس کے رواج کی شہادت ہے

[1] کتاب الانساب ورق ۵۶۶ [2] طبقات ابن سعد جلد ۷ قسم اول ص ۱۲۸۔ [3] کتاب الفہرست ص ۳۰۹

البتہ اس زمانہ میں یہ لقب صرف علمائے دین کے لیے خاص نہ تھا، بلکہ خلفاء، سلاطین امراء وزراء اور دوسرے اکابر کے لیے بطور تعظیم کے استعمال ہوتا تھا، چنانچہ امیر مصر کافور اخشید متوفی ۳۵۶ھ کے تذکرے میں علامہ ابن خلکانؒ نے ابوالفضل بن سحباس کا یہ دعائیہ جملہ نقل کیا ہے:

ادام اللہ ایام مولانا[1]   مولانا کے اقبال کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ قائم رکھے

اسی طرح ابو احمد عسکری متوفی ۳۸۲ھ نے ایک موقع پر صاحب بن عباد کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

تفاولت عن السقوط بحضرۃ   یعنی میں نے یہ لفظ دوسری طرح مولانا کے سامنے
مولانا۔   بدفالی کے خیال سے استعمال کیا ہے۔

مگر بعد میں اس کا عام استعمال علمائے دین کے لیے رہ گیا اور امراء و سلاطین کے لیے بہت کم استعمال ہوا:

مولوی علمائے دین اور ارباب عزت و شرف کے لیے مولوی کا لقب غالباً چھٹی صدی کی پیداوار ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالص عجمی اور ترکی ذہن کی پیداوار ہے۔ صاحب غیاث اللغات نے لفظ مولوی کی تحقیق میں لکھا ہے:

"مولوی بفتح میم و فتح لام منسوب بمولا بمعنی خداوند است، بعد الحاق یائے نسبت الفے کہ رابع بود بواو بدل شد، زیراکہ الف مقصورہ در آخر کلمہ سہ حرفی بوقت نسبت بواو بدل می شود"[2]

"یعنی مولوی مولا کی طرف منسوب ہے اور نسبت کے وقت آخر کا الف واؤ سے بدل گیا۔"

گویا جس طرح مولانا میں مضاف مضاف الیہ کی ترکیب ہے، اسی طرح مولوی میں بھی ہے، ا[ور] مولانا کے آخر میں جمع متکلم کی ضمیر ہے اور مولوی میں واحد متکلم کی، جو صحیح نہیں ہے، اس کی دلیل [یہ ہے] کہ اگر مولوی مضاف اور مضاف الیہ سے مل کر بنا ہوتا تو پھر اس کے شروع میں الف اور لام

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲ [2] غیاث اللغات لفظ مولوی۔

نہیں ہو سکتے تھے، حالانکہ عام طور سے "المولوی" لکھا جاتا ہے، چلپی نے کشف الظنون میں جگہ جگہ مصنفین کے نام کے ساتھ المولوی لکھا ہے۔ چنانچہ جلال الدین رومی المولوی، اور شیخ اسمٰعیل القروی المولوی الف اور لام کے ساتھ درج ہے[1]۔ اس قسم کی اور بہت سی مثالیں کشف الظنون اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

ابتداء میں مولانا کی طرح مولوی کا لقب امراء و سلاطین کے لیے بھی بولا جاتا تھا، چنانچہ جب سلطان مصر محمد بن قلاوؤں نے ابو الفداء کو حماۃ (شام) کی سلطنت دی تو ان کو جن القاب سے نوازا ان میں مولوی کا بھی لقب شامل تھا، ملاحظہ ہو۔

المقام الشریف العالی المولوی السلطانی العمادی الملکی المؤیدی[2]۔

یہ ابو الفداء صاحب حماۃ کے سلطانی القاب ہیں المولوی ہے اور الف لام کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔

لفظ مولوی کی عظمت و اہمیت کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ سلطان مصر محمد بن قلاوؤن نے اپنے تمام امراء کو حکم دیا تھا کہ وہ الملک المؤید ابو الفداء کے القاب میں لفظ مولوی بھی استعمال کیا کریں، مگر خود محمد بن قلاؤوں جب کبھی ابو الفداء کو خط لکھتا تو "مولوی" کا لفظ نہیں لکھتا تھا، اس لیے کہ اس نے ابو الفداء کو حماۃ کی حکومت دی تھی، اس لقب کی عظمت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا جلال الدین رومی جیسے زبردست عالم کو مولوی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

مثنویِ مولوی معنوی — ہست قرآں در زبانِ پہلوی

مولانا روم خود فرماتے ہیں:

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم — تا غلامِ شمسِ تبریزی نہ شد

ہماری زبان کے ایک شاعر نے کہا ہے:

---

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۰۹ [2] تاریخ صلاح صفدی۔

علمِ مولیٰ ہو جسے، ہے مولوی جیسے حضرت مولوی معنوی

آٹھویں صدی کے بعد سے مولوی کا لقب خاص طور سے علمار اور مدرسین کے لیے استعمال ہونے لگا اور اس کا رواج زیادہ تر علمائے روم میں ہوا حتیٰ کہ بعض علمار "مولوی زادہ" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ملاّ، منلا اور مُولی ملا، منلا اور مولی کے القاب بھی مولوی کے ساتھ کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں ان کا استعمال بھی اہلِ علم کے لیے علمائے روم سے شروع ہوا، یہ القاب بھی بڑے باعظمت شمار کیے جاتے تھے، اور ان کا استعمال اساطین علم وفضل کے لیے ہوا کرتا تھا، کشف الظنون میں متاخرین میں سے بڑے بڑے ماہرین علم وفن اور مصنفین کے لیے یہ القاب ملتے ہیں چنانچہ حضرت شیخ عبدالرحمٰن جامی کو ملا اور منلا کہا جاتا ہے، ملا جلال اور بیضاوی کے محشی ملا عوض کے ساتھ یہ لقب لازمی طور سے بولا جاتا ہے، نیز متاخرین میں ملا محمود جونپوری، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، ملا مبین، ملا محب اللہ بہاری، ملا مسکین اور ملا علی قاری وغیرہ مشاہیرِ علم وفن گزرے ہیں۔

استاذ استاد عجمی لفظ ہے، اس کو عربی میں عام طور سے استاذ یا لذال لکھتے ہیں، غالباً اس کا استعمال تیسری صدی سے شروع ہوا ہے، ابتدا میں ہر فن وعلم کے سکھانے والے کو اس لقب سے یاد کیا جاتا تھا، بلکہ بعض امرا کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ علامہ سمعانی کتاب الانساب میں لکھتے ہیں کہ ابو محمد عبداللہ بن محمد بن یعقوب بن جرف بخاری سبذمونی ..... کا لقب استاذ ہے، وہ امیر اسماعیل بن احمد سامانی کے دربار میں علمی سوالات کے جوابات دیا کرتے تھے:۔

عرف بالاستاذ لانہ کان	آپ استاذ کے لقب سے اس لیے مشہور ہوئے
یختص بدار الامیر الجلیل	کہ امیر اسمٰعیل بن احمد سامانی کے دربار میں
اسماعیل بن احمد السامانی	لوگ ان سے ہر قسم کی باتیں دریافت کرتے

ویسئلونه فیها عن اشیاء — تھے اور وہ ان کے جوابات دیا کرتے تھے، اسی
فیجیب فعرف بالاستاذ[1] — لیے وہ استاذ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

علامہ ابن جبیر نے بغداد کے خلیفہ ابوالعباس احمد الناصر لدین اللہ کے حال میں لکھا ہے کہ اس خلیفہ کا ایک قیم اور امین ہے جو دار الخلافہ اور حرم کے جملہ امور کو انجام دیتا ہے۔ اور تمام سامان اور ضروریات کا ذمہ دار ہے۔

یعرف بالصاحب مجد الدین — یہ شخص صاحب مجد الدین استاذ الدار
استاذ الدار وھذا لقبہ[2] — کے لقب سے مشہور ہے۔

استاذ سبد موئی اور صاحب مجد الدین استاذ الدار کے علاوہ اور کئی اہل فن اور امراء اس لقب سے مشہور ہیں مثلاً (۱) استاذ ابو اسمٰعیل حسین بن علی بن عبد الصمد اصفہانی (۲) استاذ ابراہیم موصلی (۳) استاذ ابو اسحٰق ابراہیم بن احمد بن مہران اسفرائینی (۴) استاذ رکن شافعی فقیہ متوفی ۴۱۸ھ، (۵) استاذ ابو منصور عبد القاہر بن محمد بغدادی شافعی فقیہ متوفی ۴۲۹ھ (۶) شیخ محی الدین ابو سعد محمد ابن یحییٰ نیشاپوری شافعی متوفی ۵۴۸ھ کے متعلق علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ:۔

استاذ المتاخرین واوحدھم — وہ متاخرین کے استاذ اور علم و تقویٰ میں
علماً و زھداً۔ — یکتا ہیں۔

(۷) استاذ ابو المنصور بغدادی (۸) امام عبد القادر بن طاہر بن محمد شافعی متوفی ۴۲۹ھ[3] وغیرہ اس لقب سے مشہور ہیں، امراء میں استاذ کافور ابو المسک بن عبد اللہ اخشیدی زیادہ مشہور ہے، جو مصر کا امیر تھا، اور امیر کافور اخشیدی کے نام سے مشہور تھا، یہ لقب اس قدر عام تھا کہ اہل علم و فضل اور امراء و سلاطین سے لے کر گانے بجانے کے استادوں تک کو اس سے یاد کیا

---

[1] کتاب الانساب لفظ سبد موئی۔ [2] رحلۃ ابن جبیر ص ۱۷۵، [3] ان حضرات کے تذکرہ کے لیے تاریخ ابن خلکان ملاحظہ ہو۔

جاتا تھا اور اب تک اس کی یہ عمومیت باقی ہے۔

شیخ الاسلام وغیرہ ابتدا میں شیخ کا لقب عام طور سے اہل علم وفضل کے لیے کسی خاص فن یا خاص علم یا خاص مقام وقوم کی طرف نسبت کے ساتھ یہ لفظ بولا جاتا تھا، مثلاً شیخ الحرم امام ابن ابی ملیکہؒ، شیخ الحرم حضرت فضیل بن عیاضؒ، شیخ الکوفہ امام ابو عمر حکم بن عقیلہ کندیؒ، شیخ الدیار المصریہ امام لیث بن سعدؒ، شیخ السنۃ امام ابو بشیر ورقا بن یشکریؒ وغیرہ۔

پہلی صدی ہی میں شیخ کا لقب قرآن وحدیث اور فقہ کے معلمین واساتذہ کے لیے بھی استعمال ہونے لگا اور اس کی جمع عام طور سے شیوخ استعمال کی گئی۔ اس کے بعد جب اس کا استعمال امت کے عبّاد وزہّاد اور صلحاء واولیاء کے لیے ہونے لگا تو اس کی جمع عموماً مشائخ استعمال ہونے لگی۔

عہد تابعین وتبع تابعین میں شیخ کی نسبت مقام وفن سے ترقی کر کے اسلام کی طرف بھی ہونے لگی، اور اعیان علم وفضل اور ائمہ وقت کے لیے شیخ الاسلام کی ترکیب رائج ہوئی، علامہ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں اس کو استعمال کیا ہے[1] اور (۱) شیخ الاسلام حضرت عبد اللہ بن مبارک (۲) شیخ الاسلام امام حماد بن سلمہؒ (۳) شیخ الاسلام ابو بسطام شعبہ بن حجاجؒ (۴) شیخ الاسلام امام مالکؒ (۵) شیخ الاسلام امام سفیان ثوری رحمہم اللہ کے لیے یہ لقب ملتا ہے۔

ابتدائی دور میں یہ لقب حقائق پر مبنی ہوا کرتا تھا اور جن بزرگان دین اور ائمہ اسلام کے لیے استعمال ہوتا تھا وہ اس کے اہل ہوا کرتے تھے، مگر بعد میں اس میں افراط وتفریط ہونے لگی اور ایسے لوگوں کو یہ لقب دیا جانے لگا جو اس کے اہل نہیں تھے، پانچویں صدی کا واقعہ ہے جس کو علامہ ابن خلکان نے شیخ الاسلام ابو الحسن علی بن احمد بن یوسف ہکّاری متوفی ۴۸۶ھ کے تذکرے میں لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

وسمعت ان بعض الأکابر میں نے سنا ہے کہ بعض اکابر نے امام ہکّاری سے کہا کہ

---

[1] ان حضرات کے تذکرے کے لیے تذکرۃ الحفاظ ملاحظہ ہو۔

قال لہ انت شیخ الاسلام آپ شیخ الاسلام ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ میں شیخ الاسلام
فقال انا شیخ فی الاسلام۔[1] (اسلام کا شیخ) نہیں ہوں، البتہ شیخ فی الاسلام
(اسلام میں ایک شیخ) ہوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ہکاری کے نزدیک اس لقب کی کیا عظمت و اہمیت تھی اور وہ اپنی ذات کو اس لقب کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔

چھٹی صدی میں شیخ الاسلام کی طرح شیخ الشیوخ کا ایک لقب جاری ہوا اور اس کی ترویج زاویوں اور خانقاہوں سے یوں ہوئی کہ مصر میں خانقاہوں کی تولیت و شیخیت کے لیے علماء و فقہاء اور محدثین کا انتخاب ہوتا تھا، اور علماء و صوفیا کی تعلیم و تربیت سے لے کر خانقاہوں کے جملہ انتظامات تک ان کے سپرد ہوتے تھے، چنانچہ قاہرہ کی خانقاہ صالحیہ کے لیے سلطان صلاح الدین ایوبی نے ایک شیخ کو مقرر کیا اور ان کا لقب شیخ الشیوخ رکھا، اس کے بعد سے خانقاہوں کے ہر شیخ کو شیخ الشیوخ کہنے لگے،[2] خانقاہ صالحیہ کے شیخ الشیوخ قاضی القضاۃ تقی الدین عبد الرحمٰنؒ جیسے یگانۂ روزگار بھی رہ چکے ہیں، خانقاہ بیبرس کے شیخ الشیوخ ۷۳۶ھ میں حضرت شہاب الدین مقرر کئے گئے، خانقاہ شیخو کے شیخ الشیوخ حضرت شیخ اکمل الدین محمد بن محمود تھے، سریاقوس کی خانقاہ سلطان الملک الناصر محمد بن قلاوون نے ۷۲۵ھ میں بنوائی، اور اس میں شیخ مجد الدین موسیٰ ابن احمد بن محمود اقصرائی کو شیخ الشیوخ مقرر کیا، اس سے پہلے خانقاہ سعید السعداء کے شیخ کو شیخ الشیوخ کہا جاتا تھا، خانقاہ ارسلان کے شیخ الشیوخ حضرت تقی الدین ابو البقاء محمد بن جعفر ابن محمد بن عبد الرحیم حسینی قنائی شافعی متوفی ۷۲۸ھ مقرر کئے گئے اسکے شیخ الشیوخ قاضی القضاۃ صدر الدین عبد الوہاب بن احمد اخنائی متوفی ۷۸۹ھ اور ان کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ شمس الدین محمد بھی رہ چکے تھے، اسی طرح خانقاہ بکتمر (جس کی تعمیر ۷۲۶ھ میں ہوئی) کے پہلے شیخ الشیوخ شمس الدین رومی تھے، خانقاہ قوصون (جس کی تعمیر ۷۳۶ھ میں ہوئی) کے شیخ الشیوخ

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۷۷، ۳۷۶ [2] کتاب الخطط والآثار مقریزی ج ۴ ص ۲۷۳۔

شمس الدین ابو الثنار محمود بن ابو القاسم احمد اصفہانی منتخب ہوئے۔ ان کو اس خانقاہ کی طرف سے سالانہ تنخواہ کے علاوہ کھانا، صابون، تیل، حتیٰ کہ ان کے سائز کا کپڑا بھی ملتا تھا، اور یہ تمام چیزیں ان کے بعد ہر شیخ الشیوخ کے لیے جاری رہیں، خانقاہ طغانی نجمی کے شیخ الشیوخ حضرت برہان الدین رشیدیؒ تھے، اور خانقاہ خردیہ میں امام شمس الدین محمد بن حمنی دمشقی حنبلی کو شیخ الشیوخ مقرر کیا گیا تھا۔[1]

اخیر دور میں ترکی میں مشیخۃ الاسلام کا ایک خاص عہدہ مقرر ہوا، اور وقت کے جلیل القدر عالم کو اس عہدہ پر فائز کر کے "شیخ الاسلام" کے لقب سے پکارا جانے لگا، یہ منصب سرکاری ہوتا تھا اور سلطان کے بعد سب سے بڑا مرتبہ شیخ الاسلام سمجھا جاتا تھا، ہندوستان میں آج کل شیخ الحدیث، شیخ التفسیر، شیخ الفقہ اور شیخ الادب کا اطلاق ان علوم و فنون کے پڑھانے والے مدرسین پر ہوتا ہے، یہ اصطلاح خالص ہندوستانی معلوم ہوتی ہے، شیخین (تثنیہ) کی اصطلاح امت مسلمہ کی برگزیدہ ہستیوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، مثلاً حضرات خلفائے راشدین میں شیخین حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما، محدثین میں امام بخاری و امام مسلم رحمہما اللہ، ائمہ احناف میں امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ ہیں۔

قطب الدین اور شمس الدین وغیرہ قطب الدین، شمس الدین وغیرہ دین کی نسبت کے القاب بہت بعد کی پیداوار اور اس ذہن کا نتیجہ ہیں جو اسلامی علوم و معارف پر عجمی خیالات و تصورات کے رنگ میں چوتھی صدی ہجری اور اس کے بعد سے چھانے لگا تھا، صدر اسلام سے لے کر صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کے دور تک علماء و امراء کے لیے اس قسم کے القاب کا کوئی نشان نہیں ملتا، مگر پانچویں صدی کے بعد سے اس کی بھرمار ہو گئی، طوائف الملوکی کے امیروں، مذاہب کے عالموں اور طریقت کے مشائخ میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو "الدین" کی نسبت کے لقب سے ملقب نہ ہو۔

---

[1] کتاب الخطط والآثار مقریزی ج ۴ ص ۲۷۵، ۲۸۳، ۲۸۵، ۲۸۹، ۲۹۲۔

تیسری صدی تک جس طرح اربابِ علم و فضل اب، ابن، ام کی نسبت، یا مقام و فن کی نسبت یا کسی مخصوص عرفیت کے ساتھ مشہور ہوا کرتے تھے، اسی طرح پانچویں صدی کے بعد سے ان کے لیے دین کی طرف نسبت سے ان کی شہرت ہونے لگی، اس کے مقابلہ میں خال خال لوگ کنیت، نسبت اور عرفیت سے مشہور ہوئے، اس سلسلہ میں علامہ محمد بن جبیر اندلسیؒ متوفی ۶۱۴ھ کی تصریحات ملاحظہ فرمایئے۔ جنہوں نے چھٹی صدی کے وسط میں اندلس سے بلاد مشرق کا سفر کر کے اپنا سفرنامہ مرتب کیا۔ ملک شام کے شہر ونیصر کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔

وصاحب هذه البلدة قطب	ونیصر کا مالک قطب الدین ہے نیز یہ داری، اور
الدين، وهو ايضاً صاحب مدينة	ماردین اور راس العین کا بھی مالک ہے، یہ
داري، ومدينة ماردين،	بادشاہ ابنائے بابک کا قریبی رشتہ دار ہے،
وراس العين، وهو قريب	یہ علاقہ مختلف بادشاہوں کا ہے، جیسے
لابني بابك، وهذه البلدة	اندلس میں طوائف الملوکی کے بادشاہ ہیں
السلاطين شتّٰى كملوك طوائف	یہ سب کے سب القاب کے ایسے زیور سے آراستہ
الاندلس كلهم قد تحلّٰى بحلية	ہوتے ہیں جس کی نسبت دین کی طرف ہوتی
تنسب الى الدين، فلا تسمع الا القاباً	ہے، تم کو ہر طرف پرشکوہ القاب اور بے
هائلة وصفات لذى التحصيل	جوڑ صفات سننے میں آئیں گی، ان القاب و
غير طائلة، قد تساوى فيها	صفات میں عوام اور بادشاہ برابر ہوتے
السوقة والملوك واشترك	ہیں، اور مالدار و غریب میں فرق نہیں ہے،
فيها الغنى والصعلوك ليس	حالانکہ ان میں سے کوئی بھی ان میں سے کسی
فيهم من اسم يسمة به	صفت کا قائل نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کے
تليق، او اتصف بصفة هو	لائق ہوتا ہے، البتہ شام و مصر اور حجاز و
بها خليق الّا صلاح الدين	یمن کا بادشاہ صلاح الدین ایوبی جو کہ

صاحب الشام و دیار مصر و الحجاز	بزرگی اور انصاف میں مشہور ہے، یہ نام
و الیمن، المشتھر بالفضل والعدل	اس کی ذات کے موافق اور یہ لفظ صحیح
فھذا اسم وافق مسماہ ولفظ طابق	معنی کے مطابق ہے اس کے علاوہ ہوا کے
معناہ، وما سوی ذالك فی سواہ	جھونکے، مجروح شہادتیں اور دین کی
فزعازع ریح و شھادات بردھا	نسبت کے بے کیف و کم دعوے ہیں اور
التجریح ودعوی نسبۃ للدین برئت تلویح	ان پر یہ شعر صادق آتا ہے۔
القاب مملکۃ فی غیر موضعھا	حکومت و مملکت کے القاب کا بیجا استعمال جس پر ہوتا ہے وہ
کالھر یحکی انتفاخا صولۃ الاسد[1]	اس بلی کے مانند ہے جو بھاری بھرکم بن کر شیر کے حملہ کی نقل کرے

علامہ ابن جبیر اہل دمشق کے یہاں مردوں کی تجہیز و تکفین کے مراسم میں لکھتے ہیں کہ جب تعزیت کے لیے اعیان و اشراف آتے ہیں اور اپنے القاب کے ساتھ پکارے جاتے ہیں تو ان القاب کا استعمال اس طرح ہوتا ہے:۔

ونقباء الجنائز یرفعون اصواتھم بالنداء	جنازے کے نقیب تعزیت میں آنے والے شہر
لکل واصل للعزاء من محتشمی البلد تلقو	کے اعیان و اشراف کے نام بلند آواز سے پکارتے
اعیانھم ویحلونھم بخططھم الھائلۃ التی	ہیں اور دین کی نسبت کے جو پرشکوہ القاب
قد وضعوھا لکل واحد منھم بالاضافۃ	ہر ایک کے ہوتے ہیں ان کا مظاہرہ کرتے ہیں
الی الدین فتسمع ماشئت من صدر الدین	چنانچہ تم اس طرح کے بے انتہا تے بنائے ۔
او شمسہ، او بدرہ، او نجمہ او زینہ، او	القاب سن سکتے ہو جیسے صدر الدین شمس الدین
بھائہ، او جمالہ او مجدہ، او فخرہ او شرفہ او	بدر الدین، نجم الدین، زین الدین، بہاء الدین
معینہ، او محییہ، او زکیہ او نجیبہ الی	جمال الدین، مجد الدین، فخر الدین شرف الدین
ما لا غایۃ لہ من ھذہ الالفاظ الموضوعۃ	معین الدین، محیب الدین، زکی الدین،

---

[1] رحلۃ ابن جبیر اندلسی طبع مصر ص ۲۸۶۔

وتتبعها، ولا سیما فی الفقہاء بماشئت ایضًا من سیّن العلماء وجمال الائمۃ، وحجۃ الاسلام و فخر الشریعۃ و شرف الملۃ و مفتی الفریقین الیٰ مالا نہایۃ لہ من ھٰذہ الالقاب المحالۃ الخ [۱] نجیب الدین وغیرہ، اور ہر طبقہ خصوصًا فقہاء میں دوسرے شاندار قسم کے بے موقع اور بے محل القاب پاؤ گے۔ مثلاً سید العلماء، جمال الائمہ، حجۃ الاسلام، فخر الشریعۃ، شرف الملۃ، مفتی الفریقین، وغیرہ۔

دالدین کی نسبت کے القاب کا رواج اس قدر زیادہ اور عام ہو گیا کہ بہت سے علماء کے اصل نام پر پردہ پڑ گیا، چنانچہ شیخ جلال الدین رومیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، امام فخر الدین رازیؒ اور اسی طرح کے بہت سے مشہور علماء کے اصل نام کتابوں کی مراجعت کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے۔

آخر میں ان القاب سے عوام و خواص کی اس قدر دلچسپی بڑھ گئی کہ لوگوں نے ان کو مستقل نام بنا لیا اور یہ صورت آج تک قائم ہے، جس کی وجہ سے ان القاب کی عظمت و اہمیت ختم ہو گئی اور ہر چھوٹے بڑے، جاہل اور عالم کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

صاحب صاحب کا لفظ ابتدا میں عام طور سے تلمیذ اور شاگرد کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور اس کی جمع اصحاب، تلامذہ کے معنی میں آتی تھی، جیسے عبد الرحمٰن بن ہرمز الاعرج متوفی ۱۱۷ھ صاحب ابی ہریرہؓ، اشعث بن عبد الملک متوفی ۱۴۶ھ صاحب الحسن البصریؒ معمر بن راشد متوفی ۱۵۳ھ صاحب عبد الرزاق، غندر متوفی ۱۹۴ھ صاحب شعبہؒ، اور اصحاب ابی حنیفہؒ، اصحاب شافعیؒ، اور اصحاب مالکؒ وغیرہ، اس کے مقابلہ میں استاذ کے لیے شیخ اور شیوخ بولا جاتا تھا۔

صاحب کے لفظ کے ذریعہ علماء کے خاص خاص علوم و فنون کو بھی ظاہر کیا جاتا تھا، مثلاً محمد بن اسحاق صاحب المغازی، ابو صالح صاحب التفسیر، امام زفر صاحب الرائے وغیرہ اسی طرح

---

[۱] رحلہ ابن جبیر اندلسی طبع مصر ص ۲۲۷

محدثین کو اصحاب الحدیث اور فقہاء کو اصحاب الرائے کہتے تھے،
اور اس کے ذریعہ علماء کی نسبت ان کی اہم تصنیفات کی طرف بھی کی جاتی تھی، مثلاً بخاری صاحب الصحیح، حمیدی صاحب الجمع بین الصحیحین، خطیب صاحب تاریخ بغداد، میدانی صاحب مجمع الامثال وغیرہ،
بعض مرتبہ اس کے ذریعہ مقامات و بلاد کی نسبت بھی ظاہر کی جاتی تھی، مثلاً محمد بن عبادہ صاحب قرطبہ اور عزالدین مسعود صاحب موصل وغیرہ۔
صاحب کے لقب کو نسبت اور شاگردی کے مفہوم سے الگ کر کے سب سے پہلے ابو القاسم اسمٰعیل بن عباد کے لیے استعمال کیا گیا، وہ مؤید الدولۃ بن بویہ کا معتمد و منصرم تھا مؤید الدولہ ابن بویہ کی صحبت و ہم نشینی کی وجہ سے اس کو یہ لقب ملا اور صاحب بن عباد مشہور ہوا، غالباً اس وقت سے امراء و خلفاء کے دربار و حرم سرا کے امور و معاملات کے امین و قیم کو صاحب کہنے لگے، کیونکہ وہ ہر وقت اس کی صحبت و معیت میں رہتے تھے، اور ان کو باہر نکلنے تک کی فرصت نہیں ملتی تھی، جیسا کہ ابن جبیر نے خلیفہ بغداد کے امین و قیم کے متعلق لکھا ہے کہ:-

یعرف بالصاحب مجد الدین استاذ الدار وھذا القیم و بیدہ علی لہ اثر الدعاء للخلیفۃ وھو قل ما یظھر للعامۃ اشتغالاً بما ھو بسبیلہ من امور تلک الدار وحراستھا والتکفل بمغالقھا وتفقدھا لیلاً ونھاراً[1]	یعنی یہ شخص صاحب مجد الدین استاذ الدار کے لقب سے مشہور ہے، اور خلیفہ کے حق میں دعا کرنے کے بعد ہی اس کے لیے دعا کی جاتی ہے، یہ شخص عوام میں بہت کم آتا ہے، کیونکہ وہ شاہی مکانات کے معاملات اور ان کی نگرانی اور تحقیق و تلاش میں رات دن مشغول رہتا ہے۔

پھر صاحب کا لفظ علماء اور دوسرے اعیان و اکابر کے ناموں کے شروع میں اضافت

---

[1] رحلۃ ابن جبیر ص ۱۷۵

کے ساتھ استعمال ہونے لگا جیسے صاحب الفضیلۃ، صاحب العزۃ، اور صاحب الجلالۃ وغیرہ، پھر ناموں کے آخر میں بغیر اضافت کے اس کا استعمال اخیر دور کی پیداوار ہے اور اس کا رواج غالبًا ہندوستان میں زیادہ ہوا، کیونکہ تاریخ و رجال کی کتابوں میں دوسرے ملکوں کے متاخرین کے نام کے آخر میں یہ لفظ نہیں ملتا، البتہ نسبت کے ساتھ غیر ممالک میں آج بھی جاری ہے اور ہندوستان میں عام طور سے مضاف الیہ حذف کر دیا جاتا ہے۔

جناب ناموں کے شروع میں جناب کا استعمال بالکل نیا ہے، عربی کے قدیم محاورے میں اس لفظ کا اطلاق اس طریقہ پر کسی دور میں نہیں ملتا، البتہ قرونِ وسطیٰ میں اعیان و اشراف کے ناموں کے شروع میں ان کی عظمت و اہمیت ظاہر کرنے کے لیے اس کا استعمال ہوا جیسے الی الجناب العالی اور الی جناب بکر مگر اس کا رواج عام طور سے امراء و سلاطین اور وزراء وغیرہ کے لیے ہوتا تھا، کیونکہ یہ لفظ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے ان ہی لوگوں کے لیے مناسب تھا، جناب کے لغوی معنی یہ ہیں:-

الجناب بالفتح الفناء وما قرب من محلۃ القوم[1] — جناب بفتح الجیم دروازہ کے باہری صحن اور محلہ کے آس پاس کی جگہ کو کہتے ہیں۔

گویا ابتدا میں جناب کا لفظ دربار اور ڈیوڑھی کے لیے استعمال ہوا مگر ہمارے یہاں ناموں کی ابتدا میں اس کا رواج محترم اور گرامی قدر کے معنی میں ہوتا ہے۔

حضرت اور حضور حضرت اپنے لغوی معنی میں ہر دور میں بولا جاتا تھا، اور آج بھی عربی میں اس کا استعمال اس طرح ہوتا ہے، اور اس کے معنی موجودگی، سامنے اور خدمت کے لیے جاتے ہیں، مگر ناموں کے شروع میں تعظیم و تکریم کے طور پر تیسری صدی کے بعد استعمال ہونے لگا، اس کی ابتدا غالبًا امراء، وزراء اور خلفاء و سلاطین سے ہوئی، جیسا کہ مولانا کے بیان میں گزر چکا ہے کہ ابو احمد عسکری متوفی ۳۸۲ھ نے ایک موقع پر صاحب بن عباد سے مشہور

---

[1] مختار الصحاح

جملہ سقطت علی الجبل کے بجائے "الجبل صادقت" کہا صاحب بن عباد نے اس پر اعتراض کیا تو ابو احمد نے جواب میں کہا
" تفاءلت عن السقوط بحضرۃ مولانا"[1] حضور کا بطور تعظیم استعمال بعد کی بات ہے۔

خاص خاص القاب مذکورۂ بالا القاب وخطابات عمومی ہیں اور ان کا اطلاق عام طور پر ہوتا ہے، ان کے علاوہ ایسے القاب بھی ہیں جو خاص خاص علمائے دین اور ارباب علم وفضل کے لیے استعمال ہوئے اور ان ہی تک محدود رہے، جیسے۔

ترجمان القرآن، ربانی الامت، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما،
حکیم الامت، حضرت ابو درداؓ اور حضرت ابو مسلم خولانیؒ،
باقر، امام محمد بن علی ابو جعفرؒ
زین العابدین، امام علی بن حسینؒ
صادق، امام جعفر بن محمدؒ
فقیہ الامت، امام مالکؒ
فقیہ العراق، امام ابراہیم نخعیؒ
فقیہ المدینہ، امام ابو الزنادؒ اور حضرت امام سعید بن مسیبؒ
مسند العراق، امام علی بن عاصم واسطیؒ
مفتی المدینہ، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ
مفتی مصر، امام مرثد بن عبد اللہؒ
امام اعظم، امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ
اسد السنۃ، امام اسد بن موسیٰؒ
خیاط السنۃ، امام زکریا سجستانی
امام الحرمین، امام ابو المعالی عبد الملک بن عبد اللہ جوینی شافعیؒ
جار اللہ، علامہ ابو القاسم محمود بن عمر و زمخشریؒ وغیرہ۔

---

[1] مقدمہ کتاب المصون فی الادب ص ۵ طبع کویت

(۸)

امام محمدؒ کی کتاب الحجۃ علیٰ اہل المدینہ

امہاتِ کتب سے احناف کی غفلت

لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے مخلص بانی اور صدر حضرت مولانا ابوالوفا صاحب افغانی کے تعاون سے ائمہ احناف کی امہاتِ کتب کو پہلی بار شائع کر کے حدیث و فقہ کے ذخیرہ میں بڑا قابل قدر اضافہ کیا ہے، اور کہنا چاہیے کہ فقہ حنفی کو براہ راست اس کے بانیوں اور اماموں کی کتابوں سے معلوم کرنے اور سمجھنے کی راہ پیدا کی ہے، ورنہ عام طور سے علمائے احناف نے اپنے اصلی ماخذوں سے ہٹ کر متاخرین علمائے عجم خصوصاً فقہائے ماوراء النہر کی کتابوں ہی کو سب کچھ سمجھ لیا تھا، جس سے اس الزام کو بڑی مدد ملی کہ فقہ حنفی احادیث و آثار سے ہٹ کر قیاس اور رائے پر مبنی ہے، قدیم علمائے حجاز و عراق کی معاصرانہ چشمک اور بعض متاخرین کی الزام تراشی کے بعد فقہ حنفی پر سب سے بڑا ظلم خود احناف نے یہ کیا ہے کہ انہوں نے امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ وغیرہ رحمہم اللہ کی اُن تصانیف و کتب کو بہت کم ہاتھ لگایا، جن میں دوسرے مکاتب فقہ کی طرح حنفی فقہ کے اصول و فروع کو کتاب و سنت اور آثار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے، اور صرف ضرورت کی حد تک قیاس اور رائے سے کام لیا گیا ہے۔

لجنۂ احیاء المعارف النعمانیہ نے ۱۳۴۸ھ سے دنیائے اسلام اور یورپ و ایشیا کے مختلف کتب خانوں کو کھنگال کر ائمۂ احناف کی گیارہ امہات کتب شائع کی ہیں، امام ابویوسفؒ کی کتاب الآثار، کتاب الرد علیٰ سیر الاوزاعیؒ، کتاب اختلاف ابی حنیفہؒ و ابی لیلیؒ، امام محمد بن

لہ قیمت ۲۵ روپے ملنے کا پتہ: لجنۂ احیاء المعارف النعمانیہ ۵۔۶۔۷۔۴ جلال کوچہ، حیدرآباد ۲

حسن شیبانیؒ کی الجامع الکبیر، کتاب النکت للسرخسی، شرح زیادات الزیادات للامام محمد، مختصر الطحاوی فی الفقہ، اور آخیر میں کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ للامام محمدؒ جیسی بیش بہا اور نادر و نایاب کتابیں دنیا کو پہلی بار اسی ادارے کی بدولت نصیب ہوئیں، اس کے صدر محترم اور ارکان اپنی اس خاموش اور ٹھوس علمی و دینی خدمت پر پوری دنیائے اسلام کے شکریہ کے مستحق ہیں، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اس ادارہ کے پاس نہ کوئی خاص سرمایہ ہے، نہ اس کا کوئی پروپیگنڈا ہے اور نہ اس کے ممبروں اور بہی خواہوں کی کوئی جماعت ہے، صرف توکل اور خدمت اس کا سرمایہ ہے۔ لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ کا تازہ شاندار کارنامہ حضرت امام محمد بن حسن شیبانی متوفی ۱۸۹ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ کی اشاعت ہے، اس کا پہلا حصہ حال ہی میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔

کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور فقہ حنفی کے ثالث الاثانی امام محمدؒ کوفہ میں امام ابوحنیفہؒ سے تعلیم حاصل کر کے مدینہ منورہ گئے، تاکہ وہاں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ مدینہ سے فقہ و حدیث کی تعلیم حاصل کریں، مدینہ منورہ میں تین سال رہ کر امام مالکؒ سے مؤطا کا سماع کیا، اس دوران میں ان سے اور اہل مدینہ سے فقہی مسائل پر جو بحث و مناظرے ہوئے ان کے حجج و دلائل کو قلمبند کر کے اس مجموعہ کا نام کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ رکھا، جب مدینہ سے عراق واپس ہوئے تو ان کے تلامذہ نے ان سے اس کتاب کی روایت کی، جن میں قاضی بصرہ امام عیسیٰ بن ابان ابن صدقہ متوفی صفر ۲۲۱ھ کی روایت زیادہ مشہور ہے۔ علمائے کوفہ نے اس کتاب کو بڑی اہمیت دی اور اس سے نفع اٹھایا، اور مدتوں عالم اسلام میں اس کا چرچا رہا۔ مگر ائمہ احناف کی بہت سی کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی متاخرین کی لاپروائی کی ایسی نذر ہوئی کہ اہل علم کی تلاش کے باوجود اس کا پتہ نہیں چلتا تھا، مگر اب فقہ اسلامی کا یہ عظیم الشان ذخیرہ علمائے اسلام کے سامنے آگیا ہے۔

قلمی نسخے اور ان کی تحقیق و تعلیق

اب سے ۲۰ سال پہلے لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ نے اس کی تلاش و جستجو شروع کی تھی، اور صرف مدینہ منورہ کے کتب خانہ محمودیہ میں اس کا ایک ناقص، نامکمل اور سقیم مخطوطہ مل سکا تھا، مزید تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ اس کے دو قلمی نسخے اور ہیں، ایک آستانہ کے کتب خانہ نور عثمانیہ میں، دوسرا حیدرآباد کے جامعہ نظامیہ کے کتب خانہ میں جسے مولانا انوار اللہ صاحب نے اپنے لیے مدینہ منورہ کے نامکمل نسخے سے نقل کرایا تھا، آستانہ کے نسخہ کا فوٹو منگایا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی مدینہ منورہ کے نسخہ ہی کی نقل ہے، اس طرح کتاب الحجۃ کے یہ تینوں نسخے درحقیقت ایک ہی تھے، مولانا انوار اللہ صاحب حیدرآبادی کے نسخہ کو اصل قرار دے کر اس کی تحقیق و تعلیق کی خدمت جناب مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری کے سپرد کی گئی، موصوف فقہ حنفی کے اہل نظر علماء میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں، مفتی صاحب نے اپنے علمی و دینی، تعلیمی اور تصنیفی مشاغل کے ساتھ اس کتاب کی تصحیح و تعلیق کو جاری رکھا اور کامل بیس سال میں یہ شاہکار مکمل کیا، اور حق یہ ہے کہ مفتی صاحب نے اپنے ذوق و شوق سے اس عظیم فقہی ذخیرہ کی خدمت کا پورا حق ادا کیا ہے، یہ تعلیق و تحشیہ درحقیقت مکمل شرح ہے، مستقل شرح شاید اس سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی، اس حاشیہ یا شرح کی وجہ سے کتاب بہت طویل ہو گئی ہے، اور ایک جلد کے بجائے تین چار جلدوں میں مکمل ہو گی، لیکن اس طویل غیر مملّ نے کتاب کی اہمیت و افادیت کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا ہے، جگہ جگہ حضرت مولانا ابو الوفا صاحب افغانی نے بھی اپنے محققانہ حواشی سے اسے مزین فرمایا ہے۔ اس طرح ہندوستان کے دو بلند پایہ حنفی محقق علماء کی توجہ سے کتاب الحجۃ علم و تحقیق کی بزم میں شمع فروزاں بن گئی ہے، خوشی کی بات ہے کہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے بھی اس کی اشاعت میں اعانت کی ہے، اس لیے وہ بھی شکریہ کی مستحق ہے،

اس کتاب کی پہلی جلد مع تعلیقات کے ۴۵۹ صفحات میں آئی ہے۔ اوپر کتاب الحجۃ کا متن جلی حرفوں میں اور نیچے اس کی تعلیق و تحقیق باریک حرفوں میں ہے، طباعت بہترین مصری ٹائپ

بیں کی گئی ہے اس جلد میں طہارت، صلوٰۃ، صوم اور زکوٰۃ کے مباحث ہیں، آئندہ جلد دل میں مناسک بیوع، مضاربہ، وقف، شفعہ، نکاح، طلاق، مساقات، مزارعت اور فرائض کے ابواب ہونگے قصاص و دیت کا تکملہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الام سے لیا گیا ہے، امام شافعیؒ نے کتاب القصاص والدیۃ میں امام محمدؒ کا رد کرنے کے لیے انکے اقوال نقل کئے ہیں۔ وہیں سے یہ حصہ لیا گیا ہے

امام محمدؒ کا اسلوبِ بیان

اس کتاب میں امام محمدؒ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں پہلے اپنے شیخ امام ابوحنیفہ کا قول نقل کرتے ہیں، پھر اس کے مقابلہ میں اہل مدینہ کا قول نقل کرکے امام ابوحنیفہ کے قول کی تائید میں اپنے طرق سے احادیث و آثار بیان کرتے ہیں، اور اہل مدینہ پر ان ہی کے اصولوں کے مطابق حجت قائم کرتے ہیں اور احادیث و آثار اور قیاس کی رو سے فقہ و حدیث کی باریکیوں کو بیان کرتے ہیں، مگر اس علمی و دینی مباحثہ میں حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اور بہت سے مسائل میں اہل مدینہ کی تائید کی ہے اور ان کے مسلک کو اپنا مسلک قرار دے کر امام ابوحنیفہؒ سے اختلاف کیا ہے، اس کتاب میں امام محمدؒ فقہائے اہل الحدیث کے صدر نشین نظر آتے ہیں۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ساتھ نہ ہوتے تو یہ دونوں حضرات بھی امام ثوری، امام اوزاعی، اور امام حسن بصری کی طرح اپنے مستقل مکتبِ فقہ کے مالک ہوتے، اور ان کا فقہی مسلک بھی دنیائے اسلام میں اسی طرح صدیوں جاری رہتا، جس طرح فقہ اوزاعی فقہ ثوری اور فقہ حسن بصری کا رواج رہا ہے۔

احادیث کے بارے میں فقہ حنفی کا موقف

کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ سے فقہ حنفی کا یہ اصول پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حدیث ضعیف اور خبر مرسل کے ہوتے ہوئے قیاس سے کام نہیں لیا جا سکتا، اور ایک صحابی کا قول و فعل بھی جب تک صحابہ میں سے کوئی مخالف نہ ہو قیاس سے اولیٰ ہے، امام مالکؒ اور اہل مدینہ حدیث مرسل و منقطع بلاغات (بلغنا و بلغنی) اور قول صحابی کو قیاس پر مقدم کرتے ہیں، اور ان کی موجود

ہیں قیاس سے کام نہیں لیتے۔

ائمہ اربعہ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ رائے اور قیاس میں زیادہ مشہور ہیں، اور دونوں اپنے شرائط کے مطابق شدید ضرورت کے وقت قیاس سے کام لیتے ہیں، یہ دونوں فقہی مکاتب صحابہ کرامؓ میں فقہائے سبعہ (حضرات عمرؓ، علیؓ، ابن عمرؓ ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، زیدؓ، عائشہؓ) کے فقہی مسلک کے آئینہ دار ہیں، امام ابوحنیفہ قرآن وحدیث اور اجماع کے بعد حضرت علیؓ اور عبداللہ ابن مسعودؓ کو حجت مانتے ہیں، اور امام مالکؒ قرآن وحدیث اور اجماع کے بعد حضرت علیؓ اور عبداللہ ابن عمرؓ کو حجت مانتے ہیں،

حنفیہ کے یہاں قرآن وحدیث اور اجماع کے بعد حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حجت ہیں

امام محمدؒ نے کتاب الحجۃ میں ان دونوں مسلکوں سے ان کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر بحث کی ہے، چنانچہ باب افتتاح الصلوٰۃ وترک الجہر ببسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں امام ابوحنیفہ کا قول نقل کرنے کے بعد اہل المدینہ کا قول نقل کیا ہے کہ حسب روایت ابن عمرؓ افتتاح صلوٰۃ کی طرح رکوع، قومہ اور سجدہ کے وقت بھی رفع یدین کرنا چاہئے، پھر لکھتے ہیں:۔

وقال محمد بن الحسن: جاء الثبت عن علی بن ابی طالب، وعبد اللہ بن مسعود، انھما کانا لا یرفعان فی شیء من ذلک الا فی تکبیرۃ الافتتاح فعلی بن ابی طالب وعبد اللہ بن مسعود کانا اعلم برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من عبد اللہ	امام محمد بن حسن فرماتے ہیں: ثقہ وثابت بات حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق یہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے، اور ان دونوں حضرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ سے زیادہ علم وواقفیت حاصل تھی، کیونکہ ہم کو خبر ملی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "جب نماز کھڑی ہو تو عقل ودفراست رکھنے والے لوگ میرے قریب رہیں، پھر اسی طرح

بن عمر لانہ بلغنا ان رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم قال اذا اقیمت الصلوٰۃ
فلیلینی منکم اولوا الاحلام والنھیٰ ثم
الذین یلونھم ثم الذین یلونھم فلا نری
ان احداً کان یتقدم علی اھل بدر مع
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلی فلا نری
ان اصحاب لصف الاول والثانی
اھل بدر ومن اشبھھم فی مسجد العلمین
وان عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنھما
ودونہ من فتیانھم خلف ذلک،
فنری ان علیا وابن مسعود رضی اللہ عنھما
ومن اشبھھما من اھل بدر اعلم بصلوٰۃ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لانھم
کانوا اقرب الیہ من غیرھم وانھما
اعرف بما یاتی من ذلک وما یدع
مع ان فقیھھم مالک بن انس
قد روی عن نعیم بن عبد اللہ المجمر
وابی جعفر القاری انھما اخبراہ
ان اباھریرۃ رضی اللہ عنہ کان یصلی
بھم فیکبر کلما خفض ورفع، قالا
وکان یرفع یدیہ حین یکبر ویفتتح

درجہ بدرجہ لوگ کھڑے ہوں"۔ ایسی صورت میں
ہم یہ کسی طرح باور نہیں کر سکتے کہ جو لوگ آپ
کے ساتھ غزوۂ بدر میں شریک تھے ان سے اس
وقت جب آپ نماز پڑھاتے تھے، کوئی شخص آگے
رہتا رہا ہوگا، اس لیے ہمارا خیال ہے کہ مسجد میں
پہلی اور دوسری صف کے اندر شرکائے بدر اور
ان کے ہم پایہ اشخاص ہی ہوتے تھے۔ اور حضرت
عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے نوجوان صحابہ کی
صفیں ان کے بعد ہوتی تھیں، اس لیے حضرت
علیؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ اور ان جیسے دوسرے
بدری صحابہ کو رسول اللہؐ کی نماز کے متعلق زیادہ
آگاہی تھی، کیونکہ یہ لوگ دوسروں کے مقابلہ
میں نماز کے اندر آپ سے زیادہ قریب رہتے تھے
اور ان باتوں کی زیادہ خبر رکھتے تھے، جن کو آپ
نماز میں اختیار یا ترک فرماتے تھے، اس کے
علاوہ خود اہل مدینہ کے فقیہ امام مالک بن
انس نے نعیم بن عبداللہ مجمر اور ابوجعفر قاری سے
روایت کی ہے کہ ان لوگوں نے بتایا کہ حضرت ابو
ہریرہؓ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے تو اٹھتے بیٹھتے
ہر موقع پر تکبیر کہتے تھے مگر وہ صرف نماز کی ابتدا میں
تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے، اس طرح

الصلوٰۃ فھذا احادیثکم موافق لعلی وابن مسعود رضی اللہ عنھما لا حاجۃ بنا معھما الی قول ابی ھریرۃ ؓ ونحوہ ولکنا احتججنا علیکم بحدیثکم ۔ (از ص ۹۴ تا ۹۶)	خود تمہاری حدیث بھی حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ کے مسلک کے مطابق ہے ۔گو کہ ہمارے لیے ان دونوں بزرگوں کے مسلک کی موجودگی میں حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ کے قول کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی تھی، تاہم ہم نے تمہارے خلاف خود تمہاری ہی حدیث سے حجت و دلیل فراہم کردی ہے ۔

اس طرح "باب الذی یفوتہ بعض الصلوٰۃ" کے تحت امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ کا قول نقل کیا ہے، اس کے بعد اہل مدینہ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر مصلی کو گمان ہو کر صف تک جاتے جاتے امام رکوع سے سر اٹھائے گا تو صف کے پیچھے ہی رکوع میں چلا جائے، پھر آہستہ آہستہ کھسک کر صف میں مل جائے، اہل مدینہ نے فقہائے عراق پر الزام دیتے ہوئے کہا ہے کہ بلغنا ان عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کان یدب راکعاً ان کے اس استدلال پر امام محمد نے لکھا ہے :

قیل لھم : ما اسرعکم الی حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ اذا کانت لکم منہ حجۃ وما ابطاکم عنہ اذا خالفکم ۔ انا نحن اعلم بامر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ منکم کیف دبّ حتّی وصل الصف ان خرج من دارہ ومعہ اصحابہ فکبر	اہل مدینہ سے یہ کہا جائے گا کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث تمہاری تائید میں ہوتی ہے تو کس قدر جلد اس سے استدلال کرتے ہو، لیکن جب وہ تمہارے خلاف ہوتی ہے تو اس سے استدلال کرنے میں پس وپیش اور گریز سے کام لیتے ہو، دراصل ہم لوگ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے طرز عمل سے تم لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ واقف ہیں کہ وہ کس طرح آہستہ آہستہ چل کر صف میں شامل ہوئے تھے، حقیقت یہ ہے کہ جب وہ اپنے گھر سے نکلے تو ان کے ہمراہ ان کے اصحاب بھی تھے، چنانچہ جب انہوں نے تکبیر کہی تو رفقاء نے بھی تکبیر کہی اس طرح وہ لوگ ایک صف میں ہو گئے اور آہستہ آہستہ

وکبروا معہم فصاروا صفًا	چل کر نماز کی صفوں سے جا ملے، اس سے ظاہر ہو گیا کہ عبد اللہ بن
ثم دبوا حتی لحقوا الصفوف	مسعودؓ اپنے گھر سے تنہا نہیں نکلے تھے، ورنہ ہم کو اس کی
ولم یخرج عبد اللہ من دارہ	خبر ملی کہ وہ تنہا آہستہ آہستہ چل کر نماز کی صف میں شامل
وحدہ، ولم یبلغنا انہ دب وحدہ (ص۲۱۶)	ہو گئے تھے۔

اہل مدینہ کا جواب ان ہی کے اصولوں سے

امام محمدؒ نے جگہ جگہ اہل المدینہ کو الزامی جوابات دئے ہیں اور ان کے اصول و مرویات کی روشنی میں ان کے اقوال کو مرجوح قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں فقہ حنفی کے احادیثِ رسول اور آثارِ صحابہ سے قریب تر ہونے کے واضح دلائل ملتے ہیں، چنانچہ مسح علی الخفین کی بحث میں اہلِ مدینہ کے مقابلہ میں لکھتے ہیں

وقال محمد بن الحسن: الآثار فی المسح للمقیم یومًا ولیلۃً، وللمسافر ثلاثۃ ایام ولیالیھا کثیرۃ معروفۃ، وما کنا نظن ان احدًا ممن نظر فی الفقہ یشکل علیہ الآثار فی ھذا۔ (ص۲۴)	امام محمدؒ بن حسن فرماتے ہیں کہ مقیم کے لیے ایک شب و روز اور مسافر کے لیے تین شب و روز کے مسح کی روایتیں اور آثار اس قدر زیادہ اور مشہور ہیں کہ میرے خیال میں فقہ پر نظر رکھنے والے کسی شخص کو ان کے بارے میں کوئی اشکال نہیں ہو سکتا ہے۔

اسی بحث میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

وکیف قال ھذا اھل المدینۃ فما نعلم احدًا یبصر شیئًا یتکلم بمثل ھذا فقد جاء الحدیث المعروف عن عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ الخ۔	حیرت ہے کہ اہل مدینہ نے یہ بات کیسے کہی؛ اور ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی معمولی بصیرت رکھنے والا بھی اس قسم کی بات کہتا ہو، کیونکہ حضرت عمرؓ بن الخطاب کی اس سلسلہ میں مشہور روایت موجود ہے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

فھذا قول عروۃ بن الزبیر وھو کان افقہ واعلم بالروایۃ والسنۃ	یہ عروہ بن زبیرؒ زبیر کا قول ہے جو روایت و سنت کے معاملہ میں ابن شہابؒ سے زیادہ صاحبِ علم و فقہ

مَن ابن شہاب فکیف ترك ھذا	تھے، آخر امام مالکؒ بن انس وغیرہ نے اس کو کیسے
مالك بن انس وغیرہ وھم الذین	ترک کر دیا ہے، جبکہ انھوں نے اس کی روایت
رووہ وعزوا الٰی رأی ابن شہاب	بھی کی ہے، اور اس کے متعلق اور آثار بھی موجود
مع ما قد جاء فی ھذا من الآثار	ہیں، پھر بھی وہ ابن شہابؒ کے قول کی جانب
اخبرنا الخ (ص ۳۹)	مائل ہو گئے،

احادیث و آثار کے ہوتے ہوئے قیاس نہیں کیا جا سکتا

اس کتاب میں احناف کے اس مسلک کی پوری ترجمانی موجود ہے کہ احادیث و آثار کے ہوتے ہوئے قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور فقیہ کی نظر روایت و درایت پر کس قدر زیادہ ہونی چاہیے، و نیز میں حضرت ابن عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت سعید بن جبیر کے مسلک کے خلاف ابن مسیبؒ کے مسلک کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فھولاء احق ان ناخذ بقولھم	ان لوگوں کے قول پر عمل کرنا سعید بن مسیبؒ کے
من سعید ابن المسیب (۱۴۳)	قول کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور مناسب ہے،

باب الضحك فی الصلوٰۃ - میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

وقال محمد بن الحسن: لولا ما جاء	امام محمد بن حسن فرماتے ہیں کہ اگر آثار نہ ہوتے تو
من الآثار کان القیاس علٰے	قرین قیاس اہل مدینہ ہی کا مسلک تھا، لیکن اثر
ما قال اھل المدینة ولکن	کی موجودگی میں قیاس کا کوئی سوال نہیں اور اثر
لا قیاس مع اثر ولیس ینبغی الا	و حدیث کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کے علاوہ
ان ینقاد للآثار (۲۰۴)	اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

"باب المرور بین یدی المصلی" میں اہل مدینہ کو ان کی احادیث سے دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

فھذہ احادیث اھل المدینة	اہل مدینہ کی حدیثیں ہیں، جن سے ان کے خلاف
یحتج علیھم بھا، وھم یاخذون	حجت قائم کی جائے گی، کیونکہ ان لوگوں کا مسلک

بخلافها وممن اخذ بخلافها مالك
بن انس، وهو الذی رواها فکیف
یکونون اصحاب آثار وهم یدعون
عیانا ما یروون ولو اردنا ان نحتج
علیهم باحادیث کثیرة من الاحادیث
فی هذا ونحوه لاحتججنا بها علیهم
لکن احتجاجنا باحادیثهم
اوجب فی الحجة علیهم وهذا
مما یدل علی غیره من اقوالهم
انما ترکوا فیه الآثار واخذوا
فیه بما استحسنوا بما لم یاتوا
فیه باثر ولا سنة (ص ۲۲۳)

ان کے خلاف ہے، امام مالکؒ بھی ان ہی لوگوں میں
ہیں، جو ان حدیثوں کی مخالفت کرتے ہیں، درآں
حالیکہ وہ ان کے راوی بھی ہیں، ایسی صورت
میں اہل مدینہ کو صاحبِ آثار کس طرح کہا جا سکتا
ہے جبکہ علانیہ وہ اپنی ہی مرویات کو ترک کر دیتے
ہیں اور اگر ہم چاہتے تو اس مسئلہ اور اس طرح
کے دوسرے مسائل میں متعدد حدیثوں سے ان
کے خلاف حجتیں قائم کرتے لیکن ہمارا ان ہی کی
حدیثوں سے ان کے خلاف استدلال کرنا زیادہ
موثر اور موجب حجت ہوگا، یہ اور ان کے دوسرے
اقوال اس کی دلیل ہے کہ انہوں نے ان میں آثار
کو ترک کر کے ان چیزوں کو اختیار کر لیا ہے جن کو
وہ پسند کرتے تھے، اور اپنی تائید میں کوئی سنت و
اثر نہیں پیش کر سکے۔

باب المسح علی الخفین میں ایک مقام پر اہل مدینہ کو خطاب کرتے ہوئے یوں قیاس کی بحث کرتے ہیں:۔

قیل لهم: فانما یقاس ما لم
یات فیه اثر علی ما جاءت فیه الآثار
فقد رویتم اثرین فی مسح الراس
والمسح علی الخفین ولم تقیسوا علی
واحد منهما فلای شیٔ اختلف هذا

اہل مدینہ کے خلاف یہ کہا جائے گا کہ جس چیز کے
بارہ میں کوئی اثر نہ ہوتا تو اس کو اس چیز پر قیاس
کیا جاتا ہے جس کے متعلق آثار وارد ہوتے ہیں، پس
تم نے مسح راس اور مسح علی الخفین کے متعلق دو اثر
بیان کئے ہیں، لیکن ان میں سے کسی پر بھی قیاس نہیں

وغیرہ من مواضع الوضوء	کیا آخر اس میں اور دوسرے وضو میں فرق و
وقد زعمتم انہ لا اثر عندکم	اختلاف کا سبب کیا ہے، جبکہ تم لوگوں کا خود
فی غیر ھذا من الاعضاء فینبغی	خیال ہے کہ اس کے علاوہ کسی عضو کے بارہ میں
لمن قاس علی السنۃ والآثار	تمہارے پاس کوئی اثر وحدیث نہیں ہے، اس
ان یقیس علی السنۃ مالم یات	بنا پر سنت پر قیاس کرنے والے کو چاہئے کہ
فیہ اثر لما قد جاءت فیہ	وہ ایسی چیز کو سنت پر قیاس کرے جس کے
الآثار مما یشبھہ۔	بارے میں کوئی ایسا اثر نہ ہو جو مقیس علیہ آثار
(ص ۴۴ و ۴۵)	کے مشابہ ہو۔

مشہور احادیث و آثار کے ہوتے ہوئے ایک صحابی کی روایت حجت نہیں ہے

کسی ایک صحابی کی روایت کو مشہور احادیث و آثار کے مقابلہ میں حجت قرار نہیں دیا جا سکتا، اس پر بحث کرتے ہوئے "باب الخطاء والنسیان والسہو" میں لکھتے ہیں:۔

قیل لھم: لم یات فیما قلتم	ان لوگوں کے خلاف یہ دلیل دی جائے گی کہ تم
من الاحادیث الاحدیث واحد	لوگوں نے جو کچھ کہا ہے اس کے متعلق صرف ایک
حدیث عبد اللہ بن بحینۃ عن النبی	ہی حدیث ہے، اور وہ یہ کہ عبداللہ بن بحینہ آنحضور
صلی اللہ علیہ وسلم انہ قام من الرکعتین	صلے اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ
ولم یجلس فسجد سجدتین وھو	دوسری رکعت میں کھڑے ہو گئے اور قعدہ نہیں
جالس قبل السلام، قالوا نعم ھذا	کیا اس لیے آپ نے آخری قعدہ میں سلام سے
حدیث عبد اللہ بن بحینۃ وبہ اخذنا	پہلے دو سجدے کیے، اہل مدینہ کا بیان ہے کہ
قیل لھم فھل رویتم عن عبد اللہ	یہ عبداللہ بن بحینہ کی حدیث ہے اور اسی پر ان کا
ابن بحینۃ اوروی فقیہ قط حدیثا	عمل ہے، لیکن جب ان سے یہ پوچھا جائے کہ تم
غیر ھذا الحدیث قالوا لا نعلم	لوگوں یا کسی اور فقیہ نے بھی ان سے اس کے

انه قد جاء عنه حديث غير هذا، قيل لهم افنقبل هذا بترك السنة والآثار المعروفة بقول رجل لا يروى عنه غير حديث واحد، وقد روينا حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم هذا بعينه عن امام كان من ائمة المسلمين يأمنه عمر بن الخطاب رضي الله عنه على الامصار ويستعمل عليها اعرف بالرواية واعلم بها واشهر بصحبة رسول الله صلى الله عليه وسلم من عبد الله ابن بحينة وذلك المغيرة بن شعبة رضي الله عنه انه صلى باهل الكوفة فقام من ركعتين، ولم يجلس فلما تشهد سلم ثم سجد سجدتين للسهو، ثم روى ان رسول الله صلى الله عليه وسلم فعل هذا بعينه فلو كان الرجلان كلاهما ثقة و كلاهما مامون على ما رويا لكان الذي قال سمعت رسول الله صلى

علاوہ کبھی کوئی اور حدیث بیان کی ہے تو وہ کہیں گے کہ ہم کو کسی روایت کا علم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ان سے کہا جائے گا کہ کیا ہم لوگ مشہور سنن و آثار کو محض ایک ایسے شخص کے قول کی بنا پر ترک کر کے جس سے اس کے علاوہ اور کوئی بھی حدیث مروی نہیں ہے اس کو قبول کر لیں جبکہ ہمارے پاس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعینہ یہی حدیث مسلمانوں کے ایک امام کے واسطہ سے موجود ہے جن کو حضرت عمرؓ بن الخطاب نے امصار و بلاد میں امین مقرر کیا تھا، اور جو روایات و آثار کے بہت بڑے عالم اور عبد اللہ بن بحینہؓ کے مقابلہ میں صحبت رسولؐ میں زیادہ شہرت بھی رکھتے تھے، یہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ ہیں، جنہوں نے کوفہ والوں کو نماز پڑھائی۔ اور دوسری رکعت میں بغیر قعدہ کیے اٹھ کھڑے ہوئے اور آخری قعدہ میں تشہد کے بعد سلام پھیرا اور سہو کے دو سجدے کیے اس کے بعد کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی بعینہ ایسے ہی کیا تھا، اس لیے اگر دونوں ہی آدمی اپنی روایت میں ثقہ و مامون ہوں جب بھی اس شخص کا قول جو کہتا ہے کہ اس نے اس کو

صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فعلہ فھو احق أن یوخذ بقولہ من الذی قال لم اسمعہ یسلم حتی سجد سجدتین لان من قال لم اسمعہ یسلم حتی سجد سجدتین لیست تقبل شھادتہ فی الاشیاء علی مثل ھذا، وانما تقبل الشھادۃ اذا قال سمعت ورأیت فاما من قال لم اسمع ولم ار فلیس یوخذ بقولہ وعندنا فیما قلنا بعینہ آثار علی خلاف ما روی عبد اللہ ابن بحینۃ۔	رسول اللہ سے سنا ہے۔ اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ قابل قبول ہوگا جو کہتا ہے کہ اس نے یہ نہیں سنا کہ آپ نے دو سجدے کرنے سے پہلے سلام نہیں پھیرا، اس لیے کہ اس قسم کے مسائل میں ایسی شہادت قبول نہیں کی جاتی، جو یہ کہتا ہے کہ میں نے نہیں سنا کہ آپ نے دو سجدے کرنے سے پہلے سلام پھیر دیا ہو بلکہ اس کی شہادت قبول کی جاتی ہے جو کہتا ہے کہ میں نے سنا اور دیکھا، اس شخص کے قول کا اعتبار نہیں کیا جاتا جو یہ کہتا ہے کہ میں نے نہ سنا اور نہ دیکھا اور ہمارے پاس تو ہمارے قول و مسلک کی تائید میں اسی طرح کے اور بھی آثار ہیں اور وہ عبد اللہ بن بحینہ کی روایت کے خلاف ہیں۔
(ص ۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷)	

احادیث و آثار کے مقابلہ میں تابعی کا قول حجت نہیں ہے

احادیث رسول اور آثار صحابہ کے مقابلہ میں تابعین یا ان کے بعد کے اہل علم کا قول و فعل حجت نہیں بن سکتا اور اسلاف کے مقابلہ میں اخلاف کا قول مرجوح ہے، اسے "باب صلوٰۃ الجمعہ" میں مسجد سے متصل مکانات میں نماز جمعہ پڑھنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

قیل لھم، وکیف جاز ھذا فی ذلک الزمان، ولم یجز فی ھذا الوقت؟ ما جاء غیر الاول (؟) وجاء قوم افقہ من الاولین	اہل مدینہ کے خلاف یہ کہا جائے گا کہ یہ اس زمانہ میں کیسے جائز تھا اور اس زمانہ میں یہ کیوں جائز نہیں ہے؟ کیا پہلے کے مقابلہ میں کوئی اور روایت ہے، یا سلف سے زیادہ صاحب فقہ لوگ

ما العلم الا علم الاولين الذين رخصوا في ذلك، وما الفقه الا فقههم وهم كانوا اعلم بامر رسول الله صلى الله عليه وسلم واقرب به جهدا منا، فلو رأوا ذلك قبيحا ما فعلوه - (ص ۲۹۰ و ۲۹۱)

پیدا ہو گئے ہیں؟ فقہ و علم تو در اصل ان اسلاف ہی کا معتبر سمجھا جائے گا جنہوں نے اس کی رخصت واجازت دی ہے، کیونکہ ان لوگوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے معاملات سے زیادہ واقفیت تھی اور اس لیے سعی و کوشش میں ہم سے زیادہ قریب تھے، پس وہ اگر اس کو برا سمجھتے تو کبھی نہ کرتے۔

احادیث و آثار کے ہوتے ہوئے حنفیہ کے یہاں قیاس جائز نہیں ہے۔ "باب قیام الرجل حین ینھض الی الصلوٰۃ" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

وقال محمد بن الحسن: السنة والآثار في هذا معروفة مشهورة لا يحتاج معها الى نظر وقياس (ص ۲۱۶)

اس سلسلہ میں سنن و آثار بکثرت اور معروف ہیں، اور ان کی موجودگی میں نظر و قیاس کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔

حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو غلط قرار دیتے ہوئے "کتاب الصوم" کے باب الرجل یاکل او یشرب ناسیاً" میں لکھتے ہیں:-

وقال محمد بن الحسن، كيف قال اهل المدينة هذا القول ما سمعنا ان احدا يزعم انه من اكل او شرب ناسيا ان عليه القضاء، ولقد جاءت الآثار في ذلك والناس يجمعون عليها ان من اكل ناسيا او شرب ناسيا فانما ذلك طعمة اطعمها الله اياه وسقاه، وان اهل المدينة ليعلمون

محمدؒ بن الحسن بیان کرتے ہیں کہ اہل مدینہ یہ کس طرح کہتے ہیں کہ ہم نے کوئی ایسا شخص نہیں سنا جو یہ خیال کرتا ہو کہ اگر کوئی شخص بھول کر کھا پی لے تو اس پر روزے کی قضا لازم ہو گی کیونکہ اس بارہ میں جو حدیثیں وارد ہیں اور جن پر لوگوں کا اجماع ہے وہ یہ ہے کہ جس نے بھول کر کھا پی لیا تو اس کو اللہ تعالےٰ نے کھلایا اور پلایا اور اہلِ مدینہ اس سے خوب واقف ہیں کہ

ان ھذا لا ینبغی ان یوخذ بالرأی للآثار التی جاءت مما لا یقدر علی ردہ احد، وقال ابوحنیفۃ لولا ما جاء فی ھذا من الآثار لامرت بالقضاء (ص ۳۹۲)	ان حدیثوں اور آثار کے مقابلہ میں جن کی تردید کوئی شخص نہیں کر تا رائے اور قیاس کو اختیار کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے، اسی لیے امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ اگر اس بارہ میں حدیث و آثار نہ ہوتے تو میں بھی قضا کا حکم دیتا۔

یہ اقتباسات اگرچہ طویل ہوگئے ہیں، مگر ان سے معلوم ہوسکتا ہے کہ فقہ حنفی کی بنیاد احادیث و آثار پر ہے، اور روایت کے ساتھ درایت سے بھی بھرپور کام لیا گیا ہے، اور یہ کہ قیاس کو بدرجۂ مجبوری خاص حالات میں بقدر ضرورت کام میں لایا گیا ہے۔

امام محمد کی مجتہدانہ انصاف پسندی

اوپر کی مثالوں میں روئے سخن چونکہ اہل مدینہ کی طرف ہے، اس لیے ایک گونہ مقابلہ کی شکل معلوم ہوتی ہے، مگر اس مقابلہ میں حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا ہے، بلکہ بہت سے مسائل میں امام محمدؒ نے اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ کے مقابلہ میں اہل مدینہ کا ساتھ دیا ہے اور ان کے مسلک کو راجح قرار دے کر اپنا مسلک بنایا ہے، چنانچہ امام جالس کی امامت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

قال محمد بن الحسن: قول اھل المدینۃ فی ھذا احب الی من قول ابی حنیفۃ وان کنت احتججت لابی حنیفۃ بحجۃ ثابتۃ لم تر اھل المدینۃ یخرج منھا ولکنہ بلغنا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم	امام محمدؒ بن حسن کہتے ہیں کہ اس بارہ میں میرے نزدیک اہل مدینہ کا قول امام ابوحنیفہؒ کے قول سے زیادہ پسندیدہ ہے، گو میں نے ان کی تائید میں ایسی قاطع دلیل پیش کردی ہے جس کے بعد اہل مدینہ کے لیے مفر کی کوئی صورت نہیں رہ گئی ہے، لیکن چونکہ ہم کو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ خبر

انہ قال: لایؤم الناس احد بعدی جالسا، ولم یبلغنا ان احدا من ائمة الهدى ابی بکر ولا عمر وعثمان ولا علی ولا غیرهم أمّوا جلوسا فاخذنا بهذا الا نه اوثق الخ (ص ۱۲۸)	ملی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "میرے بعد کوئی شخص بیٹھ کر نماز نہ پڑھائے اور ہم کو ائمہ ہدی ابوبکرؓ عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ وغیرہ میں سے کسی کے بارہ میں یہ نہیں معلوم ہوا کہ انہوں نے بیٹھ کر نماز پڑھائی ہو، اس لیے ہم نے اس کو اختیار کر لیا جو قابل وثوق واعتماد ہے۔

صلوٰۃ کسوف میں امام ابوحنیفہؒ اور اہل مدینہ کے اقوال نقل کر کے لکھتے ہیں۔

وقال محمد بن الحسن: قد جاءت فی قول ابی حنیفة آثار علی ماقال وجاءت فی قول اهل المدینة آثار علی ماقالوا (ص ۳۱۹)	محمدؒ بن حسن فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے قول کی تائید میں جیسا کہ ان کا بیان ہے آثار وارد ہیں اور اہل مدینہ کا بھی خیال ہے کہ انکی تائید میں آثار وروایات موجود ہیں۔

"باب ما یقسم للمصدق من الورق" میں ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

وقال محمد بن الحسن: القول الاول احسن القولین وهو القول الذی اجمع علیہ اهل الکوفة واهل المدینة (ص ۴۹)	محمد بن الحسن کا بیان ہے کہ دونوں اقوال میں پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اور وہی زیادہ قابل اعتماد بھی ہے اور اسی پر اہل کوفہ اور اہل مدینہ کا اجماع ہے

باب زکوٰۃ اموال الیتیم میں امام ابوحنیفہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جب یتیم بچے پر نماز فرض ہوتی ہے تو اس کے مال میں زکوٰۃ بھی فرض ہوتی ہے۔ اور اہل مدینہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یتیم کے مال کی زکوٰۃ نکالنی چاہیئے، اس پر امام محمدؒ لکھتے ہیں:۔

وقال محمد بن الحسن: قد جاءت فی هذا آثار مختلفة واحبها الینا ان لا یزکی حتی یبلغ (ص ۴۵۷)	امام محمد بن حسن کا ارشاد ہے کہ اس کے بارہ میں مختلف روایات ہیں لیکن میرے نزدیک زیادہ بہتر مسلک یہ ہے کہ بلوغ سے پہلے زکوٰۃ نہیں دی جائے گی

ایام تشریق میں تکبیرات میں اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ کے قول کو یوں مرجوح قرار دیتے ہیں:

قال محمد بن الحسن: وهذا القول احب الينا من قول ابي حنيفة - (ص ۳۱۰)

محمد بن الحسن کہتے ہیں کہ یہ قول ہمارے نزدیک امام ابوحنیفہؓ کے قول سے زیادہ عمدہ ہے۔

باب زکوٰۃ النخل والحبوب میں ایک مقام پر کھل کر اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ کے قول کا انکار کیا۔

ولسنا ناخذ بهذا من قول ابي حنيفه وابراهيم ولكنا ناخذ بما روي عن النبي صلى الله عليه وآله وسلم انه قال الخ (ص ۵۰۲-۵۰۴)

ابراہیم اور امام ابوحنیفہ کا یہ قول ہمارے نزدیک قابل اختیار نہیں بلکہ ہم اس کو اختیار کرتے ہیں جو آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

اسی باب میں ایک جگہ اہل مدینہ کی موافقت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وكذالك قولنا، ونحن نرى ايضاً ان تؤخذ الصدقة الخ (ص ۵۱۲)

یہی ہمارا بھی مسلک ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ لی جائے گی۔

الغرض پوری کتاب فقہ اسلامی کے نکات واسرار سے معمور ہے، اور امام محمدؒ کو اسلامی تفقہ کے مرحلے میں جو مقام حاصل ہے، اور ان کی دوسری کتابوں میں جو بالغ نظری پائی جاتی ہے، اس کتاب میں بھی موجود ہے، اسلامی قوانین وتشریعات کے سلسلے میں اسلام کا یہ قدیم ترین دور حاضر کی فقہی جدوجہد میں بڑے کام کی چیز ہے، اور فقہ اسلامی پر کام کرنے والے اہل تحقیق کے لیے ایک قدیم ترین دستاویز ہے۔

(۹)

امام محمدؒ کی کتاب الآثار

حضرت امام محمدؒ بن حسن شیبانی کی کتاب الحجۃ علیٰ اہل المدینہ" کا تعارف کرایا جا چکا ہے
جس کی پہلی جلد حال ہی میں لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدر آباد سے شائع ہوئی ہے، اب امام محمد
کی کتاب الآثار کا مختصر تعارف پیش کیا جا رہا ہے، جس کی پہلی جلد حضرت مولانا ابوالوفا صاحب
افغانی صدر مجلس مذکور کی تصحیح و تعلیق کے بعد مجلس علمی ڈابھیل و کراچی نے شائع کی ہے۔

کتاب الآثار کی حیثیت

یہ درحقیقت حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے
جس کے بارے میں امام محمد بن شجاع نے تصریح کی ہے کہ امام
صاحب نے چالیس ہزار احادیث و آثار سے انتخاب فرمایا ہے، اور ان کے تلامذہ نے
اس کی روایت کرکے اپنی طرف سے اضافہ و ترمیم کیا، جس کی وجہ سے بعد میں اس کے نسخے
ان کے نام سے مشہور ہوئے، چنانچہ امام زفر بن ہذیل عنبریؒ، امام حسن بن زیاد لولویؒ، ا
حفص بن غیاث نخعیؒ، امام محمد بن خالد وہبیؒ اور امام حماد بن ابوحنیفہؒ کی کتاب الآثار درحقیقت
امام صاحب کی کتاب الآثار ہے، جو بعد میں ان کے تلامذہ کے نام سے مشہور ہوئی، اس طرح
کتاب الآثار امام ابویوسفؒ جو اس سے پہلے مولانا ابوالوفا صاحب کی تعلیق و تصحیح کے ساتھ
لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ سے شائع ہو کر ہمارے ہاتھوں میں آچکی ہے، اور کتاب الآثار
امام محمد جو ہمارے سامنے ہے، امام ابوحنیفہؒ کی کتاب الآثار ہے، مگر ان دونوں حضرات نے
امام صاحب سے اس کی روایت کرنے کے بعد اپنے اضافہ کے ساتھ مدون کیا، اس لیے ان کی
طرف منسوب ہو گئی۔

مطبوعہ اور قلمی نسخے

امام محمدؒ کی دو کتابیں خاص طور سے ہندوستان میں بہت زمانہ سے رائج و متداول رہی ہیں، ایک مؤطا امام محمد جس کی بہترین شرح التعلیق الممجد کے نام سے مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلیؒ نے شائع کی تھی، اور دوسری کتاب الآثار جو مولانا مرحوم کی توجہ سے پہلی بار لکھنؤ سے چھپی تھی، اس طباعت کا نسخہ راقم کے کتب خانہ میں موجود ہے، دوسری بار پھر لکھنؤ میں چھپی اور جب وہ اڈیشن بھی ختم ہوگیا تو تیسری بار لاہور میں چھپی، وہ بھی ایک مدت سے نایاب ہو چکی تھی، مگر چونکہ یہ داخل درس نہیں تھی اس لیے اس کی تعلیق و تحقیق اور تصحیح و تحشیہ کی طرف مؤطا امام محمد کی طرح توجہ نہ ہوسکی، حتی کہ کتابت و طباعت اور کاغذ نہایت ردی استعمال کیا گیا، یہ تینوں اڈیشن اغلاط سے پر تھے، اس لیے اس اہم کتاب کو اس کے شایان شان شائع کرنے کی شدید ضرورت تھی۔ اور اہل علم اس کے انتظار میں تھے، چنانچہ مجلس احیاء المعارف النعمانیہ کے اراکین نے امام ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار کی اشاعت کے بعد ہی امام محمدؒ کی کتاب الآثار کو نئی آب و تاب کے ساتھ شائع کرنے کا ارادہ کیا، اور جب اس کے صدر محترم نے ہندوستان کے مطبوعہ نسخوں کے ساتھ قلمی نسخوں کی تلاش و جستجو شروع کی تو دو نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں دستیاب ہوئے، نیز ایک نسخہ آستانہ کے کتب خانہ یحیی آفندی میں تھا، جو ۱۰۹۷ھ کا لکھا ہوا تھا، اس کا عکسی فوٹو منگایا اور ان تینوں قلمی نسخوں سے اصل کتاب کا مقابلہ کیا، پھر معلوم ہوا کہ موصل کے ایک کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے، اس سے مقابلہ کے لیے ایک افغانی عالم کی خدمت حاصل کی جو وہیں رہتے تھے، اور یہاں سے اصل نسخہ بھیج کر مقابلہ کرایا، اس طرح مدت کی محنت شاقہ کے بعد یہ نسخہ تصحیح و مقابلہ اور تعلیق و تحشیہ کی تمام خوبیوں کے ساتھ طباعت و اشاعت کے قابل ہوگیا، مگر اس کے لیے زر کثیر کی ضرورت تھی جس کی بظاہر فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، اور معاملہ لیت و لعل میں پڑ گیا کہ مجلس علمی ڈابھیل و کراچی کے محسن خاص مرحوم مولانا محمد بن موسیٰ میاں (افریقہ) نے مجلس علمی کی طرف سے اس کی طباعت و اشاعت کی پیش کش کی، اس طرح امام محمدؒ کی کتاب الآثار اہل علم کے سامنے بڑی آب و تاب کے ساتھ آگئی، اور ماضی میں اس کتاب کی جو حق تلفی ہوئی تھی۔

سب کا تدارک ہو گیا۔

امام محمدؒ کا اسلوب بیان

حضرت امام محمدؒ نے اس کتاب میں عام طور پر صحابہ اور تابعین کے آثار کو فقہی ابواب پر جمع کیا ہے، اسی لیے اس میں احادیث مرفوعہ کے مقابلہ میں آثار موقوفہ بہت زیادہ ہیں، اس کتاب کا مقصد صحابہ اور تابعین کے آثار کو یکجا کر کے یہ دکھانا ہے کہ جن احادیث کے آثار سے موافقت ہوتی ہے وہ معمول بہا ہیں، گویا صحابہ اور تابعین کے آثار احادیث رسول کے لیے شواہد و دلائل ہیں، جن کو جمع کیا گیا ہے؛ کیونکہ مختلف فیہ احادیث کے بارے میں صحابہ اور تابعین کا تعامل معیار و حکم کی حیثیت رکھتا ہے، اور جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اختلاف ہوگا تو فیصلہ کے لیے صحابہ کے اقوال و افعال کو معیار ماننا پڑے گا۔ کیونکہ وہ منشائے رسول اور احکام دین کے زیادہ عالم تھے، اور انھوں نے اولیٰ اور اصح پر عمل کیا، اسی طرح اگر صحابہ کے اقوال میں اختلاف ہو تو تابعین کا مسلک معیار ہوگا اور ان کے آثار کی روشنی میں صحابہ کے اقوال کو دیکھا جائے گا، اور جب تابعین کے اقوال و افعال میں اختلاف ہوگا تو وجوہ ترجیح کی بنا پر بعض صحابہ کے اقوال کو ترجیح دی جائے گی، اسی مقصد کے لیے ائمہ نے علمائے صحابہ و تابعین کے آثار کو مستقل طور سے مدون کیا چنانچہ کتاب الآثار امام محمدؒ بھی اسی سلسلۂ زریں کی ایک اہم کڑی ہے۔

اس کتاب میں ان اکابر داعیانِ صحابہ کے اقوال و افعال اور فیصلے مروی ہیں جو جماعت صحابہ میں مرجع و حجت تھے، چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہؓ، حضرات خلفائے اربعہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے اقوال و فتاویٰ درج ہیں جو ان کے کبار تلامذہ سے مروی ہیں، جیسے امہات المومنین میں حضرت ام حبیبہؓ، حضرت ام سلمہؓ، ان کے علاوہ صحابیات میں حضرت اسماء بنت عمیسؓ، حضرت ام سلیمؓ اور حضرت ام عطیہؓ وغیرہ کی مرویات ہیں اور تابعین میں امام ابراہیم نخعیؒ، امام شعبیؒ، امام حسن بصریؒ، امام ابن سیرینؒ، امام سعید

بن جبیرؒ، امام سعید بن مسیبؒ، امام علی زین العابدین، امام محمد بن حنفیہؒ جیسے کبار تابعین کے فتاوے اور اقوال ہیں، خاص طور سے امام نخعیؒ سے زیادہ تر روایات جو حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہیں۔

جب کسی مسئلہ میں صحابہؓ سے متضاد و مختلف روایتیں ہوتی ہیں، تو وہ طریقہ اختیار فرماتے ہیں، جو اقرب الی التفقہ ہوتا ہے، اور تابعین کے اختلاف میں ان ہی کی طرح خود بھی تفقہ فی الدین اور اجتہاد سے کام لیتے ہیں، جو ان کے شیخ امام ابو حنیفہؒ کے طریقہ پر ہوتا ہے، اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ کے اس مسلک کو اختیار کرتے ہیں جو ابراہیم نخعی سے مروی ہوتا ہے، لیکن اگر اس میں اپنی فقہی صوابدید اور تفقہ کے خلاف کوئی بات ہوتی ہے تو پھر امام نخعیؒ کے قول کو بھی ترک کر دیتے ہیں، اور صاف طور سے لا تاخذ بقول ابرٰھیم بل بقول فلان وفلانٌ کہتے ہیں، جیسا کہ کتاب الآثار میں جگہ جگہ اس کی صراحت ملتی ہے، اور ان کی دوسری کتابوں میں بھی یہ اجتہادی شان اور فقیہانہ فکر پائی جاتی ہے۔

تحقیق و تعلیق کا معیار

یہ تو اصل کتاب کے متعلق چند معلومات تھیں، حضرت مولانا ابو الوفا صاحب افغانی کی تعلیق کی افادیت و اہمیت کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں، جنھوں نے ان کی علمی و فقہی کاوشوں کو ائمہ احناف کی متعدد امہات کتب کی اشاعت میں دیکھا ہے، مولانا نے نہایت عقیدت اور بڑی دقت نظر سے اس کا تحشیہ فرمایا ہے، آثار کی تخریج، ان کی اسانید کی تحقیق، متضاد آثار میں تطبیق، غریب لغات کا حل، نیز یہ کہ امام محمدؒ نے اپنی دوسری تصنیفات میں فلاں باب میں کیا ذکر ہے، اور ائمہ فقہا کی تفریعات کیا ہیں، رواۃِ احادیث و آثار کے تذکرے، الغرض مولانا کی فقہی بصیرت اور تحقیقی کدوکاوش نے کتاب کی افادیت کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا ہے۔

(۱۰)

امام ابوبکر حمیدیؒ کی مسند حمیدی

مسانید کی تاریخ

تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کے زمانہ میں جب احادیث رسول ﷺ کی باقاعدہ تدوین و تالیف کا دور شروع ہوا تو عام طور سے جوامع و سنن اور معاجم و مسانید کی ترتیب و تدوین ہوئی، مسندیں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسماء پر احادیث یوں مرتب کی گئیں کہ ایک صحابی کی جس قدر روایات مصنف تک اس کے سلسلۂ روایت سے پہونچ سکیں ان کو یکجا کر دیا، پھر اسی طرح دوسرے صحابی کی احادیث کو درج کیا، اس طرح احادیث کی باقاعدہ فقہی ترتیب و تدوین سے پہلے مسانید کا معتد بہ سرمایہ حزم و احتیاط کے ساتھ جمع ہو گیا، مسانید کے مرتبینِ اولین میں امام اسد السنۃ متوفی ۲۱۲ھ، امام عبید اللہ بن موسیٰ متوفی ۲۱۳ھ، امام ابوبکر عبد اللہ بن زبیر حمیدی متوفی ۲۱۹ھ امام یحییٰ بن عبد الحمید حمانی متوفی ۲۲۸ھ، اور امام مسدد مسرہد متوفی ۲۲۸ھ وغیرہ ہیں، ان کے بعد بہت سے علماء نے اپنی اپنی مسانید جمع کیں، مثلاً مسند عبد بن حمید کشی، مسند نعیم بن حماد، مسند اسحٰق بن نصر، اور مسند امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ، اور جب بعد میں باقاعدہ فقہی ترتیب پر احادیث کی تدوین کا دور آیا تو قدماء کی تقریباً یہ تمام مدونات بعد کی کتابوں میں آگئیں، اور ان کے مصنفین نے اپنے سلسلۂ روایت سے ان حدیثوں کو اپنی کتابوں میں جمع کر دیا، اس کے بعد وہ قدیم مسانید یا تو نابید ہو گئیں یا عالم اسلام کے خال خال کتب خانوں میں اور اہل علم کے پاس محفوظ رہیں، اور ان کے نام بعد کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان کی احادیث کتابوں میں آج بھی ملتی ہیں مگر خود وہ کتابیں عام طور سے مفقود ہو گئیں یا متداول نہیں رہیں، البتہ مسند امام احمد اپنی جامعیت و ضرورت اور جلالتِ شان

کی درجہ سے مستعمل و متداول رہی، اور علمائے اسلام نے اس کے ساتھ پورا پورا اعتنا کیا، اس کے علاوہ مسانید میں جہاں تک ہمیں علم ہے مسند ابوداؤد طیالسی اور مسند ابوعوانہ کی اشاعت ہمارے ملک ہندوستان سے ہوسکی ہے مگر قدیم مسانید میں سے کوئی اب تک شائع نہیں ہوئی تھی اور اب مسند حمیدی کی اشاعت کی باری یہیں سے آئی ہے۔ یہ مسند مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے لکھی گئی اور اس کے مصنف امام حمیدی اپنے معاصرین میں اسد السنۃ اور عبیداللہ بن موسیٰ کے بعد ادرحمانی اور مسدد سے پہلے فوت ہوئے ہیں، آج کی مجلس میں ہم امام حمیدیؒ اور ان کی مسند کے بارے میں کلام کرنا چاہتے ہیں۔

امام حمیدیؒ

حضرت امام حافظ الحدیث فقیہ ابوبکر عبداللہ بن زبیر بن علیی قرشی، اسدی، حمیدی، مکی متوفی ۲۱۹ھ رحمۃ اللہ علیہ، اسلام کے محاسن و مفاخر میں سے ہیں، علم حدیث میں ان کا مقام بہت بلند ہے، ساتھ ہی تفقہ میں بھی بڑے مقام و مرتبہ کے مالک ہیں، ان کے شیوخ میں امام سفیان بن عیینہؒ جیسے امام اسلام ہیں بلکہ آپ ان کے اجل تلامذہ میں سے ہیں، نیز امام مسلم بن خالد زنجی، امام فضیل بن عیاض، اور امام عبدالعزیز بن محمد دراوردی سے احادیث کی روایت کی، آپ کے تلامذہ میں امام بخاری جیسے امام حدیث شامل ہیں، نیز امام ذہلی، امام ابوزرعہ دمشقی، امام ابوحاتم رازی امام ابواسمٰعیل سلمی اور امام بشر بن موسیٰ وغیرہ نے آپ سے حدیث کی روایت کی، آپ کا شمار امام شافعی کے اصحاب کبار میں ہوتا ہے، صرف ایک استاد امام ابن عیینہ کی دس ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں، ابوحاتم رازی کا قول ہے کہ ابن عیینہ کی احادیث کے بارے میں حمیدی سب سے زیادہ اثبت و معتبر ہیں، ابن حبان نے کہا ہے کہ حمیدی بیس برس تک ابن عیینہ کی خدمت میں رہے ہیں۔ امام بخاری اپنے اس استاد کی ثقاہت و عدالت پر اس درجہ اعتماد رکھتے تھے کہ جب امام حمیدی سے ان کو کوئی حدیث پہونچتی تھی تو پھر کسی دوسرے سے اس کی روایت کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے، اور کہتے تھے کہ حمیدی حدیث کے امام ہیں ان کی جلالت شان کے لیے یہی کافی ہے کہ امام ابن عیینہ کی مجلس درس میں وہ اور امام شافعی

ایک ساتھ بیٹھا کرتے تھے، اور ان کو امام شافعی کی معاصرت ہی حاصل نہیں تھی بلکہ وہ ان کے استاد بھائی بھی ہیں، اور امام شافعیؒ کی وفات کے بعد ان کے حلقۂ درس کے صدر نشین بنا بیٹھنا چاہا مگر امام صاحب کے تلمیذ رشید ابن عبد الحکم آڑے آ گئے، امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بلغمی بدن کے کسی آدمی کو حمیدی سے زیادہ حافظہ والا نہیں دیکھا، امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ حمیدی ہمارے نزدیک امام ہیں، فسوی نے کہا کہ میں نے حمیدی سے زیادہ اسلام اور اہل اسلام کا خیر خواہ کسی کو نہیں پایا، حاکم کا قول ہے کہ حمیدی اہل مکہ کے مفتی و محدث ہیں، اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ ائمۂ دین ہمارے زمانہ میں شافعی، حمیدی اور ابو عبید ہیں، محمد بن عبد الرحمن ہروی کا بیان ہے کہ امام ابن عیینہ کی وفات کے فوراً ہی بعد میں مکہ مکرمہ گیا اور ان کے اجلّ اصحاب کے بارے میں پوچھا تو سب لوگوں نے حمیدی کا نام لیا، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ امام بخاری کے تذکرہ نگاروں میں سے ہر ایک نے تصریح کی ہے کہ حمیدی فقہ اور حدیث میں ان کے استاد ہیں۔

اسی طرح امام حمیدی کے بہت سے اقران و معاصرین نے ان کے فضل و کمال اور امامت کا اعتراف کیا، اور ان کے بارے میں سب ہی رطب اللسان ہیں، البتہ بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مغلوب الغضب تھے اگر کوئی شخص ان کی مرضی کے خلاف کچھ کہتا تو اس کے رد میں نہایت شدت اختیار کرتے اور اپنی جلالتِ شان کے خلاف بات کرتے، اس سلسلہ میں واقعہ بہت مشہور ہے کہ حضرت امام شافعیؒ کے انتقال کے بعد ان کے دو خصوصی تلامذہ یوسف بویطی اور ابن عبد الحکم میں ان کی جانشینی اور ان کے حلقۂ درس کی صدر نشینی کے بارے میں اختلاف پڑ گیا اور ہر ایک نے کہا کہ میں زیادہ مستحق ہوں، امام حمیدی نے جو اتفاق سے ان دنوں مصر ہی میں اس قضیہ کے وقت موجود تھے، کہا کہ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ یوسف بویطیؒ سے زیادہ نہ کوئی دوسرا میری جانشینی کا مستحق ہے اور نہ ہی میرے تلامذہ میں ان سے بڑا کوئی عالم ہے، یہ سن کر ابن عبد الحکم نے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، اس کے جواب میں حمیدی نے کہا کہ تم جھوٹے، تمہارے باپ جھوٹے

اور تمھاری ماں جھوٹی، اسی قسم کے ایک اور واقعہ کو امام احمد نے بیان کیا ہے کہ بشر بن سری الأفوہ نے ایک موقع پر کہہ دیا کہ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ میں مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہے یا اسی قسم کے الفاظ کہے تو اہل مکہ اور امام حمیدیؒ ان کے درپے ہوگئے اور سخت سست کہا، بشر بن سری الأفوہ نے اس بات پر معذرت بھی کی مگر انھوں نے ایک نہ سنی، بلکہ دارقطنی نے یہاں تک لکھا ہے کہ جب بشر بن سری الأفوہ کے خلاف یہ بات ہوئی تو انہوں نے قسم کھا کر حمیدی سے معذرت چاہی، مگر اس پر بھی انہوں نے ان کو معاف نہیں کیا اور کہا کہ بشر بن سری جہمی ہیں، ان سے احادیث کا لکھنا جائز نہیں ہے، حالانکہ یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ میں نے بشر بن سری کو دیکھا ہے کہ قبلہ رو ہوکر ان لوگوں کے لیے بددعا کر رہے ہیں، جنھوں نے ان کو جہمی ہونے کا الزام لگایا اور کہتے تھے کہ میں جہمی ہونے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، ان دونوں واقعات سے امام حمیدی کی تند مزاجی اور خفگی وسختی کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے، اسی ذہن مزاج سے انہوں نے امام ابوحنیفہؒ اور فقہاء عراق کو اپنا نشانہ بنایا، ان کے بارے میں کھل کر زبان کھولی اور اس سلسلہ میں ان کی ایک مستقل تصنیف کتاب الرد علی النعمان بھی ہے، مگر علماء ومحدثین نے ان کی ان باتوں کا خیال نہیں کیا، چنانچہ علماء نے بشر بن سری أفوہ کو نہایت ثقہ راوی قرار دے کر ان کی احادیث کو قبول کیا حتیٰ کہ خود امام حمیدی کے تلمیذ خاص امام بخاری نے الجامع الصحیح میں بشر سے روایت کی ہے، اور بلا کسی نکیر کے ان کو مقبول وثقہ مانا ہے۔

امام حمیدی ۲۱۹ھ میں مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے، ان کی تصانیف میں کتاب المسند بہت زیادہ مشہور متداول رہی، اس کے علاوہ ابن ابی حاتم رازی نے لکھا ہے کہ ابوبکر محمد بن عمیر طبری نے امام حمیدی سے انکی کتاب الرد علی النعمان اور کتاب التفسیر روایت کی ہے۔

مسند حمیدی کی اہمیت وافادیت

مسند حمیدی کو ان کے متعدد تلامذہ نے ان سے روایت کی ہے جن میں بشر بن موسیٰ اسدی متوفی ۲۸۸ھ زیادہ مشہور ہیں، دوسرے راوی ابواسمٰعیل سلمی متوفی ۲۸۰ھ ہیں، ان دونوں حضرات

کے علاوہ بقول ابن حجر "غیر واحد" نے حمیدی سے اس کی روایت کی ہے، مگر آج دنیا کے مختلف
کتب خانوں میں مسند حمیدی کا جو مخطوطہ محفوظ ہے وہ صرف بشر بن موسیٰ کی روایت کا ہے، اور
اسی نسخہ کو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی نے مرتب و مدون فرمایا اور مجلس علمی ڈابھیل
نے ۱۳۸۲ھ و ۱۳۸۳ھ (۱۹۶۳ء) میں پہلی بار شائع کیا، مولانا کو اس کے چار قلمی نسخے مل سکے
تھے، ایک کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں جو ۱۳۲۴ھ کا مکتوبہ تھا، دوسرا کتب خانہ سعیدیہ
حیدرآباد میں جو ۱۳۱۱ھ میں لکھا گیا تھا، تیسرا کتب خانہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں جو
۱۲۹۵ھ کا مکتوبہ تھا اور چوتھا دارالکتب الظاہریہ دمشق میں جو مائیکروفلم کے ذریعہ مسند حمیدی کی
طباعت کے دوران ملا، اور مولانا نے اس سے بھی استفادہ کیا، ویسے دیوبندی اور سعیدی نسخوں
کو اصل قرار دے کر کتاب کی تصحیح و تعلیق کی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہوا جب حدیث کی باقاعدہ تدوین فقہی ترتیب پر کی گئی تو قدما کی جوامع و مسانید اور
معاجم کی احادیث جدید کتابوں میں آگئیں اور ان کی اکثر و بیشتر احادیث جدید تدوین کے مختلف
ابواب میں داخل کر لی گئیں، اس کے بعد ان کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی، مگر ان کی
اشاعت کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ احادیث کے موجودہ سرمایہ کو تیسری اور چوتھی
صدی کی پیداوار بتاتے ہیں، اور مستشرقین کی دسیسہ کاریوں کا شکار ہو کر تشکیک و تشکک میں
مبتلا ہیں، اگر وہ عقل و انصاف سے کام لے کر احادیث کے ان قدیم ترین ماخذوں کو دیکھیں
جن سے بعد میں احادیث کی کتابیں مرتب ہوئی ہیں، اور ان کے رواۃ و متون پر نظر ڈالیں تو معلوم
ہو جائے کہ مسلمان قوم کا یہ فخر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے اور دنیا کی کوئی دوسری قوم
اس بارے میں بھی مسلمان قوم کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے، اور احادیث کے ان قدیم
ذخیروں میں اور بعد کی کتابوں میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا، دوسرا فائدہ ان قدیم کتابوں کی
اشاعت میں یہ ہے کہ ان میں جگہ جگہ احادیث کے متون و الفاظ پر اور رجال و رواۃ کے احوال
ان کے مصنفین اور ان کے شیوخ کی آراء ملتی ہیں جن سے احادیث کی روایت و درایت کے

بارے میں سلف صالحین کے نظریات و افکار کا پتہ چلتا ہے، تیسری بات یہ ہے کہ بعد کے کسی محدث نے اپنے سلسلہ سے کوئی حدیث بیان کی ہے اور قدماء کی کتابوں میں وہی حدیث ان کے سلسلۂ سند سے بعض الفاظ و تعبیرات میں مختلف ملتی ہے تو اس اختلاف سے بعض اوقات اہم مسائل حل ہو سکتے ہیں اور چوتھی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ عہد رسالت سے قریب تر زمانے کے اسلامی علوم کا معتد بہ سرمایہ بلا کم و کاست ہمارے پاس آجاتا ہے جس میں دین اور دینی معاملات و مسائل کی صحیح روح نہایت سیدھے سادے انداز میں مل جاتی ہے، اور بعد کے عجمی اثرات یا نقطہائے نظر کے اختلافات کی آمیزش ان میں نہیں ہے۔

تعلیق و تصحیح مولانا نے اس کتاب کی تصحیح ہی نہیں کی ہے بلکہ اس کی احادیث کی تخریج بھی ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ اس کی احادیث بعد کی کتب احادیث میں سے کن کن کتابوں میں کہاں موجود ہیں، کن طرق سے آئی ہیں اور ان میں کیا اختلاف ہے اس طرح کی تخریج کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک کتاب کے دیکھنے سے ایک حدیث کے بارے میں بہت سی معلومات ہو جاتی ہیں یہ کام بڑا وقت طلب ہے، ساتھ ہی جہاں ضرورت محسوس ہوئی حدیث کے غریب الفاظ کی شرح و توضیح بھی کر دی ہے، ابتدا میں ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی ترتیب وار فہرست ہے جس کی مسانید اس کتاب میں موجود ہیں۔ پھر فقہی ترتیب پر احادیث کی فہرست بڑی عرق ریزی سے مرتب کی گئی ہے، اور مختلف مسانید کی احادیث کو ایک باب میں بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد اعلام و امکنہ کی فہرست ہے پھر پُر مغز مقدمہ ہے جس میں امام حمیدی اور مسند حمیدی کے رواۃ کے حالات وغیرہ درج ہیں، آخر میں بتایا گیا ہے پوری کتاب میں کل ۱۳۰۰ حدیثیں ہیں جن میں اکثر و بیشتر مرفوع ہیں اور کچھ ایسے آثار ہیں جو صحابہ اور تابعین پر موقوف ہیں، مختلف فہارس اور مقدمہ وغیرہ کے علاوہ پوری کتاب دو جلدوں میں ۵۴۶ صفحات پر نہایت روشن ٹائپ میں طبع ہوئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے اس نادر و نایاب کتاب کی تعلیق و تحقیق اور تصحیح میں موجودہ طرز

اوراس کی آسانیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی دقتِ نظر سے کام لیا ہے، امام حمیدی اور مسند
حمیدی کے بارے میں اکثر باتیں اس کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں، مزید کے لیے تذکرۃ الحفاظ ذہبی
ج ۲ صفحہ ۲ و ۳، طبقات الشافعیۃ الکبری، سبکی ج ا صفحہ ۲۶۲ و ۲۲۳ و ۲۷۵، تہذیب التہذیب
ابن حجر ج ۵ صفحہ ۲۱۵، فتح الباری ج ا صفحہ ۱۱، وج ۳ صفحہ ۳۲۷ وج ۹ صفحہ ۳۳ کتاب الجرح
والتعدیل ج ۲ قسم ا صفحہ ۵۶، وغیرہ ملاحظہ ہو۔

(۱۱)

امام سعید بن منصور خراسانیؒ کی کتاب السنن

حضرت امام ابو عثمان سعید بن منصور خراسانی رحمہ اللہ متوفی ۲۲۷ھ محدثین کرام کے طبقۂ اول سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کی کتاب السنن احادیثِ رسول کے ابتدائی سرمایہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور ہمیشہ سے علمائے اسلام میں مقبول و متداول رہی ہے، مگر حدیث کی بعض دوسری قدیم کتابوں کی طرح یہ بھی اب تک طبع ہو کر سامنے نہ آسکی تھی، اب محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب حیدر آبادی ثم فرانسادی کی کوشش سے اس کی تیسری جلد ۱۳۸۰ھ میں ترکی کے کتب خانہ محمد پاشا کوپریلی سے دستیاب ہوئی ہے، اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی کی تعلیق و تصحیح کے ساتھ اس کی طباعت و اشاعت مجلس علمی ڈابھیل و کراچی کے ذریعہ ہو رہی ہے[1] اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ امام سعید بن منصور، ان کی کتاب السنن اور اس کی تعلیق و تصحیح کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کر دی جائیں، تاکہ اہل علم اس کتاب کی عظمت و اہمیت کا اندازہ کر سکیں۔

امام سعید بن منصور کی جلالتِ شان کے لیے کافی ہے کہ ایک طرف ان کے اساتذہ شیوخ میں امام مالک، امام لیث بن سعد، امام سفیان بن عیینہ اور امام حماد بن زید جیسے ائمہ حدیث ہیں، تو دوسری طرف ان کے حلقۂ درس سے امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم اور ابوداؤد جیسے ائمہ پیدا ہوئے۔ ان کی کتاب السنن کی شہرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی نسبت سے صاحب السنن مشہور ہوئے، سنن پر ایسی کتاب بہت کم محدثین نے لکھی ہے، ہر موضوع پر احادیث

[1] دو جلدوں میں شائع ہوگئی۔

رسول کے ساتھ آثار صحابہ کا جو سرمایہ اس کتاب میں ملتا ہے اس کی مثال دوسری کتابوں میں نہیں ملتی، اس کی ضخامت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے اس کی تیسری جلد کا جو ناقص نسخہ دستیاب ہوا ہے وہ تعلیق و تحشیہ کے بعد تقریباً نوسو صفحات میں آیا اور طباعت کے بعد اس کی ضخامت بارہ سو صفحات ہوگی۔

سعید بن منصور

سعید بن منصور بن شعبہ نام، ابوعثمان کنیت، اور مجاور مکہ لقب ہے، خراسانی مروزی، بلخی اور طالقانی کی نسبت سے مشہور ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ خراسان کے شہروں مرو، بلخ اور طالقان سے ان کا اقامتی تعلق رہا، ایک قول کی بنا پر ان کی ولادت خراسان کے شہر جوزجان میں اور نشوونما بلخ میں ہوئی، دینی و علمی اسفار اور احادیث کے اخذ و روایت میں زندگی کا بیشتر حصہ گذرا، آخر میں مکہ مکرمہ میں اقامت و مجاورت اختیار فرمائی، جہاں ۲۲۷ھ میں وفات پائی۔

امام سعید بن منصور کا تذکرہ یوں تو رجال و تواریخ کی تقریباً تمام کتابوں میں ہے مگر سب سے اہم تذکرہ ان کے دو معاصروں کی کتابوں میں ہے، ایک امام ابن سعد ۲۳۰ھ کی طبقات کبریٰ میں، دوسرا امام بخاری ۲۵۶ھ کی تاریخ کبیر اور تاریخ صغیر میں، ان دونوں کے بعد تیسرا اہم تذکرہ امام ابن ابی حاتم رازی ۳۲۷ھ کی کتاب الجرح والتعدیل میں ہے، جو ان کے متقدمین تذکرہ نگاروں میں سب سے مفصل ہے، ابن ابی حاتم رازی کی ولادت امام سعید بن منصور کی وفات کے کل تیرہ سال بعد ہوئی ہے، اس لیے اس کی اہمیت پہلے دونوں تذکروں سے کم نہیں ہے، بعد کے مورخوں اور تذکرہ نگاروں میں امام ابن جوزی ۵۹۷ھ نے المنتظم میں، امام ذہبی ۷۴۸ھ نے تذکرۃ الحفاظ اور العبر فی خبر من غبر میں، امام ابن کثیر ۷۷۴ھ نے البدایہ والنہایہ میں، امام حافظ ابن حجر ۸۵۲ھ نے تہذیب التہذیب میں اور ابن العماد ۱۰۸۹ھ نے شذرات الذہب میں امام سعید بن منصور کا تذکرہ کیا ہے، ان میں ذہبی، ابن کثیر اور ابن حجر کے تذکرے مفصل ہیں۔

امام سعید بن منصور کا نام ونسب اور اجمالی حال ان کے معاصر مورخوں نے یہ لکھا ہے۔

ابن سعد لکھتے ہیں:۔

سعید بن منصور، یکنی اباعثمان	سعید بن منصور کی کنیت ابوعثمان ہے ۲۲۷ھ
توفی بمکۃ سنۃ ۲۲۷ھ	میں مکہ میں فوت ہوئے۔

امام بخاری لکھتے ہیں:۔

سعید بن منصور مات بمکۃ	سعید بن منصور نے ۲۲۹ھ میں یا اس کے قریب
سنۃ تسع وعشرین ومائتین ۲۲۹	مکہ میں وفات پائی، ان کی کنیت ابوعثمان ہے
او نحوها، ابوعثمان، خراسانی	خراسان کے رہنے والے تھے، مکہ میں سکونت
سکن مکۃ، وسمع عبید اللہ بن	اختیار کر لی تھی، عبید اللہ بن ایاد اور حجر بن
ایاد، وحجر بن الحارث[1]	حارث سے احادیث کا سماع کیا۔

امام بخاری نے تاریخ صغیر میں سعید بن منصور کی وفات ۲۲۷ھ ہی بیان کی ہے، ابن ابی حاتم رازی لکھتے ہیں:

سعید بن منصور، ابوعثمان	ابوعثمان سعید بن منصور نے مکہ میں سکونت
سکن مکۃ ومات بها[2]	اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔

اس کے بعد ابن ابی حاتم نے اساتذہ وتلامذہ اور توثیق کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

امام ذہبیؒ لکھتے ہیں۔

سعید بن منصور بن شعبة	سعید بن منصور بن شعبہ، حافظ حدیث امام
الحافظ، الامام الحجۃ، ابو	اور حجت ہیں، ابوعثمان کنیت ہے مروزی
عثمان المروزی، ویقال الطالقانی	طالقانی اور بلخی کی نسبت سے مشہور ہیں
ثم البلخی، المجاور بمکۃ صاحب السنن[3]	مجاور مکہ ہیں، ان کی تصنیفات میں کتاب السنن ہے

[1] تاریخ کبیر ج ۲، ق ۱ ص ۴۷۲ [2] کتاب الجرح والتعدیل ج ۲ ق ۱ ص ۶۸ [3] تذکرة الحفاظ ج ۲ ص ۵

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :-

سعید بن منصور صاحب السنن المشهورة التی لا یشارکہ فیہا الا القلیل۔ (البدایۃ ۱۰/۲۹۹)	سعید بن منصور کتاب السنن کے مصنف ہیں جس میں بہت کم لوگ ان کے مقام کو پہونچ سکے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

سعید بن منصور بن شعبة الخراسانی ابو عثمان المروزی ویقال الطالقانی یقال ولد بجوزجان ونشأ ببلخ وطاف البلاد، وسکن مکة ومات بها[1] (۴-۸۹)	سعید بن منصور بن شعبہ خراسانی کی کنیت ابو عثمان ہے، مروزی اور طالقانی کی نسبت سے مشہور ہیں ایک قول کے مطابق جوزجان میں پیدا ہوئے اور بلخ میں نشو و نما ہوئی اور طلبِ علم میں بہت سے شہروں کا چکر کاٹا، آخر میں مکہ میں سکونت پذیر ہو کر وہیں فوت ہوئے

ابن العماد لکھتے ہیں :-

ابو عثمان سعید بن منصور الخراسانی الحافظ، صاحب السنن[2] (۲/۶۲)	ابو عثمان سعید بن منصور خراسانی حافظ حدیث اور کتاب السنن کے مصنف ہیں

اساتذہ و تلامذہ امام سعید بن منصور کی علمی زندگی دوسری صدی ہجری کے وسط سے شروع ہوئی جس میں علوم حدیث کی باقاعدہ تدوین شروع ہو گئی تھی، اور عالمِ اسلام ایک دار العلم کی حیثیت رکھتا تھا، علمائے اسلام بڑے جوش کے ساتھ دنیا میں گھوم گھوم کر احادیثِ رسول کی روایت میں مشغول تھے، امام سعید بن منصور نے طالقان، بلخ، مکہ مکرمہ اور دوسرے اسلامی ملکوں کے محدثین سے فیض اٹھایا، حافظ ابن

[1] کتاب الجرح والتعدیل ج ۲ ق ۱ ص ۶۸ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵

ان کے ان اسفار کو طاف البلاد کے جامع الفاظ سے تعبیر کیا ہے، ذہبی نے ان کے چند شیوخ کے نام لکھ کر وخلق[1] اور ابن حجر نے جماعۃ لکھا ہے، جن اساتذہ کے نام تصریح کے ساتھ تراجم ورجال کی کتابوں میں آئے ہیں، وہ یہ ہیں، امام مالک، لیث بن سعد، عبید بن ابی حجر بن حارث، طلحہ بن عمرو، فلیح بن سلیمان، ابو معشر نجیح سندی، ابو عوانہ، حماد بن زید، ابو قدامہ، حارث بن عبید، داؤد بن عبدالرحمٰن، ابوالاحوص، سفیان بن عیینہ، مہدی بن میمون، ہشیم اور جریر بن عبدالحمید وغیرہ رحمہم اللہ۔

آپ کے تلامذہ واصحاب کی فہرست بھی بہت طویل ہے، ذہبی نے کچھ شاگردوں کے نام لکھ کر وخلق اور ابن حجر نے وطائفۃ اور ابن کثیر نے جماعۃ لکھ دیا ہے، چند کے نام یہ ہیں: امام احمد بن حنبل، ابو زرعہ رازی، ابو زرعہ دمشقی، ابو بکر الاثرم، ابو داؤد، بشر بن موسیٰ، ابو شعیب حرانی محمد بن علی الصائغ، یحییٰ بن موسیٰ، ابو ثور، عبداللہ دارمی، محمد بن علی بن میمون رقی، عباس ابن عبداللہ سندی، عمرو بن منصور نسائی، ذہلی، حرب بن اسمٰعیل کرمانی، حسن بن محمد زعفرانی، احمد بن نجدہ بن عریان، احمد بن خلید حلبی، محمد بن خلیفہ بن صدقہ، ابو جعفر عنبر دیر عاقولی، عبداللہ بن محمد بن اسمٰعیل بن لاحق بزاز، اور جعفر بن محمد بن قعقاع ابو محمد بغوی وغیرہ رحمہم اللہ،

ذہبی نے العبر میں اور ابن عماد نے شذرات الذہب میں تصریح کی ہے کہ امام بخاری نے ایک واسطہ سے آپ کے شاگردوں میں ہیں۔

وقد روی البخاری عن رجل عنہ[1] — بخاری نے ایک واسطہ سے آپ سے روایت کی ہے،

ابن حجر نے لکھا ہے کہ امام احمد نے اپنے استاذ سعید بن منصور کی زندگی ہی میں ان کے اثر سے روایت کی۔

واحمد بن حنبل حیٌّ عنہ — احمد بن حنبل نے سعید بن منصور سے پڑھی ہوئی

---

[1] العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۳۹۹ طبع کویت وشذرات الذہب ج ۲ ص ۶۲۔

وهو حیّ۔	حدیثوں کی روایت ان کی زندگی ہی میں کی:

کسی استاذ کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ اس کی زندگی ہی میں اس کی بیان کی ہوئی احادیث اس کا شاگرد اپنے حلقۂ درس میں بیان کرے، ان کے تلامذہ میں محمد بن علی الصائغ اور احمد بن نجدہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ انہوں نے اپنے استاذ کی کتاب السنن کی روایت کی ہے، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

ومحمد بن علی بن زید الصائغ	محمد بن علی بن زید صائغ اور احمد بن نجدہ ابن
واحمد بن نجدۃ بن العریان	عریان ان دونوں نے سعید بن منصور کی
وهما راویا کتاب السنن عنه	کتاب السنن کو ان سے روایت کیا، اور
(تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۹۰)	دوسروں کو پڑھایا۔

چنانچہ سنن سعید بن منصور کا جو نسخہ دستیاب ہوا ہے، وہ محمد بن علی بن زید الصائغ ہی کی روایت سے ہے:

حافظہ، ثقاہت اور تبحّر

ہمارے محدثین کرام کا حافظہ احادیث رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا کھلا ہوا معجزہ ہے، امام سعید بن منصور کو بھی اس سے حصۂ وافر ملا تھا، ان کے شاگرد حرب بن اسمٰعیل کرمانی کا بیان ہے:۔

املی علینا نحواً من عشرۃ الآف	انھوں نے ہم کو تقریبًا دس ہزار حدیثیں زبانی
حدیث من حفظہ ثم صنف بعد ذلک (ایضًا)	املا کرائیں، اس کے بعد تصنیف کا کام کیا۔

احمد بن صالح اور عبد الرحمٰن بن ابراہیم کا بیان ہے:۔

انهما حضرا یحیی بن حسان	ان دونوں نے یحیی بن حسان اور سعید بن
یقدمہ، ویری لہ حفظہ وکان	منصور کو سب پر ترجیح دیتے ہوئے دیکھا
حافظاً۔	ہے اور یحیی بن حسان خود ان کے حافظہ کے
(ایضًا)	قائل تھے، اور وہ حافظِ حدیث تھے:

امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان الفاظ کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے"۔

الحافظ، الامام، الحجۃ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵) سعید بن منصور حافظ، امام اور حجت ہیں"۔

ابن العماد نے بھی ان کو الحافظ کے لقب سے یاد کیا ہے" (شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۲)

امام سعید بن منصور کے تبحر اور حافظہ کے لیے اتنی شہادتیں کافی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم ان کو دس ہزار حدیثیں یاد تھیں، اور حفاظ حدیث میں ان کا شمار ہوتا تھا"۔

ان کے تبحر علمی کا اندازہ ذیل کی تصریحات سے بھی ہوتا ہے"۔

سلمہ بن شبیب کا بیان ہے کہ:-

ذکرت سعید بن منصور لاحمد بن حنبل فاحسن الثناء علیہ وفخم امرہ۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵ والبدایۃ والنہایۃ ج ۱۰ ص ۹۹)

میں نے ایک مرتبہ امام احمد کے سامنے سعید بن منصور کا تذکرہ کیا تو امام صاحب نے ان کی بڑی تعریف کی اور ان کے علمی کام کی بڑی اہمیت ظاہر کی۔

محدثین کرام میں امام اسمٰعیل بن علیہ بڑے پایہ کے محدث تھے، سعید بن منصور ان کی احادیث کے راوی و ناشر تھے، ابوعبداللہ حاکم کا بیان ہے۔

وکان راویۃ ابن علیۃ واحد ائمۃ الحدیث۔ (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۹۰)

سعید بن منصور امام ابن علیہ کے علم کے راوی و ناقل اور ائمہ حدیث میں ایک امام ہیں"۔

علوم حدیث میں ان کی جامعیت کی شہادت ابوحاتم رازی اور ابن حبان نے ان الفاظ میں دی ہے۔

کان ممن جمع وصنف۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵ وتہذیب التہذیب ج ۴ ص ۹۰)

سعید بن منصور ان علماء میں سے تھے جنہوں نے احادیث کو جمع اور مدون کیا ہے"۔

تقریباً سب ہی ائمہ جرح وتعدیل امام سعید بن منصور کے ثقہ، حجت، متقن اور ثبت

ہونے پر متفق ہیں، اور ان کی توثیق کا اعتراف شاندار الفاظ میں کیا ہے، امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے حرب بن اسمٰعیل کا بیان ہے:۔

سمعت احمد بن حنبل يحسن الثناء علي سعيد بن منصور۔	میں نے امام احمد کو سعید بن منصور کی اچھے انداز میں تعریف کرتے ہوئے سنا ہے۔

سلمہ بن شبیب کا یہ بیان گزر چکا ہے کہ:۔

ذكرت سعيد بن منصور لاحمد بن حنبل فأحسن الثناء عليه وفخم امره۔	میں نے امام احمد کے سامنے سعید بن منصور کا تذکرہ کیا تو انھوں نے نہایت اچھے الفاظ میں ان کی تعریف کی اور ان کے علمی کام کو اہمیت دی۔

امام احمد کا ایک قول یہ بھی ہے۔

هو من اهل الفضل والصدق	سعید بن منصور ارباب فضل اور اہل صدق میں سے ہیں

ابن ابی حاتم رازی نے لکھا ہے۔

سألت ابي عن سعيد بن منصور فقال ثقة۔	میں نے اپنے والد ابوحاتم رازی سے سعید بن منصور کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے ان کو ثقہ بتایا۔

عیسیٰ بن بشیر کا بیان ہے۔

سألت محمد بن عبد الله بن نمير عن سعيد بن منصور فقال ثقة۔	میں نے محمد بن عبداللہ بن نمیر سے سعید بن منصور کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ ثقہ ہیں۔

ابوحاتم رازی کا قول ہے۔

ثقة من المتقنين الاثبات۔	سعید بن منصور متقن اور ثبت ہیں۔

محمد بن ابراہیم کا حال یہ تھا کہ:۔

اذا حدث عنه اثنى عليه وكان	جب سعید بن منصور کی احادیث کی روایت کرتے

یقول حدثنا سعید و — تو ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے کہ ہم سے سعید نے
کان ثبتا۔ — یہ حدیث بیان کی ہے، اور وہ ثبت تھے۔

ابن حبان نے کتاب الثقات میں یہی الفاظ لکھے ہیں۔

خلیلی نے کہا ہے۔

ثقۃ، متفق علیہ[1] — سعید بن منصور ثقہ ہیں، انکی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے

اسی طرح ابن فراش، ابن قانع، ابوزرعہ دمشقی، مسلمہ بن قاسم اور دیگر ائمہ حدیث نے امام سعید بن منصور کو ثقہ اور ثبت کہا ہے۔

ان تمام جہابذۂ علم وفن اور ائمۂ جرح و تعدیل کی ان تصریحات کے مقابلہ میں یعقوب بن سفیان نے امام سعید بن منصور کے بارے میں کہا ہے۔

کان اذا رأی فی کتابہ خطأ — وہ جب اپنی کتاب میں کوئی غلطی دیکھتے تو اس سے
لم یرجع عنہ۔ — رجوع نہیں کرتے تھے۔

حافظ ابن حجر نے انتہائی دیانتداری کی بنا پر یہ قول بھی نقل کردیا ہے، مگر دوسرا کوئی شخص بھی اس میں یعقوب کا ہمنوا نہیں ہے، اس لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

وفات اور عمر — باتفاق مورخین امام سعید بن منصور کی وفات مکہ مکرمہ میں رمضان ۲۲۷ھ میں ہوئی، امام بخاری نے تاریخ کبیر میں ۲۲۹ھ لکھ کر "او نحوھا" لکھا ہے، مگر تاریخ صغیر میں ۲۲۷ھ ہی کو اختیار فرمایا ہے، ابن یونس نے جائے وفات مکہ مکرمہ کے بجائے مصر بتائی ہے، ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں رمضان ۲۲۷ھ میں مکہ مکرمہ میں وفات کی تصریح کرکے لکھا ہے۔

قلت وھو فی عشر التسعین — اس وقت ان کی عمر نوے کی دہائی میں تھی۔

۲۲۷ھ میں وفات کے وقت اگر سعید بن منصور کی عمر اسی اور نوے کے درمیان میں تھی۔

---

[1] ان اقوال کے لیے کتب محولہ بالا ملاحظہ ہوں۔

تو اس اعتبار سے ان کی ولادت ۱۴۰ھ کے قریب ہوئی ہوگی۔

کتاب السنن

امام سعید بن منصور نے اس دور میں آنکھ کھولی جب پورے عالم اسلام میں احادیث کی تدوین ہو رہی تھی، ۱۴۰ھ اور ۱۵۰ھ کا درمیانی زمانہ احادیث کی تدوین و تالیف کا ابتدائی زمانہ ہے، ہر اقلیم کے ائمۂ حدیث نے اپنی مرویات و احادیث کو اسی دور میں مدون کیا اور اسی کے بعد محدثین کرام نے احادیث کی روایت کے ساتھ ساتھ ان کی جمع و تدوین کا سلسلہ بھی جاری رکھا، چنانچہ امام سعید بن منصور نے یہ دونوں کام انجام دیے، مگر کتاب السنن کے علاوہ ان کی اور کسی تصنیف کا تذکرہ نہیں ملتا، ان کی تصنیفی خدمت کا تذکرہ ابو حاتم رازی اور ابن حبان نے اس طرح کیا ہے۔

وکان ممن جمع وصنّف - سعید بن منصور احادیث کے جامع و مصنف تھے۔

کتاب السنن اپنی زندگی کے آخری دور میں جب مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، لکھی، مکہ مکرمہ میں ۲۲۷ھ میں وفات ہوئی، اس کے پہلے اور ۲۱۹ھ کے بعد یہ کتاب لکھی تھی، آپ کے شاگرد حرب بن اسمٰعیل کرمانی کا بیان ہے۔

کتبت عنہ سنۃ ۲۱۹ھ، املی علینا — میں نے ان سے ۲۱۹ھ میں احادیث لکھیں،

نحواً من عشرۃ الاف حدیث من حفظہ — انہوں نے ہمیں تقریباً دس ہزار حدیثیں

ثم صنف بعد ذالک - (تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۹۰) زبانی لکھائیں، اس کے بعد تصنیف کا کام کیا

یہی وجہ ہے کہ کتاب السنن کی روایت آپ کے بہت سے تلامذہ میں سے صرف دو نے کی، جو آخر تک آپ کی خدمت میں رہے، یا بعد میں شاگرد ہوئے، ایک محمد بن علی بن زید الصائغ، اور دوسرے احمد بن نجدہ بن عربان۔

یہ تعجب انگیز ہے کہ سنن سعید بن منصور احکام میں حدیث کی بڑی جلیل القدر کتاب ہے، اور اس کا زمانۂ تصنیف صحیحین اور سنن اربعہ سے پہلے ہے، اس کے باوجود ان کے دو معاصر تذکرہ نگاروں ابن سعد اور امام بخاری میں سے کسی نے اس کتاب کا تذکرہ نہیں کیا، اور نہ

ابن ابی حاتم رازی نے اس کا نام لیا، جو کہ سعید بن منصور کے تھوڑے دنوں بعد ہوئے ہیں، بعد میں اس کتاب کی اہمیت اس طرح ظاہر ہوئی کہ امام سعید بن منصور اپنی اسی کتاب کی نسبت سے مشہور ہوئے، چنانچہ آٹھویں صدی ہجری میں ان کو اس کتاب کی نسبت سے صاحب السنن کے لقب سے یاد کیا جانے لگا، سب سے پہلے امام ذہبیؒ متوفی ۷۴۸ھ نے تذکرۃ الحفاظ اور العبر فی خبر من غبر میں اور امام ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ نے البدایہ والنہایہ میں صاحب السنن لکھا[1] بلکہ ابن کثیر نے اس کتاب کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا کہ:۔

صاحب السنن المشھورۃ... التی لا یشارکہ فیھا الا القلیل۔ — سعید بن منصور کی کتاب السنن وہ مشہور کتاب ہے جس میں بہت کم لوگ ان کی ہمسری کرسکے۔

ابن عماد متوفی ۱۰۸۹ھ نے بھی شذرات الذہب میں اسی نسبت سے آپ کا تعارف کرایا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آٹھویں صدی سے پہلے سنن سعید بن منصور مشہور و متعارف نہیں تھی، سعید بن منصور کے دو شاگردوں نے اپنے زمانہ میں اس کی روایت کی تھی، اور سنن کی دیگر کتب کی طرح اس کا بھی رواج ہوا، اور علمائے اسلام نے اپنی تصنیفات میں اس کی احادیث و آثار کو درج کیا اور اس کو احادیث کی معتبر و مستند کتابوں میں شمار کرکے اپنا ماخذ بنایا، چنانچہ ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث حافظ ابو العباس احمد بن عبداللہ محب الدین، طبری، مکی رحمہ اللہ، متوفی ۶۹۴ھ نے حج و مناسک کی مشہور کتاب "القریٰ لقاصد اُم القریٰ" میں سنن سعید بن منصور سے بہت زیادہ احادیث و آثار نقل کئے ہیں، اس کا شاید ہی کوئی صفحہ اس کی احادیث و آثار سے خالی ہو، اور بہت سے ابواب میں صرف اسی کی احادیث و آثار درج ہیں، ساڑھے چھ سو صفحات کی اس کتاب میں جگہ جگہ اخرجہ سعید بن منصور، اخرجہ سعید بن منصور، اخرجہما سعید بن منصور، اخرجہن سعید بن منصور، اخرج جمیع ذالک سعید بن منصور، اخرجہا سعید بن منصور فی سننہ کی تصریح موجود ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنن سعید بن منصور

[1] العبر ج اص ۲۹۹ میں صاحب السیر ہے جو صاحب السنن کی محرف شکل ہے اور یہ طباعت کی غلطی یا کتابت کی خطا ہے۔

ہیں حج ومناسک سے متعلق کس قدر مستند اور کس کثرت سے احادیث و آثار درج ہیں، بعد کی کتابوں میں سنن سعید بن منصور کو سنن وصحاح کی دوسری مشہور و مستند کتابوں کی طرح معیاری کتاب قرار دے کر اس کو ماخذ بنایا گیا۔

سنن سعید بن منصور کا موجود نسخہ

جیسا کہ ابتداء میں کہا گیا ہے، اس نادر و نایاب کتاب کی تیسری جلد وہ بھی ناقص محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی کوشش سے ۱۳۸۰ھ میں ترکی کے مشہور کتب خانہ محمد پاشا کوپریلی سے دستیاب ہوئی، یہ مخطوطہ نہایت خوشخط ہے، اس کی پشت پر مصنف ابن ابی شیبہ درج تھا، مگر اندرونی شہادتوں سے پتہ چلا کہ یہ سنن سعید بن منصور کا ٹکڑا ہے، اس جلد میں حسب ذیل ابواب و کتب ہیں:۔

(۱) باب الحث علی تعلیم الفرائض، من کتاب الفرائض (۲) کتاب ولایۃ العصبۃ (۳) کتاب الوصایا (۴) کتاب النکاح (۵) کتاب الطلاق (۶) کتاب الجہاد

اس جلد کی ابتداء بسم اللہ کے بعد اس عبارت سے ہوتی ہے:۔

اخبرنا الأنماطی، قال أبنأ الکرجی رحمہ اللہ، قال أبنا أبو علی بن شاذان قراءۃ علیہ وانا أسمع، قال آنا السجستانی قال آنا محمد بن علی الصائغ، قال ثنا سعید بن منصور، قال باب الحث علی تعلیم الفرائض۔ حد ثنا ابو عوانۃ و ابو الاحوص و جریر بن عبد الحمید عن عاصم الاحول عن مورق العجلی، قال قال عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ تعلموا الفرائض الخ۔

یہ نسخہ ربیع الاول ۵۲۵ھ میں دمشق کے قریب عبادیۃ نامی قریہ میں محمد بن احمد بن علی خطیب کے قلم سے لکھا گیا ہے، آخری صفحہ کے خاتمہ پر ترقیمہ کی یہ عبارت ہے:۔

"آخر کتاب الجہاد، کتبہ العبد الفقیر الی رحمۃ اللہ تعالیٰ محمد بن احمد بن علی الخطیب یومئذٍ بقریۃ العبادیۃ من مرج دمشق رحمہ اللہ وغفر لہ وکان الفراغ من کتابتہ العشر الاول من شہر ربیع الاول سنۃ خمس وعشرین

وسبعمائۃ من الهجرۃ النبویۃ "

اس جلد میں اسلام کے شخصی قوانین اور عائلی زندگی کے بارے میں بہت سے ایسے واقعات اور احادیث وآثار موجود ہیں جو حدیث کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتے، نکاح و طلاق وغیرہ معاشرتی زندگی کے متعلق صحابۂ کرام کے بہت سے آراء اور فتاوے ہیں کتاب الجہاد میں عہد صحابہ کے بین الاقوامی امور و معاملات سے متعلق عہد نامے پائے جاتے ہیں، جن سے رومیوں اور ایرانیوں اور خلافتِ اسلامیہ کے تعلقات و معاملات کی نوعیت پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔

اس کے مکمل نسخہ کا اب تک پتہ نہیں چل سکا ہے، صرف تیسری جلد کا ناقص نسخہ دستیاب ہو سکا ہے، جو انشاء اللہ پوری کتاب کے لیے مقدمۃ الجیش ہوگا۔

(۱۲)

فضل اللہ الصمد

توضیح الادب المفرد

تقسیم ہند کے بعد سے یہاں کے مسلمانوں میں انتشار و پریشان کا جو عالم برپا ہے اور جو پُر آشوبیٔ شباب ہے اسے دیکھتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ یہاں اسلامی علوم و فنون کی ٹھوس خدمت انجام پا سکتی ہے، اور یہاں کے علماء و فضلاء بھی عالم اسلام کے ارباب علم و فضل کی طرح علمی و تحقیقی کام کر سکتے ہیں، مگر الحمد للہ کہ اس دور میں بھی اس ملک میں ایسے اساطین علم و تحقیق موجود ہیں جو رات دن علمی و دینی امور میں منہمک رہ کر اسلامی علوم کے خالص دینی موضوعات عربی زبان میں کام کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں حدیث و رجال کی قدیم کتابیں تعلیق و تصحیح کے بعد شائع کرنا، شرح و حواشی اور مستقل کتابیں لکھنا سب کچھ ہو رہا ہے، پھر اجتماعی طور سے زیادہ انفرادی طور سے کام ہو رہا ہے اور یہاں کے علماء اپنے طور پر وہ کام کر رہے ہیں جو آج دنیا کے علمی حلقہ میں ادارے، اکاڈمیاں اور جماعتیں کر رہی ہیں، اس دور میں ہندوستان کے اسلامی ادب عالی میں عربی زبان میں جو مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور شائع ہوئی ہیں، ان میں فضل اللہ الصمد شرح الادب المفرد، از مولانا فضل اللہ صاحب گیلانی، مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح از مولانا عبید اللہ صاحب مبارک پوری، امانی الاحبار شرح معانی الآثار از مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی، رجال السند و الہند اور العقد الثمین از قاضی اطہر مبارکپوری خاص طور سے نمایاں ہیں اور پورے عالم اسلام کے علمی و دینی کارناموں میں شمار کی جانے کے قابل ہیں، وجہ ہے کہ عالم اسلام میں ان کتابوں کے ساتھ اعتنا کیا گیا، ان کو دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے اس گئی گزری حالت میں بھی اس ملک میں ایسے اہل علم موجود ہیں جو پورے انہماک سے اپنا کام

کررہے ہیں اوران کی علمی خدمات دنیائے اسلام میں سعی مشکور بن کر نمایاں ہورہی ہیں، اس وقت ہم فضل اللہ الصمد پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔

الادب المفرد کی اہمیت

امیرالمومنین فی الحدیث حضرت امام محمد بن اسمٰعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الجامع الصحیح حدیث کی وہ کتاب ہے جسے امت محمدیہ نے "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" مانا ہے، اس کے علاوہ بھی امام بخاریؒ کی متعدد قیمتی تصانیف ہیں جن میں الادب المفرد اپنی خصوصیت کے اعتبار سے خاص اہمیت و عظمت رکھتی ہے، اس کتاب میں امام صاحب نے ان احادیث رسول، آثار صحابہ اور اقوال واحوال تابعین کو چھوٹے چھوٹے ابواب کے ماتحت جمع کیا ہے، جو ایک مسلمان فرد کی دینی و اسلامی زندگی کے لیے معیار ہیں، یہ کتاب اسلامی اخلاقیات کے لیے جامع قوانین ہے۔ ہمارے علم میں اس موضوع پر سب سے پہلے حضرت امام مالک متوفی ۱۷۹ھ نے ایک مستقل کتاب خلیفہ ہارون رشید کی خواہش و فرمائش پر لکھی تھی جو "رسالۃ الامام مالک الی ہارون الرشید" کے نام سے مشہور ہے اور مصر میں چھپ چکی ہے، اردو میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے، راقم نے بھی "مسلمان" کے نام سے اس کی تلخیص وترجمہ کیا ہے اور دو بار یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ نیز احادیث کی کتابوں میں کتاب الادب اور دیگر ابواب وفصول کے تحت اخلاقی احادیث موجود ہیں مگر اس موضوع پر الادب المفرد مستقل دستورحیات کی حیثیت رکھتی ہے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی تقریبًا نصف احادیث صحیح بخاری کے مرتبہ کی ہیں اور نصف احادیث سے کم صحیح مسلم کے مرتبہ کی ہیں اور باقی حدیثیں صحت میں سنن سے زیادہ مرتبہ کی ہیں، نیز اس میں امام بخاری نے ان بہت سی احادیث کو موصول بیان کردیا ہے، جن کو صحیح بخاری میں تعلیقًا درج کیا ہے، اس میں وہ احادیث بھی ہیں جن کے کسی راوی یا لفظ کے بارے میں محدثین کو ذہول ہوگیا تھا، امام بخاری نے ان کو اس کتاب میں نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے، اور اس کی سب سے نمایاں اہمیت وخصوصیت یہ ہے کہ

اس میں بہت سے ایسے آثار و اخبار ہیں جو احادیث کی دوسری کتابوں میں نہیں ملتے، ان تمام خصوصیات کی وجہ سے الادب المفرد اسلامی اخلاق و آداب کے ساتھ احادیث و آثار کا مستند ترین مجموعہ ہے، اس کا ایک خلاصہ امام سیوطیؒ نے المنتقیٰ کے نام سے کیا تھا جیسا کہ چلپی نے کشف الظنون میں لکھا ہے، مگر اس اہمیت و عظمت کے باوجود یہ کتاب امام بخاری کی بعض دوسری کتابوں کی طرح ان کی الجامع الصحیح اور التاریخ الکبیر کی عظمت و شہرت کی وجہ سے ابھر نہ سکی اور اس کے ساتھ بہت کم اعتنار ہو سکا۔

طباعت و اشاعت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتابوں کی مقبولیت کا بھی ایک خطہ اور زمانہ ہوتا ہے، قدمار کی کتنی ہی اہم کتابیں ہیں جو ہمارے زمانہ میں رائج ہوئیں، الادب المفرد کا بھی یہی حال ہوا، اور آخری دور میں ہندوستان کے علمار اسے منظر عام پر لانے کا شرف رکھتے ہیں، جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس کی طباعت و اشاعت، ترجمہ اور شرح کا فخر یہیں کے علمار کو حاصل ہے، البتہ دو بار قسطنطنیہ میں طبع ہوئی تھی، یہ کتاب ہندوستان میں پہلی بار ۱۳۰۶ھ مطبع خلیلی شاہ آباد (آرہ) میں چھپی، پھر ۱۳۴۹ھ میں مطبع الشیخ عبدالو[...] التازی مصر میں دو قسم کے کاغذ پر طبع ہوئی، میرے کتب خانہ میں اسی طباعت کی ہے، ان د[...] مصر سے اس کا جدید ایڈیشن نئے طرز کی تعلیق و تحقیق کے ساتھ شائع ہوا ہے جس میں فضل اللہ[...] کے بھی حوالے موجود ہیں ـــ اس کا پہلا اردو ترجمہ نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم [...] توفیق الباری کے نام سے ۱۳۰۶ھ میں مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوایا، دوسرا اردو ترجمہ مولا[...] عبدالغفار صاحب مہدانوی بہاریؒ نے مطبع خلیلی آرہ میں ۱۳۰۹ھ میں طبع کرایا، نیز [...] کتاب کے قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود تھے، چنانچہ تین [...] کتب خانہ سعیدیہ حیدر آباد ہی میں موجود تھے، اور اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ظاہریہ [...] میں تھا، ان تمام مطبوعہ و مخطوطہ نسخوں کو سامنے رکھ کر حضرت مولینا فضل اللہ صاحب گیـ[...] سابق استاذ تفسیر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد نے اس کی بہترین شرح فضل اللہ الصمد شرح [...]

المفرد کے نام سے لکھی، اور اس اہم کتاب کو اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کا محور و مرکز بنا کر اس کا وہ حق ادا کیا جو اب تک علمائے امت کے ذمہ قرض کے طور پر باقی تھا، اللہ تعالےٰ مولانا موصوف کو دارین میں جزائے خیر دے۔

اس شرح کی خصوصیت

مولینا موصوف نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اور بہترین کوشش اس کی شرح کے لیے وقف فرمائی، مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں مقابلہ کیا، غیر ممالک سے بعض قلمی نسخوں کے فوٹو منگوائے، علمائے اسلام اور بعض مستشرقین سے خط و کتابت کی، اس میں اب تک جو غلطیاں چلی آرہی تھیں ان کی تصحیح کی سند کے رواۃ و رجال کی تحقیق کر کے ان کے حالات لکھے، شرح میں قدما کی پیروی کرتے ہوئے جدید حالات کی پوری پوری رعایت رکھی، احادیث و آثار کی تخریج کر کے بتایا کہ الادب المفرد کی حدیثیں کن کتب احادیث میں موجود ہیں، اور کون ایسی احادیث ہیں جو صرف اسی کتاب میں ہیں۔ دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتی ہیں، محدثانہ مباحث کے ساتھ فقہی مسائل اور دوسرے مسائل و مباحث حسب ضرورت بیان کئے، احادیث کی شرح میں جہاں حدیث و فقہ کی دوسری کتابوں اور شرحوں کے حوالے اور اقتباسات دیئے ہیں معمولی تصرف و تغیر سے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی، اور چونکہ شارح ایک علمی اور روحانی خانوادہ کے ممتاز فرد ہیں اور صلاح و تقویٰ اور علم و فضل کی وراثت رکھتے ہیں اس لیے احادیث کی شرح اور رواۃ و رجال کے تراجم میں روحانیت محسوس ہوتی ہے، محدثانہ اور فقیہانہ موشگافیاں اور علمی و فنی مباحث اس شرح کے جزء جزء سے ظاہر ہوتے ہیں، رواۃ و رجال کی تلاش و تحقیق میں سعی بلیغ کی ہے ہر ایک ایک حدیث اور اثر کی تعلیق و تصحیح کے ساتھ ان کے متعدد فہارس و جداول تیار کئے ہیں، اور فہرست میں صفحہ اور باب کے نمبر کے ساتھ اس باب میں جو احادیث اور آثار آئے ہیں ان کی الگ الگ تعداد بتائی ہے، احادیث و آثار کی تخریج اور ان کی فہرست سازی بڑی عرق ریزی سے کی گئی ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ صحاح ستہ میں کس کس نمبر کی احادیث

ہیں اور صحاح ستہ میں سے کس کتاب میں کون سی حدیث ہے، اور کس کتاب میں نہیں ہے، اور سنن، مسانید، اور جوامع کی کن کن کتابوں میں کون کون سی احادیث موجود ہیں اس جدول کے بعد ان اساتذہ و شیوخ کا جدول ہے جن سے امام بخاری نے الادب المفرد میں روایت کی ہے، پھر اسماء و اعلام، قبائل اور مقامات کی فہرست ہے، الغرض فضل اللہ الصمد سالہا سال کی محنت شاقہ کے نتیجہ میں اہل علم کے سامنے آئی ہے۔

۱۳۷۸ھ میں حجاز کے مشہور مخیر تاجر یوسف زینلی علی رضا کے زیر اہتمام و انتظام مطبعہ سلفیہ مصر میں طبع ہوئی، اور مصر کے قدیم محقق و محشی شیخ محب الدین الخطیب کی نگرانی میں طباعت کا کام انجام پایا ہے، مگر بے شمار مطبعی اغلاط نے کتاب کی اہمیت پر بٹہ لگا دیا ہے، جس کے لیے شارح ہر طرح معذور اور اہل علم کی ہمدردی کے مستحق ہیں، بہترین سفید کاغذ پر دو جلدوں میں چھپی ہے، جلد اوّل کے کل صفحات ۶۸۴۔ اور جلد ثانی کے ۷۳۶ ہیں، اس طرح تقریباً چودہ سو صفحات ہیں غالباً دنیا میں سب سے پہلے الادب المفرد کی شرح چھپ کر شائع ہوئی ہے۔

(۱۳)

مصحف عثمانی کا ایک مطبوعہ ٹکڑا (سورہ یٰسین)

ماہ معارف (دسمبر ۱۹۶۰ء) میں محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (فرانس) کا ایک مکتوب شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے مجھ سے قاضی رشید بن زبیر اور راجہ رسہی کے بارے میں تحقیق کی خواہش ظاہر فرماتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ "چند سال قبل رسالہ معارف نے مجھ سے پوچھا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے نسخہ قرآن کی موجودگی کی کیا حقیقت ہے، اس پر میرا جواب بھی چھپا تھا کہ اس کا عکس لے کر زار روس نے چھاپا تھا، اب اس کی کچھ مزید تفصیلیں بھی ملی ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس کا نسخہ برٹش میوزیم میں نہیں (جیسا کہ میں نے لکھا تھا) ڈرہام یونیورسٹی میں ہے، میں نے اس کا میکروفلم منگایا ہے، اگر آ جائے تو انشاء اللہ کچھ تفصیل آئندہ عرض کروں گا۔"

اس مصحف کے بارے میں معلومات کی فراہمی بڑی اہم چیز ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق میرے جو معلومات ہیں میں بھی ان کو پیش کر دوں، یہ مصحف عثمانی زار روس کے زمانہ میں شہر پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانہ میں موجود تھا، ۱۹۰۵ء میں ایک روسی عالم عبد اللہ بن الیاس بن احمد شاہ بورغانی قرمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقدس صحیفہ سے سورۂ یٰسین فوٹو بلاک کے ذریعہ چھاپی تھی، جس کا ایک نسخہ بمبئی کے مشہور فرنیچر تاجر جناب الحاج احمد غریب صاحب مرحوم کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ تھا، ہمارے علم میں ہندوستان میں اس کا صرف یہی ایک نسخہ تھا، ۱۹۲۵ء جب مرحوم احمد بھائی صاحب اور ان کے اخوان حج و زیارت کے لیے گئے تو مدینہ منورہ میں ایک روسی مہاجر عالم سے انھوں نے یہ نسخہ

بہت بڑی رقم کے بدلے حاصل کیا جب فروری ۱۹۵۷ء میں سابق حاکم قطر الشیخ علی بن عبداللہ
بن قاسم الثانی بمبئی آئے تھے تو انھوں نے بھی اس کی زیارت کی، اور زیادہ سے زیادہ قیمت
پر اسے حاصل کرنے کا اشارہ کیا مگر اس کے مالکوں نے جدا نہ کیا میں اس محفل میں ترجمان تھا

ناشر کا تعارفی بیان

یہ سورۂ شریفہ ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے، جدول کے اندر کی چوڑائی ۹½ انچ
اور لمبائی ۱۰½ انچ ہے، ہر صفحہ میں ۱۱ سطریں ہیں، اور لمبائی میں
ہے ٹائٹیل پر تین سطریں اس طرح ہیں۔

یٰسین شریف

طبع برخصۃ النظارۃ المطبوعات ؟ فی بطر بورغ شہر اپریل ۱۹۰۵ء

طبع بمطبع الیاس میرزا البورغانی القریمی فی بطر بورغ۔

اس کے آخر میں خاتمۃ الطبع کے طور پر ترکستانی زبان میں ایک تحریر ہے جس میں تفصیل
کے ساتھ مصحف عثمانی پر روشنی ڈالی گئی ہے، ہم نے بمبئی مقیم ایک ترکستانی مہاجر عالم سے
اس کا ترجمہ عربی زبان میں کرایا، اسی کا اردو ترجمہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے
اس ترجمہ در ترجمہ کے باوجود مصحف عثمانی کی پوری تفصیل معلوم ہوتی ہے، ملاحظہ ہو اس کے
طابع و ناشر شیخ عبداللہ بن الیاس بن احمد شاہ بورغانی قریمیؒ آخر میں لکھتے ہیں کہ ۲۶
۱۸۸۳ء کو میں نے اپنے وطن مالوف سے مقام پیٹرس برگ کی طرف ہجرت کی، اور اس شہر میں
مستقل طور سے رہنے لگا، ۱۸۸۹ء کی بات ہے کہ میں نے پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانہ
کی سیر کی اور اس کے شعبۂ مخطوطات کے قدیم قلمی نوادر کا مطالعہ کیا، اس نادر خزانہ میں
ہر مذہب و ملت کی کتابیں ہیں، ایک دن حسن اتفاق سے ایک بڑی الماری کے اندر
خط کوفی میں ایک قدیم مصحف شریف نظر پڑا، میں نے ادب و احترام کے ساتھ اس کی
زیارت کی، بغور دیکھنے سے پتہ چلا کہ قرآن شریف کا یہ نادر و نایاب قلمی نسخہ خلیفہ سوم
حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے مبارک زمانہ کی باقیات صالحات میں سے

سورہ یٰسین کا ابتدائی نمونہ

اس سے میرے دل میں عقیدت و محبت کا پاکیزہ جذبہ پیدا ہوا، اور بار بار اس کی زیارت سے اپنے عشق کی تواضع کرتا رہا، اور مجھے خیال آیا کہ میں اس مقدس مصحف کے بعض اجزاء کو شائع کروں، اس کام کا مقصد صرف اخلاص عمل اور دینی خدمت تھا، چنانچہ میں نے اس بارے میں کتب خانہ کے محافظوں سے گفتگو کی، اور ان سے سہولت چاہی، انہوں نے اس نادر و نایاب نسخہ کی نقل کی اجازت دینے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ یہ بیش بہا نسخہ باہر نہیں جا سکتا، ان کے اس ہمت شکن جواب سے میں ایک گونہ مایوس ہو گیا، مگر انسان کی خوش بختی اس کے ساتھ ہوتی ہے بالآخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور ۱۹۰۵ء میں اس صحیفہ مبارکہ سے سورۂ یٰسین شریف کا فوٹو لیا اور اس کا پورا اہتمام کیا کہ اس کا مطبوعہ نسخہ اصلی قلمی نسخہ کے عین مطابق ہو اور ہر کلمہ، ہر حرف رویت اور حیثیت کے اعتبار سے قدیم نسخہ کے مشابہ ہو، میں نے اس کام میں اخراجات سے قطع نظر دل کھول کر روپیہ صرف کیا ہے، اور اصل نسخہ کے فوٹو لینے میں بڑی فیاضی اور احتیاط سے کام لیا ہے، اس کلام پاک کا اصل نسخہ چمڑے پر خط کوفی میں لکھا ہوا ہے، پورے کلام اللہ میں ۷۰۶ صفحات ہیں، چمڑے کی دباغت عجیب و غریب طریقہ سے کی گئی ہے آج کل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام پاک اسی زمانہ میں اسی قسم کے کاغذ پر چھاپا گیا ہے، میں نے مماثلت اور مشابہت کا اس درجہ اہتمام کیا ہے کہ کاغذ سازی کے کارخانہ سے خاص طور پر فرمائش کر کے ہی چمڑے کی طرح کا کاغذ تیار کرایا ہے۔ تاکہ اصل اور نقل کے درمیان رنگ رویت اور ہیئت میں بالکل مشابہت رہے، میں نے اصل نسخہ کے طول و عرض کو بھی برقرار رکھا ہے اور سائز کے بے میل ہونے کا خیال نہیں کیا اس طرح سورۂ یٰسین شریف کا فوٹو دنیا میں پہلی بار شائع کرنے کا فخر حاصل کیا، مطبوعہ نسخہ میں رنگ اور نقش و نگار کا جو فرق اور تنوع ہے، اصل نسخہ میں بھی موجود ہے، البتہ مطبوعہ نسخہ کے کنارے کا سنہری کام اور بیل بوٹے اور جلد کے اوپر نقش و نگار میرا اضافہ ہے۔

جیسا کہ تاریخوں میں ہے خلیفہ ذی شان حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ اپنے حجرۂ

میں قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول تھے کہ آپ کی شہادت ہوگئی اور آپ کے خون کا قطرہ صحیفہ شریفہ کی آیت فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ پر پڑا، زیر بحث نسخہ وہی کلام پاک ہے، اور اس آیت شریفہ پر خون کے دھبے نظر آتے ہیں، شہادت عثمان کے اس مقدس خون کی وجہ سے یہ نسخہ شریفہ اہم ترین اسلامی آثار میں شمار ہوتا ہے، اس بنا پر ہمارا ارادہ ہے کہ کسی وقت ہم اس صفحہ کو بھی شائع کریں گے جس پر اس پاک خون کا نشان ہے۔

سورۂ یٰسین کی اشاعت کے بعد اگر ہمارے مسلمان بھائی اس کا احترام کر کے اس عاجز کی خدمت کریں گے اور معمولی مادی نفع پر اسے خرید کر ہمارے لیے مصارف کی آسانی بہم پہونچائیں گے تو ہم اس مقدس نسخہ کو بھی پوری کوشش کر کے شائع کر دیں گے،

(توضیح) اس چیز نے مجھے استعجاب وحیرت کے سمندر میں ڈال دیا کہ یہ قدیم کلام پاک خط کوفی میں تیرہ سو سال پہلے لکھا گیا ہے اس کے باوجود اس میں عجیب عجیب باریکیاں اور محاسن ہیں، جب ان صفحات کو کنارے کی طرف سے ٹیڑھا کر کے دیکھا جاتا ہے تو حروف شیشے کی طرح جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں اس کی روشنائی کی رنگت قہوہ جیسی ہے، (کتھئی رنگ کی) اس میں بہت سے صفحات کی کتابت انتہائی واضح اور روشن ہے، اس کا رنگ نہ بدلا ہے، اور نہ شکل وصورت میں کوئی فرق آیا ہے، حالانکہ ہمارے زمانہ میں جو صنعت وحرفت اور علم وفن کا زمانہ ہے، اور جس میں نقش ونگار اور رنگ وروغن نہایت پائدار اور عمدہ طور سے بنائے جاتے ہیں، اور اس زمانہ میں نہایت کاریگری سے تیار ہوا رنگ تین چار سال کے بعد بدل جاتا ہے، مگر یہ قدیم قرآن شریف اپنے رنگ وروغن کے اعتبار سے بھی بالکل اصلی حالت میں ہے، اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ یہ سورۂ یٰسین شریف ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے، عبداللہ الیاس بن احمد شاہ البورغانی القریمیؒ ساکن شہر پیٹرس برگ، حقوق طبع بحق صاحب استنساخ محفوظ ہیں۔"

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ روس کے شہر پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانہ میں

۱۹۰۵ء تک مصحف عثمانی کا وجود تھا، جس کے بارے میں یہ قیمتی معلومات ہیں، ایک مرتبہ اس مصحف شریف کا وہ حصہ جس پر خون کے دھبے ہیں فوٹو بلاک کا مطبوعہ نظر سے گزرا تھا کارڈ سائز پر تھا، غالباً یہ بھی اسی طابع دناشر عالم کی کوشش سے شائع ہوا تھا، ہوسکتا ہے کہ انقلاب روس کے بعد یہ مکمل نسخہ ڈرہام یونیورسٹی میں منتقل ہوگیا ہو، خدا کرے محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اس کی تلاش میں کامیاب ہوجائیں، اگر اس کا مکمل نسخہ روس میں ہوتا تو کمیونسٹ حکومت ضرور اس کا پروپیگنڈا کرتی، کیونکہ وہاں کے معمولی معمولی اسلامی مخطوطات کا شدومد سے پروپیگنڈا کیا جاتا ہے"۔

مختلف استدراکات جنوری ۱۹۶۱ء کے معارف میں اس مضمون کے شائع ہوتے ہی ملک کے بہت سے اہل علم و تحقیق مصحف عثمانی کے روس میں ہونے نہ ہونے کے بارے میں سوچنے لگے اور گویا اس سلسلے میں ایک نیا باب کھل گیا، اتفاق سے اسی ماہ کے رسالہ سوویٹ دیس میں جو کہ روس کے ہندوستانی سفارت خانہ کی طرف سے شائع ہوتا ہے ایک مستقل مضمون مصحف عثمانی پر شائع ہوا، جس سے معلوم ہوا کہ وہ اب تک تاشقند کے کتب خانہ میں موجود ہے، ان ہی دنوں مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی رامپوری نے مجھے لکھا کہ انہوں نے ۱۹۵۸ء میں جب روس کا سفر کیا تو وہاں اس مصحف کے بارے میں تلاش و تحقیق کی تھی۔

ان سب معلومات کو سامنے رکھ کر اپریل ۱۹۶۱ء کے معارف کے شذرات میں مصحف عثمانی پر مفصل بحث کی گئی اور لکھا گیا کہ اس مصحف کے بارے میں کئی استفسارات آئے ہیں، "اس تحریر کی ابتدا میں درج ہے کہ روس میں مصحف عثمانی کے نام سے کلام مجید کا جو نسخہ پایا جاتا ہے اس کے بارے میں اخباروں میں بھی خبریں آچکی ہیں، اور بعض مضامین بھی نکل چکے ہیں جنوری کے معارف میں بھی ایک مختصر مضمون شائع ہوا ہے، ان میں سب سے مستند اطلاع وہ ہے جو روس کے ہندوستانی سفارت خانے کے رسالہ سوویٹ دیس کے جنوری نمبر میں شائع

ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصحف کسی زمانہ میں تیمور کے کتب خانہ میں تھا، پھر یہاں سے سمرقند کی مسجدِ احرار میں منتقل ہوگیا، ۱۸۶۸ء میں جب روس نے بخارا پر قبضہ کیا تو روسی گورنر جنرل وان کاف مان ادل نے اس کو معمولی قیمت میں خرید کر سینٹ پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانے میں داخل کردیا، ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں نے اس کا مطالبہ کیا، ان کے مطالبہ پر لینن نے واپس دلادیا، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصحف اس وقت تاشقند کے کتب خانہ میں ہے، لیکن مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا بیان ہے کہ اس کی فوٹو کاپی تاشقند میں ہے، جس کو انہوں نے ۱۹۵۸ء میں سفر روس کے موقع پر خود دیکھا تھا، (معارف اپریل ۱۹۶۱ء) ان ہی دنوں ترقی پسند شاعر سردار جعفری روس گئے ہوئے تھے، اور انھوں نے ۲۸ اپریل ۱۹۶۱ء کو تاشقند میں مصحف عثمانی کی زیارت کی، جس کی تفصیل معارف (اگست ۱۹۶۱ء) میں "مصحفِ عثمانی کے متعلق ایک عینی شہادت" کے عنوان سے شائع ہوئی، ہمارے نزدیک بعض وجوہ کی بنا پر یہ بیان سب سے مفصل اور معتبر ہے، وہ لکھتے ہیں آج (۲۸ اپریل ۱۹۶۱ء) میں نے مصحف عثمانی کی زیارت کی، یہ مصحف ایک صندوق میں مقفل رہتا ہے، اور عام طور سے لوگوں کو نہیں دکھایا جاتا ہے، آج کل میوزیم بھی بند تھا لیکن ازبکستان کے دوستوں کی مہربانی سے مجھے آج اس کو دیکھنے کی اجازت مل گئی، میں اپنا کیمرہ لے گیا تھا لیکن تصویر لینے کی اجازت نہیں تھی، ہاں یہ وعدہ ضرور کیا تھا کہ وہ اس کا مائکرو فلم یا چند صفحات کی تصویریں سوویت سفارت خانے کے ذریعہ میرے پاس بھیج دی جائیں گی، یہ قرآن ۵۳ × ۶۸ سینٹی میٹر کے ۳۵۳ صفحات پر لکھا ہوا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ مکمل ہے، قرآن کا رائج نسخہ اسی بنیاد پر تیار ہوا ہے[1] نہایت نفیس اور جلی قلم سے خط کوفی میں کتابت کی گئی ہے، خون کے دھبے اب تک موجود ہیں، صفحات کا رنگ ایک طرف سے ہلکا زرد اور دوسری طرف سے سفید ہے، کیونکہ تحریر کے لیے ہرن کی کھال کا نہایت موٹا چمڑا

---

[1] یہ بات صحیح نہیں ہے کہ قرآن کا موجودہ نسخہ اسی مصحف عثمانی پر تیار ہوا ہے۔

استعمال کیا گیا ہے، میوزیم کی ڈائرکٹر انتیس تیس برس سے ایک خاتون نفیسہ صادق ہیں انھوں نے بتایا کہ صفحات اور خون کے دھبّوں کے کیمیکل امتحان سے اس کی قدامت کا صحیح اندازہ کیا گیا ہے، اس نسخے کے علاوہ خط کوفی میں ایسے ہی تین اور نسخے تھے، لیکن اب وہ نایاب ہیں، صرف چند صفحات برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہیں۔

نفیسہ صادق کے بیان کے مطابق مصحف عثمانی چودھویں پندرھویں صدی عیسوی تک سلاطین ترکی کے قبضے میں تھا، قسطنطنیہ سے تیمور لنگ اس کو سمرقند لے آیا، ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ سمرقند میں ایک شخص خواجہ احرارؒ تھا، (حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ) اس کے کچھ مرید مکہ معظمہ سے واپس آرہے تھے، قسطنطنیہ کے دوران قیام میں ایک مرید نے وہاں کے ایک پاشا کو بیماری سے اچھا کیا، صحت یاب ہونے کے بعد پاشا نے جب اس کو منہ مانگا انعام دینا چاہا تو اس مرید نے مصحف عثمانی مانگ لیا، جو پاشا کے پاس تھا، پاشا نے تامل کیا، لیکن اس کے مصاحبوں نے رائے دی کہ وعدہ خلافی ٹھیک نہیں ہے، آپ تین دن کے لیے یہ مصحف اس شخص کو دیدیجئے اور تین دن کے بعد اس کو کچھ اچھی رقم دے کر واپس لے لیجئے گا، لیکن وہ مرید زیادہ چالاک نکلا، مصحف عثمانی کے ہاتھ آتے ہی وہ قسطنطنیہ سے روانہ ہوگیا، تین دن بعد اس کی تلاش کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ سمرقند جاچکا ہے، انیسویں صدی کے وسط میں جب ترکستان کے علاقے روسی سلطنت میں شامل کرلیے گئے تو ۱۸۶۹ء میں اسی علاقے کے گورنر کی نظر خواجہ احرار کی مسجد میں مصحف عثمانی پر پڑ گئی، اس نے مسجد کے لیے سو روبل دیئے اور مصحف عثمانی کو سینٹ پیٹرس برگ کے کتب خانے میں بھیج دیا، ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے فوراً بعد لینن نے اس کو مشرقی اقوام کے مسلمانوں کے حوالے کردیا، اس طرح یہ نسخہ لینن گراڈ سے پہلے تاتاریہ کے علاقہ میں آیا اور پھر وہاں سے تاشقند کی انقلابی سوویت کے پاس پہنچا، اور اب ازبکستان کی راجدھانی تاشقند کے تاریخی میوزیم میں محفوظ ہے۔

(۱۴)

قاضی رشید بن زبیر غسّانی کی

کتاب الذخائر والتحف

معارف اپریل اور مئی ۱۹۶۰ء میں راقم الحروف کا ایک مقالہ بعنوان "ہند و عرب کے قدیم علمی اور ثقافتی تعلقات" شائع ہوا تھا جو قاضی رشید بن زبیر کی کتاب الذخائر والتحف سے ماخوذ تھا، اور اس کتاب کو محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس) نے ایڈٹ کیا تھا، یہ مقالہ پڑھ کر ڈاکٹر صاحب نے جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب ایڈیٹر معارف کو ایک خط لکھا جو معارف دسمبر ۱۹۶۰ء میں ایڈیٹر صاحب کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا اور اسی نمبر میں اس خط کے معًا بعد میرا مضمون "قاضی رشید بن زبیر غسانی اسوانی مصری متوفی محرم ۵۶۳ھ" میں شائع ہوا۔ اسکے بعد معارف فروری ۱۹۶۱ء میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کا ایک محاکمہ بعنوان "الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟" چھپا، ہم بالترتیب اڈیٹر معارف کا نوٹ، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا مکتوب، اپنا مقالہ اور مولانا کا محاکمہ درج کرتے ہیں، اہل علم و تحقیق اس دلچسپ بحث سے فائدہ اٹھائیں۔

مکتوب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس)

"ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس خط میں قاضی رشید کے بارے میں جس التباس کا اظہار کیا ہے اور اس کی تحقیق کی جانب قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کو توجہ دلائی ہے، اتفاق سے قاضی صاحب اس خط کی اشاعت سے پہلے ہی اس کے متعلق اپنی تحقیق لکھ چکے تھے، جس کو اس خط کے ساتھ ہی اس نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔" "م"

مخدوم و محترم، سلام مسنون، رسالہ معارف جلد ۸۵ میں فاضل محترم اطہر مبارک پوری

نے مسلسل دو قسطوں میں "عرب وہند کے قدیم علمی و ثقافتی تعلقات" کے عنوان سے جدید دریافت وشائع شدہ نادر کتاب الذخائر والتحف للقاضی الرشید بن الزبیر پر تبصرہ فرمایا اور اقتباسات کا ترجمہ کیا، فاضل مقالہ نگار کی دو چیزوں پر کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، وہ لکھتے ہیں کہ القاضی الرشید نامعروف نہیں ہے بلکہ محترم پروفیسر عبدالعزیز میمنی صاحب نے اس کا حال کئی کتابوں میں پایا ہے، قصہ یہ ہے کہ ابن خلکان اور یاقوت نے جس القاضی الرشید کا ذکر کیا ہے، اس کی وفات ۵۶۱ھ یا ۵۶۲ھ میں ہوئی ہے، اور ہماری کتاب کی اندرونی شہادت یہ ہے کہ اس کا مولف اس سے تقریباً ایک صدی قبل فوت ہوچکا ہے۔ ابن خلکان میں القاضی الرشید القاضی الرشید بن القاضی رشید کا ذکر ہے، میرا گمان ہے کہ ہماری کتاب پوتے کی نہیں بلکہ دادا کی ہے (لیکن دادا کے حالات نہیں ملتے) کتاب میں میرے دیباچے کے الفاظ کا یہی منشا ہے[1]

اسی طرح وہ راجہ دھمی یا رہمی پر قطعی فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اسے کیا پڑھنا چاہئے اور وہ کون ہے، میں نے بہ کثرت تحقیقی مقالوں کے حوالے دیئے ہیں کہ وہ فضلاء بھی کسی نتیجے پر نہیں پہونچ سکے اور نہیں بتا سکے کہ اس معرب لفظ کی اصل کیا ہے اور اس کا کس تاریخی شخص پر اطلاق ہونا چاہیئے، اگر محترم مبارک پوری صاحب ان سارے مقالوں کو پڑھ اور ان کے دلائل کی تنقید کرکے کوئی فیصلہ صادر فرمائیں تو علم کی بڑی خدمت ہوگی، اور ایک دیرینہ بحث ختم ہوسکے گی، ظاہر ہے کہ محض دعوٰی کافی نہیں، دلائل کی ضرورت ہے۔

(نیاز مند محمد حمید اللہ اتوار ۱۲ ربیع الانور ۱۳۸۰ھ پارس)

یہ مکتوب معارف مذکور کے صفحہ ۴۴۹ اور ۴۵۰ پر شائع ہوا اور اسی کے بعد معاً صفحہ ۱ سے راقم کا مندرجہ ذیل مقالہ شائع ہوا ملاحظہ ہو۔

---

[1] "ہند وعرب کے قدیم علمی و ثقافتی تعلقات" اور "راجہ رہمی اور ہندوستان کے دوسرے راجے" یہ دونوں مقالے میری کتاب "اسلامی ہند کی عظمت رفتہ" میں شائع ہوچکے ہیں۔

قاضی رشید بن زبیر غسانی اسوانی مصری متوفی محرم ۵۶۳ھ

اپریل اور مئی ۱۹۶۰ء کے معارف میں راقم الحروف کا ایک مقالہ بعنوان "ہند و عرب کے قدیم علمی و ثقافتی تعلقات" شائع ہوا تھا، جو قاضی رشید بن زبیر کی کتاب الذخائر والتحف سے ماخوذ تھا، اس کے شروع میں ہم نے لکھا تھا:۔

"اور چونکہ ڈاکٹر (حمید اللہ صاحب حیدر آبادی فرانساوی) صاحب کو ان کا مفصل تذکرہ کہیں نہیں مل سکا اس لیے کتاب الذخائر والتحف کے مختلف مقامات سے مصنف کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے، جو نہایت مختصر اور نا مکمل ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر لکھا ہے:۔ واما القاضی الرشید (او المھذب) ابو الحسین احمد بن رشید بن القاضی الزبیر المذکور عند الغزولی والمقریزی فلم نعثر علی ترجمتہ فی الکتب لمتداولۃ ولکن الشھادۃ الداخلیۃ تخبرنا عن عصرہ وبعض احوالہ۔

اس کے بعد موصوف نے کتاب الذخائر والتحف سے چند عبارتیں نقل کی ہیں، اور ان سے نتیجہ نکالا ہے کہ قاضی رشید بن زبیر پانچویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔

نیز ڈاکٹر صاحب نے مقریزی کی کتاب الخطط کی ایک عبارت عن القاضی المھذب ابن الزبیر کو نقل کر کے لکھا ہے:۔ وفی رأینا ان کلمۃ المھذب فی ذکر القاضی المھذب ابن الزبیر صفۃ ولیس العلم (ص۱۲) اس طرح ڈاکٹر صاحب نے قاضی رشید بن زبیر اور قاضی مہذب بن زبیر کو ایک ہی شخص مانا ہے، جیسا کہ ان کی اوپر کی عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے، حالانکہ قاضی رشید بن زبیر متوفی محرم ۵۶۳ھ چھٹی صدی ہجری میں گزرے ہیں اور قاضی مہذب بن زبیر ان کے حقیقی بھائی ہیں۔

علامہ ابن خلکان نے ان دونوں بھائیوں کا تذکرہ وفیات الاعیان میں کیا ہے اور قاضی رشید بن زبیر کے تفصیلی ذکر میں ان کے بھائی قاضی مہذب بن زبیر کا ضمنی تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ قاضی رشید بن زبیر کا تذکرہ مشہور محدث حافظ ابو طاہر سلفی نے

اپنی بعض تعلیقات میں اور کاتب عماد نے کتاب السیل اور ذیل میں کیا ہے،
"قاضی رشید کے یہ دونوں سوانح نگار ان کے ہمعصر اور ان کی وفات کے بعد ان کی
وفات ہوئی ہے۔
حافظ ابو طاہر سلفی (صدر الدین احمد بن محمد بن احمد بن محمد بن ابراہیم سلیفہ) اصفہانی
شافعی مشہور حافظ حدیث ہیں، ذیقعدہ ۵۱۱ھ میں ثغر اسکندریہ گئے اور وہاں اقامت
اختیار کی، دور دور سے لوگ ان کے پاس آکر حدیث کا سماع کرتے تھے، ان کے امالی اور تعلیقات
بہت مشہور ہیں، جن میں انھوں نے قاضی رشید بن زبیر کا بھی تذکرہ کیا ہے، اصفہان میں ۴۷۲ھ
میں پیدا ہوئے اور ثغر اسکندریہ میں ۵ ربیع الآخر ۵۷۶ھ میں وفات پائی[1] ان کے معاصر
قاضی رشید بن زبیر ۵۶۳ھ میں مصر میں فوت ہوئے اور ۵۵۹ھ میں ثغر اسکندریہ میں
دواوین سلطانیہ کے نگراں مقرر کیے گئے تھے، جیسا کہ آئندہ حافظ سلفی کے بیان سے
معلوم ہوگا۔
اور عماد الدین الکاتب نے (محمد بن صفی الدین ابو الفرج محمد بن نفیس الدین ابو ال
حامد بن محمد بن عبد اللہ) بغداد کے مدرسۂ نظامیہ میں فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی، خلافیات
اور ادبی علوم و فنون میں یکتا، شاعری، اور انشاء پردازی میں یگانہ تھے، سلطان نور الدین
زنگی کے دربار سے متوسل ہو گئے، اور سلطان صلاح الدین اور امیر شیر کوہ کے ساتھ اس
دور کے انقلابات میں حصہ لیا، اسی زمانہ میں مصر میں قاضی رشید بن زبیر بھی تھے
عماد الدین نے ابو المعالی سعد بن علی قذانی خطیری کی کتاب زینۃ دمیۃ الدہر کا ایک
ذیل خریدۃ القصر و جریدۃ العصر کے نام سے لکھا ہے اسی ذیل میں قاضی رشید بن زبیر کا
تذکرہ کیا ہے، ان کی ولادت ۵۱۹ھ میں اصفہان میں اور وفات رمضان ۵۹۷ھ میں
میں ہوئی ہے[2]

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲ ملاحظہ ہو۔ [2] تفصیل کے لیے ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۸۸ تا ۱۹۱ ملاحظہ ہو۔

قاضی رشید بن زبیر کے ان دونوں معاصروں نے ان کا اور ان کے بھائی قاضی مہذب بن زبیر کا تذکرہ کیا ہے اور ان ہی دونوں کے حوالے سے علامہ ابن خلکان نے نقل کیا ہے؛ قاضی رشید کا نام احمد ہے، مگر ان کے دادا کے وقت سے نام کے ساتھ رشید کی صفت ملتی ہے، چنانچہ بیٹا باپ اور دادا تینوں قاضی اور رشید کے لقب سے مشہور ہوئے، چھٹی پشت میں زبیر نامی اُن کے مورثِ اعلیٰ ہیں، نسلی تعلق قبیلہ غسّان سے اور وطن مصر کا مشہور شہر اسوان تھا، ڈاکٹر صاحب نے ان کا مسقط الرس کرمان بتایا ہے، حالانکہ کرمان سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ابن خلکان نے اُن کے ترجمہ میں جو ابتدائی عبارت لکھی ہے اس سے یہ تمام باتیں معلوم ہوجاتی ہیں، وہ لکھتے ہیں۔ القاضی الرشید ابوالحسین احمد بن القاضی الرشید ابی الحسن علی بن القاضی الرشید ابی اسحاق ابراھیم بن محمد بن الحسین بن الزبیر الغسانی الاسوانی[1]

پھر لکھتے ہیں:۔

کان من اھل الفضل والنباھۃ	قاضی رشید فضل و شرافت اور عزت و شہرت
والریاسۃ، صنف کتاب الجنان	کے مالک تھے، انہوں نے کتاب الجنان و
ودیاض الاذھان، وذکر فیہ	ریاض الاذہان نامی کتاب لکھی ہے جس
جماعۃ من مشاھیر الفضلاء	میں مشاہیر فضلاء کے حالات لکھے، اور
ولہ دیوان شعر۔	اس کے اشعار کا ایک دیوان بھی ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ ان کے بھائی قاضی مہذب ابومحمد حسن کا بھی شعروں کا ایک دیوان ہے، دونوں بھائی نظم و نثر میں طرزِ خاص کے مالک تھے، پھر قاضی مہذب کے ایک قصیدہ کے اشعار اور دوسرے قصیدہ کا ایک شعر نقل کرکے لکھا ہے کہ ان کے تمام اشعار اچھے ہیں انھوں نے سب سے پہلا شعر ۵۲۶ھ میں کہا، عماد کاتب نے ان کا تذکرہ کتاب السیل

[1] ابن خلکان جلد اول ص ۵۳ طبع ایران قدیم،

اور اپنے ذیل میں کیا ہے، یہ اپنے بھائی رشید سے زیادہ بلند پایہ شاعر ہیں اور رشید ان کے مقابلہ میں تمام علوم کے عالم ہیں۔

قاضی مہذب قاہرہ میں جب ۵۶۱ھ میں فوت ہوئے، یعنی قاضی رشید سے تقریباً دو سال پہلے ان کے بھائی قاضی مہذب کا انتقال ہوا، اس کے بعد ابن خلکان لکھتے ہیں کہ قاضی رشید کا تذکرہ حافظ ابو طاہر سلفی نے اپنے بعض تعلیقات میں کیا ہے، اور لکھا ہے کہ قاضی رشید اپنے منشا اور پسند کے خلاف ۵۵۹ھ میں ثغر اسکندریہ میں شاہی دفاتر کے نگراں مقرر کئے گئے، اور محرم ۵۶۳ھ میں ظلم و زیادتی سے قتل کر دئے گئے۔

پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ حافظ ابو طاہر سلفی ذیقعدہ ۵۱۱ھ میں ثغر اسکندریہ گئے اور مدت العمر وہیں رہ کر ربیع الآخر ۵۷۶ھ میں فوت ہوئے، اس سے معلوم ہوا کہ قاضی رشید کے ثغر اسکندریہ میں شاہی دفاتر کے نگراں بنائے جانے کا واقعہ حافظ سلفی کی موجودگی میں ہوا، اس لیے یہ شاہد عینی کی شہادت ہے۔

آگے چل کر علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ عماد نے بھی قاضی رشید کا ذکر کتاب السیل علی الذیل اور خریدہ کے ذیل میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

الخضم الزاخر والبحر العباب ذکرته فی الخریدة واخاه المهذب قتله شاور ظلما لمیله الی اسد الدین شیرکوه فی سنة ثلاث وستین و خمسمائة ۔ کان اسود الجلد، سید البلد، اوحد عصره فی علم الهندسة والریاضیات والعلوم الشرعیات و الآداب الشعریات ۔	یہ علم کا بحر بے پایاں تھے، میں نے ان کا اور ان کے بھائی مہذب کا ذکر اپنی کتاب خریدہ میں کیا ہے، ان کو شاور نے ۵۶۳ھ میں اس لیے قتل کیا ہے کہ یہ اسد الدین شیرکوہ کے خیر خواہ تھے رنگ سیاہ تھا، شہر اسوان میں سرداری کا درجہ حاصل تھا، ہندسہ ریاضی اور شرعی علوم وآداب میں اپنے زمانہ میں یکتا تھے۔

اس کے بعد عماد نے امیر عضد الدین ابوالفوارس مرہف بن اسامہ کی روایت سے قاضی رشید کے پانچ اشعار نقل کئے ہیں۔

پھر عماد کاتب کی کتاب الخریدہ سے شاور کے بارہ میں ان کے دو اوزین دوسرے اشعار نقل کیے ہیں، عماد سے محدث علیمی یمنی نے بغداد میں ۵۵۱ھ میں بیان کیا تھا کہ قاضی رشید نے اپنے یہ اشعار مجھے سنائے تھے، اور ابن جلیس بن حباب کے تین اشعار درج کیے ہیں جو اس نے قاضی رشید کے پاس لکھ بھیجے تھے، پھر چند اشعار ابوالفتح محمود کاتب کے درج کئے ہیں، جن میں قاضی رشید کے سیاہ رنگ کا مذاق اڑایا گیا تھا،

قاضی رشید ایک مرتبہ شاہی نما بندہ کی حیثیت سے یمن گئے اور وہاں حکمرانوں کی مدح میں اشعار کہے تھے چنانچہ علی بن حاتم ہمدانی کی توصیف میں یہ اشعار تھے:۔

لئن اجدبت ارض السعید واقحطوا   فلست انال القحط فی ارض قحطان

سرزمین مصر اور وہاں کے لوگ قحط میں مبتلا ہو گئے تو مجھے یہاں قحطان کی سرزمین میں قحط کی پروا نہیں ہے

ومن کفلت لی بمآرب بمآربی   فلست علی اسوان یوما باسوان

جب سے مآرب نے میری ضروریات کی کفالت کر لی مجھے ایک دن بھی اسوان کا افسوس نہیں ہوا،

وان جھلت حقی زعانف جندف   فقد عرفت فضلی عطارف ھمدانی

میری قدر و منزلت کو حقیر و معمولی لوگ نہ پہچان سکے تو میرے فضل و کمال کو ہمدان کے بہادروں نے پہچانا ہے

قاضی رشید کے یہی اشعار ان کی موت کا سبب بنے،

وحمد لا الداعی فی عدن علے   عدن میں مقیم فاطمی داعی نے ان پر حسد کیا اور یہ

ذالك لکتب بالابیات الی صاحب   اشعار والی مصر کے پاس لکھ بھیجے، جو اس کی برہمی

مصر فکانت سبب الغضب علیہ   کا سبب بنے، اس نے ان کو گرفتار کر کے مصر لے

فامسکہ وانفذ لا الیھم مقیدا   کے پاس بھیج دیا، اور جو کچھ اُن کے پاس تھا،

مجردا واخذ جمیع موجودہ   سب چھین لیا، قاضی رشید ایک مدت تک

فاقام بالیمن مدۃ ثم رجع الی مصر　یمن میں مقیم رہے، پھر وہ گرفتار ہو کر مصر واپس
فقتلہ شاور کما ذکرناہ۔　ہوئے اور شاور نے ان کو قتل کر دیا۔

ابو شجاع شاور بن مجیر بن نزار مصر کا وزیر تھا، اس نے صلاح الدین ایوبی کے چچا
اسد الدین شیرکوہ سے مقابلہ کیا، جس کے نتیجہ میں ۵۶۴ھ میں مارا گیا، اور اسد الدین
کو وزیر ہوا، شاور کے قتل کے بعد مصر میں سنت کا قیام ہوا، اور ایک مدت کے بعد
بنو عباس کا خطبہ پڑھا گیا، شاور رفاطمی شیعہ تھا، اس لئے قاضی رشید اس کے مقابلہ میں
اسد الدین شیرکوہ کے طرفدار تھے، اس لیے، اُن کے قتل کا ایک سبب یہ بھی تھا، اسد الدین
شیرکوہ بڑا نیک نفس تھا، اُس نے بڑے دینی کارنامے انجام دیئے، اس کی موت کے
ایک مدت کے بعد اس کی وصیت کے مطابق اس نیک بخت کی لاش قاہرہ سے مدینہ
منورہ لے جا کر دفن کی گئی، اسے مدینۃ الرسول صلے اللہ علیہ وسلّم سے بڑا عشق تھا۔

ان تصریحات سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

۱۔ قاضی رشید پانچویں صدی ہجری میں نہیں تھے، بلکہ اُن کی وفات اُن کے
دو ثقہ اور معاصر تذکرہ نگاروں کی تصریح کے مطابق محرم ۵۶۳ھ میں ہوئی، اور
چھٹی صدی میں تھے۔

۲۔ خراسان میں فاطمیوں کے مرکزی شہر کرمان سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا
وہ کبھی کرمان آئے بلکہ مصر کے شہر اُسوان کے رہنے والے تھے، جو اس زمانہ میں معمولی شہر تھا
جو آج کل اسوان بند کی وجہ سے عالمی شہرت رکھتا ہے۔

۳۔ ان کی شیعیت کے بارے میں ان کے معاصر تذکرہ نگاروں نے کوئی تصریح نہیں
بلکہ ان کی تحریروں اور اسد الدین شیرکوہ کی طرف قاضی رشید کے میلان سے جس کی پاداش
میں وہ قتل کیے گیے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنی تھے، اگر وہ شیعہ ہوتے، تو حافظ حدیث
ضرور ظاہر کرتے، یا اُس کی طرف اشارہ کرتے۔

۴۔ مہذب بن زبیر قاضی رشید بن زبیر کے حقیقی بھائی ہیں، اور مہذب کا لفظ قاضی رشید کی صفت نہیں ہے،

۵۔ اب جب کہ قاضی رشید کا تذکرہ اُن کے دو معاصر ثقہ راویوں کے ذریعہ مل گیا، اور ان کی تصریح سے معلوم ہو گیا کہ وہ محرم ۵۶۳ھ میں فوت ہوئے، تو محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے کتاب الذخائر کی عبارتوں سے ان کا زمانہ جو قیاس کیا تھا، وہ صحیح ثابت نہیں رہا، مثلاً۔

۱ اھدی میخائیل سنة ۴۴۴ھ مع رسول لہ ھدایا جلیلة شاھدت جمیعھا بتنیس میں ۴۴۴ھ قاضی رشید کے ان ہدایا کو دیکھنے کی تاریخ نہیں ہے، بلکہ میخائیل کے ہدایا بھیجنے کی تاریخ ہے، اسی طرح اخبرنی خطیر الملک عند ورودہ الی تنیس من الشام فی ذیقعدہ ۴۶۲ھ ان اقبال الدولة علی بن مجاھد میں ۴۶۲ھ خطیر الملک کے تنیس میں آنے کی تاریخ ہے، قاضی رشید سے واقعہ بیان کرنے کی تاریخ نہیں ہے، پھر یہ تاریخ بھی محل نظر ہے، کیونکہ یہ واقعہ قاضی رشید کے انتقال سے تقریباً ننانوے سال پہلے کا ہے، اس وقت قاضی رشید کا وجود بھی شاید نہ رہا ہو، ہو سکتا ہے کہ سنہ کی تعیین کتاب میں غلط طریقہ سے ہو گئی ہو، یا بعد میں نقل کی غلطی ہو،

اھدی الامیر ناصر الدولة ابو علی الحسن بن حمدان فی سنة ۴۶۳ الی ارمانوس متملک الروم المعروف بدیوجانس ھدایة الخ میں بھی ۴۶۳ھ ناصر الدولہ کے ہدیہ بھیجنے کی تاریخ ہے۔ وحدثنی ابو الفضل ابراھیم بن علی الکفرطابی بدمیاط عند قدومہ من قسطنطنیة فی شھور سنة ۴۶۳ھ انہ رای علی ارمانوس دیوجانس الخ میں ۴۶۳ھ ابو الفضل ابراہیم کے قسطنطنیہ سے دمیاط آنے کی تاریخ ہے، قاضی رشید سے واقعہ بیان کرنے کی تاریخ نہیں ہے۔

واعلمنی من لہ خبرة بما فی خزانة اللبودان مبلغ ما کان فیھا ..... من وقت

دخول القائد جوهر وبناء القصر من سنة ۳۵۸ھ الی هذا الوقت زائد عن مائة سنة

سے کتاب الذخائر والتحف کا سنہ تالیف تقریباً ۴۶۳ھ ثابت نہیں ہوتا، یہ درست ہے کہ

کتاب میں اس کے بعد کے واقعات نہیں ملتے؛

اس تحریر سے محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جیسے محقق پر اعتراض کرنا یا ان کی غلطی نکالنا

مقصود نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب یورپ میں رہ کر اسلام اور علوم اسلام کی جو بیش بہا خدمات

انجام دے رہے ہیں اور فرانس میں بیٹھ کر نہایت خاموشی سے جو کام کر رہے ہیں وہ تحسین و ستائش

سے مستغنی ہے، ان کے کارنامے دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ ان کی خدمت میں رہ کر خوشہ چینی کی جائے

اس لیے اس تحریر کا مقصد محض ایک علمی تحقیق ہے۔

الذخائر والتحف کس کی تصنیف ہے؟

مذکورہ بالا عنوان کے ماتحت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

اعظمی کا ایک مضمون بطور محاکمہ کے "معارف"

بابت ماہ فروری ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا جو حسب ذیل ہے "کتاب الذخائر والتحف تھوڑے دن

ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے مقدمہ کے ساتھ چھپی ہے، اور "معارف" کے دو نمبروں (اپریل

مئی ۱۹۶۰ء) میں اس پر مفصل تبصرہ قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کے قلم سے شائع ہوچکا ہے

ڈاکٹر صاحب نے اس کے مصنف القاضی الرشید بن الزبیر کی نسبت مقدمہ میں لکھا ہے

کہ ان کا حال ہم کو کسی کتاب میں نہیں ملا، مگر کتاب کی اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ

پانچویں صدی ہجری کے ایک عالم تھے، ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے

قاضی اطہر صاحب مبارکپوری نے "معارف" (دسمبر ۱۹۶۰ء) میں اپنی تحقیق یہ لکھی کہ القاضی

الرشید بن الزبیر کا تفصیلی ذکر تاریخ ابن خلکان میں موجود ہے، اور وہ پانچویں نہیں بلکہ چھٹی صدی

کے ایک جامع الفنون عالم تھے، قاضی صاحب کا یہ بیان حرف بحرف صحیح ہے اور صرف یہی نہیں

بلکہ القاضی الرشید کا تفصیلی ذکر ابن خلکان کے علاوہ یاقوت کی معجم الادباء، یافعی کی مرآۃ

الجنان، اور ابن العماد حنبلی کی شذرات الذہب وغیرہ میں موجود ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ

الذخائر والتحف ان ہی القاضی الرشید کی تصنیف ہے جن کا ذکر کتب مذکورہ بالا میں ہے' یا کسی دوسرے القاضی الرشید کی؟ قاضی اطہر صاحب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو ان ہی کی تصنیف مانتے ہیں' قاضی صاحب کے اس خیال کی کیا بنیاد ہے' اس کو انہوں نے ظاہر نہیں کیا' اور نہ اپنے خیال کی تائید میں انھوں نے کوئی دلیل پیش کی' اس کے برخلاف ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا خیال ہے کہ یہ کتاب ابن خلکان والے القاضی الرشید کی نہیں بلکہ ان کے دادا کی ہے' اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیال کی تائید میں خود اس کتاب کی اندرونی شہادتیں پیش کی ہیں۔

یہ واضح ہے اور دونوں فاضلوں کو یہ حقیقت تسلیم بھی ہے کہ القاضی الرشید باپ' بیٹے' پوتے تینوں کا لقب ہے' اس لیے جب کسی کتاب کی نسبت یہ لکھا ہوا پایا جائے کہ وہ القاضی الرشید کی ہے تو یہ تحقیق ضروری ہو جاتی ہے کہ وہ کس القاضی الرشید کی ہے' اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دیکھا جائے تذکرہ نویسوں نے کس کی تصنیفات میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے' مگر یہ طریقہ سرسری ہے' علاوہ بریں یہ ضروری بھی نہیں کہ اس کی تمام تصنیفات کا ذکر بھی موجود ہو' اس سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود کتاب کا غائر مطالعہ کر کے ٹوہ لگائی جائے کہ یہ کس کی تصنیف ہو سکتی ہے' ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے یہی کیا ہے' اور وہ ایسا کرنے پر مجبور بھی تھے' اس لیے کہ اس وقت تک ان کو کسی القاضی الرشید کا تذکرہ کتابوں میں نہ مل سکا تھا' مگر اب پھر جبکہ ایک القاضی الرشید کا تذکرہ تاریخ ابن خلکان کے حوالہ سے قاضی صاحب پیش کر چکے ہیں' ڈاکٹر صاحب اپنی اسی رائے پر قائم ہیں کہ یہ کتاب ان کی نہیں ہے' اس لیے کہ وہ چھٹی صدی کے ہیں' اور کتاب کی اندرونی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا مصنف پانچویں صدی میں تھا۔

اس بحث میں اپنی رائے ظاہر کرنے سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن تین شخصیتوں کا لقب القاضی الرشید بتایا گیا ہے' وہ تینوں معروف ہیں' ایک تو وہی ابن خلکان والے القاضی الرشید ہیں' جن کا نام احمد ہے' دوسرے ان کے والد علی ہیں' اور تیسرے ان کے

دادا ابراہیم ہیں، ان دونوں کا تذکرہ ہمارے دونوں فاضلوں کو نہیں مل سکا ہے، حالانکہ ان دونوں
کا ذکر الطالع السعید مطبوعہ مصر ۱۳۳۲ھ میں موجود ہے، علی کی نسبت یہ مذکور ہے کہ وہ فاضل
شاعر اور رئیس تھے، اور ان کی وفات ۴۲۵ھ میں ہوئی ہے، اور ابراہیم کی نسبت یہ مرقوم ہے
کہ وہ ۴۷۲ھ میں بفلاع قوص کے حاکم تھے، رشید و مہذب ان کے پوتے تھے، ان کی وفات پر
ابن النضر نے مرثیہ لکھا ہے، ابن النضر کا وہ قصیدہ مشہور ہے، اس تفصیل سے یہ بات واضح
ہوگئی کہ احمد اور علی کا زمانہ چھٹی صدی ہے اور ابراہیم کا زمانہ پانچویں صدی ہے۔

آیئے اب ان دلائل کا جائزہ لیجئے جن کی بنا پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے الذخائر والتحف
کی تصنیف کا زمانہ پانچویں صدی قرار دیا ہے، قاضی اطہر صاحب کے لکھنے کے مطابق ڈاکٹر صاحب
نے اپنے مدعا کے ثبوت میں الذخائر والتحف کی ایک یہ عبارت پیش کی ہے اھدی میخائیل
سنة ۴۴۴ مع رسول له هدایا جلیلة شاهدت جمیعها بتنیس اس ثبوت پر قاضی صاحب نے یہ جرح کردی
ہے کہ "اس میں قاضی رشید کے ان ہدایا کے دیکھنے کی تاریخ نہیں ہے بلکہ میخائیل کے ہدایا بھیجنے کی
تاریخ ہے" قاضی صاحب کی یہ جرح بالکل صحیح ہے، اور واقعۃً اس سے ڈاکٹر صاحب کا مدعا ثابت
نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب نے دوسری عبارت یہ پیش کی ہے اخبرنی خطیر الملک عند ورود ہ الی
تنیس من الشام فی ذیقعدة سنة ۴۶۲ ان اقبال الدولة علی بن مجاهد ا لخ۔ ا
قاضی صاحب نے یہ کلام کیا ہے کہ "اس مقام پر قاضی صاحب کے کلام کا آخری حصہ نہیں ہے، اس
کہ جب قاضی صاحب کو یہ تسلیم ہے کہ ۴۶۲ھ خطیر الملک کے تنیس آنے کی تاریخ ہے اور
رشید کا کہنا ہے کہ جب ۴۶۲ھ میں خطیر الملک تنیس آئے اسی وقت انہوں نے مجھ سے
کیا تھا، تو لازمی طور پر وہ قاضی رشید سے واقعہ بیان کرنے کی بھی تاریخ ہوئی، اس سے انکار
ہے، اس کے بعد قاضی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ "پھر یہ تاریخ بھی محل نظر ہے، ہوسکتا ہے
کی تعیین کتاب میں غلط طریقہ سے ہوگئی ہو یا بعد میں نقل کی غلطی ہو" محض اسی مفروضہ

ہے کہ الذخائر ابن خلکان والے قاضی رشید کی تصنیف ہے، لہٰذا اگر کسی دلیل سے اس مفروضہ کی صحت و واقعیت ثابت ہو تو قاضی صاحب کا یہ کلام موجّہ ہے، ورنہ بلا وجہ وجیہ تاریخ کو محل نظر اور مصنف یا ناقل کو خاطی قرار دینا بڑی زیادتی ہے،

پھر تنہا یہی ایک مثال تو نہیں ہے، آگے اور مثالیں بھی آرہی ہیں جن میں اسی طرح پانچویں صدی کے ہی سنین مذکور ہیں تو قاضی صاحب کہاں کہاں تاریخ کے غلط اندراج کا دعویٰ کرتے پھریں گے، مثلاً ڈاکٹر صاحب ایک یہ عبارت پیش کرتے ہیں۔ اھدی الامیر ناصر الدولۃ ابو علی الحسن بن حمدان فی سنۃ ۴۶۳ الی ارمانوس اور اس کے بعد یہ عبارت پیش کرتے ہیں، اخبرنی ابو الفضل ابراهیم بن علی الکفرطابی بد میاط عند ما قدم من قسطنطنیۃ فی شهور سنۃ ۴۶۳ انه رأی علی ارمانوس ــــــــ ان دونوں عبارتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ناصر الدولہ نے ۴۶۳ھ میں ارمانوس کو ہدیہ بھیجا، اور ابو الفضل ابراہیم نے اس کو ارمانوس کے جسم پر دیکھا، یہ بات خود ابو الفضل نے مصنف کتاب سے اس وقت بیان کی جب وہ ۴۶۳ھ میں قسطنطنیہ سے دمیاط آئے تھے، فرمایئے ان عبارتوں میں بھی قاضی صاحب تاریخ کے غلط اندراج کا دعویٰ کریں گے؟ اور اگر کریں گے تو یہ دعویٰ قابل قبول ہو سکے گا؟ جب کہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ ارمانوس پانچویں ہی صدی میں تھا، اور اس نے ٹھیک اسی سال ۴۶۳ھ ہی میں سلطان الپ ارسلان کے مقابلہ میں نہایت ذلت آمیز شکست کھائی تھی،[1]

قاضی صاحب نے آخری عبارت پر ریمارک کرتے ہوئے پھر غور نہیں فرمایا اور یہ لکھ دیا کہ اس میں ابو الفضل ابراہیم کے قسطنطنیہ سے دمیاط آنے کی تاریخ ہے، قاضی رشید سے واقعہ بیان کرنے کی تاریخ نہیں ہے، حالانکہ جب ۴۶۳ھ میں ابراہیم کے دمیاط آنے کی تاریخ ہے اور قاضی رشید تصریح کرتے ہیں کہ اسی موقع پر ابراہیم نے مجھ سے واقعہ بیان کیا تو لامحالہ وہ واقعہ بیان

---

[1] "ہو سکتا ہے" کے جملے سے ایک مقام پر صرف ایک "احتمال" کو ظاہر کیا گیا ہے اس سے نہ تاریخ محل نظر ہوتی ہے، نہ مصنف یا ناقل خاطی قرار پاتا ہے نہ زیادتی ہوتی ہے، اور نہ یہی جگہ جگہ غلطی کا دعویٰ کرنا مقصود ہے،

کرنے کی بھی تاریخ ہوئی، پھر اسے بھی جانے دیجیے، یہ تو بلا اختلاف ایک تاریخی حقیقت ہے کہ
ارمانوس ۴۶۳ھ میں موجود تھا اور مصنّفِ ذخائر تصریح کرتا ہے کہ ابوالفضل ابراہیم نے
ارمانوس کو دیکھا ہے، پس وہ اس کے معاصر ہیں، اور ان کا زمانہ بھی پانچویں صدی ہے، پھر
مصنّف ذخائر کا بیان بھی ہے کہ ابوالفضل نے مجھ سے فلاں واقعہ بیان کیا، لہٰذا مصنّف
ذخائر خود اپنے بیان کی رو سے ابوالفضل کا معاصر ثابت ہوا، اور محقق ہو گیا کہ اس کا زمانہ
پانچویں صدی تھا۔

اسی طرح جب خزانۃ النبود والاقصر تاریخی شہادتوں کی رو سے ۴۵۰ھ میں تعمیر ہوا
ہے، اور مصنّف ذخائر یہ اظہار کرتا ہے کہ اس وقت (ذخائر کی تصنیف کے وقت) تک اس
کی تعمیر کو سو برس سے زائد ہو چکے ہیں تو اس سے لازمی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس کی تالیف
۵۵۰ھ کے کچھ بعد ہوئی ہے، اور جب یہ بات ہے تو ضروری ہے کہ اس کا مصنّف پانچویں
صدی کے درمیان میں ہو، اور ابن خلکان والا قاضی رشید پانچویں صدی کے بجائے
چھٹی صدی کا فاضل ہے، اسی طرح اس کے باپ علی بن ابراہیم کا شمار بھی چھٹی صدی ہی کے فضلا
میں ہے، اور ہر چند کہ وہ پانچویں صدی میں بھی موجود رہا ہوگا لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں
ہے کہ ۵۵۰ھ کے لگ بھگ اس کی عمر تصنیف و تالیف کی عمر ہو۔ ہاں ابن خلکان والے
قاضی رشید کا دادا ابراہیم چونکہ ۴۷۰ھ میں ولایت قوص کا حاکم تھا اس لیے ۵۵۰ھ میں
اس کی عمر تصنیف و تالیف کی عمر ہو سکتی ہے۔

بہرحال ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد ہمارے نزدیک ان
ہی کی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے، اور ہمارا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ الذخائر والتحف
والے القاضی الرشید کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے دادا القاضی الرشید ابراہیم
کی تصنیف ہے، اور ہر چند کہ کسی مصنّف کی یہ تصریح کہ الذخائر القاضی الرشید کی تصنیف ہے
ہمارے سامنے موجود نہیں ہے، تاہم کتاب کی اندرونی شہادتوں سے کسی دوسرے قاضی رشید

کو اس کا مصنف قرار دینا ممکن نہیں ہے' پھر یہ بات مشترک الورود ہے' اس لیے کہ مصنف نے القاضی الرشید احمد کی تالیفات میں الذخائر والتحف کا نام نہیں لیا ہے' ۔۔۔۔

۔ ۔

۔۔۔۔ ہمارے علم میں ان کی تالیفات کی سب سے زیادہ تفصیل یاقوت نے دی ہے' مگر یاقوت نے بھی اس کا نام نہیں لیا ہے' ہاں یاقوت کے یہاں احمد کی تالیفات میں ایک کتاب کا نام "الہدایا والطرف" ضرور پایا جاتا ہے جو نام سے الذخائر والتحف ہی کے قسم کی کوئی کتاب معلوم ہوتی ہے' مگر قطعی طور سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ الذخائر والتحف ہی ہے' یاقوت یا قوت کے کسی پیشرو نے غلطی سے اس کا نام الہدایا والطرف ذکر کر دیا ہے[1] اس لیے اس قطعی فیصلہ سے مطبوعہ الذخائر والتحف کی اندرونی شہادتیں مانع ہیں' نیز ہو سکتا ہے کہ دادا کی تقلید میں پوتے نے بھی اسی موضوع پر کچھ زیادہ شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہو' اور مزید اضافے کئے ہوں۔

یہ بحث تو ختم ہو گئی مگر اس ضمن میں دو تین باتیں اور ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے' انشاء اللہ خالی از فائدہ نہ ہوں گی'

۱۔ القاضی الرشید احمد کے دادا القاضی الرشید ابراہیم بھی قضاء حکومت کے ساتھ اہل علم و فضل کی نگاہوں میں بہت معزز و محترم تھے' چنانچہ ان کی وفات پر قاضی ابوالحسن بن النضر نے جو نہ صرف ادیب بلکہ عالم و فقیہ بھی تھے ایک زوردار مرثیہ لکھا تھا'

۲۔ قاضی اطہر صاحب نے القاضی الرشید کا نسبی تعلق قبیلہ غسان سے بتایا ہے' اور کچھ شبہ نہیں کہ یاقوت (المتوفی ۶۲۶ھ) اور ابن خلکان (المتوفی ۶۸۱ھ) اور یافعی (المتوفی

---

[1] ہمارا اصرار یہ نہیں ہے کہ ابن خلکان والے قاضی رشید ہی کی کتاب الذخائر والتحف ہے مگر ان تینوں قاضی رشید میں اس کی ایک کتاب الہدایا والطرف کا نام بتا رہا ہے کہ یہ یا اسی قسم کی کوئی کتاب اسکی تصنیفات میں ہے' مگر مولانا نے اسے یاقوت یا اس سے بیشتر کسی تذکرہ نگار کی غلطی قرار دے دیا۔

۷۶۵ھ) نے ان کو الغسانی کی نسبت کے ساتھ ذکر کیا ہے، مگر جعفر بن ثعلب ادفوی (المتوفی ۷۴۸ھ) نے جو خود علاقہ اسوان کے باشندے تھے، القاضی الرشید اور ان کے لڑکے ابراہیم بن احمد کو قرشی اسدی لکھا ہے، اور اس نسبت سے متبادر ہوتا ہے کہ القاضی الرشید اور ان کے اسلاف کو ابن الزبیر اس لیے کہتے تھے کہ وہ لوگ حضرت زبیر بن العوامؓ قرشی اسدی کی اولاد سے تھے، اور قاضی رشید کے سلسلۂ نسب میں جن زبیر کا ذکر ہے وہ حضرت زبیر بن العوامؓ ہیں، اور وہ القاضی الرشید کی چھٹی پشت میں نہیں ہیں جیسا کہ قاضی اطہر صاحب نے لکھا ہے بلکہ اور اوپر ہیں جیسا کہ القاضی الرشید کے بیٹے ابراہیم کے سلسلہ نسب سے ظاہر ہوتا ہے، جو بروایت ادفوی حسب ذیل ہے ابراہیم بن احمد بن علی بن ابراہیم بن محمد بن الحسین بن محمد بن فلیتہ بن سعید بن ابراہیم بن حسین القرشی الاسدی، دیکھیے اس میں القاضی الرشید احمد کی چھٹی پشت میں فلیتہ کا نام ہے، بہرحال یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اگر القاضی الرشید قرشی اسدی ہیں تو یاقوت وغیرہ مورخین نے ان کو الغسانی کیونکر لکھ دیا، اور اگر وہ غسانی ہیں تو ادفوی نے قرشی اسدی کس بنیاد پر لکھا ہے

(۳) قاضی اطہر صاحب کی یہ تحقیق حرف بحرف درست ہے کہ القاضی المہذب اور القاضی الرشید ایک نہیں ہیں جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے، بلکہ دو شخص ہیں، اور دونوں باہم حقیقی بھائی ہیں، قاضی اطہر صاحب نے اپنے مضمون میں قاضی مہذب کے ضمنی تذکرہ پر اکتفا کیا ہے، اس لیے عرض کیا جاتا ہے کہ القاضی المہذّب کا مستقل تفصیلی تذکرہ یاقوت نے معجم الادبا ج ۹ ص ۹۷، اور ادفوی نے الطالع السعید اور یافعی نے مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۳۶۳ اور ابن العماد حنبلی نے شذرات الذہب ج ۴ ص ۱۹۷ میں لکھا ہے۔

(۴) مشہور و معروف کاتب ابن العماد اصفہانی شعبان ۵۶۲ھ میں وارد دمشق ہوئے ہیں، اس کے بعد قاضی رشید صرف چار مہینے زندہ رہے، اس لیے یہ تو صحیح ہے کہ قاضی رشید کی حیات میں ابن العماد دمشق پہنچ گئے تھے لیکن رشید کی زندگی میں ابن العماد کا نورالدین زنگی کے دربار سے متوسل ہونا محقق نہیں ہے، اور سلطان

صلاح الدین کے ساتھ اس دور کے انقلابات میں ابن العماد کا حصہ لینا تو یقینی طور پر قاضی رشید کی وفات کے بعد ۵۶۳ھ کا قصہ ہے؛

(۵) ابو المعالی سعد بن علی بغدادی خطیری کی کتاب کا نام معارف (دسمبر ۱۹۶۰ء) میں غلط چھپ گیا ہے، اس کا صحیح اور پورا نام زینۃ الدہر وعصرۃ اہل العصر ہے اور وہ باخرزی کی کتاب "دمیۃ القصر" کا ذیل ہے، اور باخرزی کی یہ کتاب ثعالبی کی "یتیمۃ الدہر" کا ذیل ہے۔ ابن العماد کاتب نے خطیری کی کتاب زینۃ الدہر کا ذیل خریدۃ العصر کے نام سے لکھا ہے، پھر خود ہی اپنی کتاب خریدہ کا ایک ذیل لکھا ہے، اسی کا نام کتاب السیل علی الذیل ہے، ابن العماد نے قاضی رشید کا ذکر کتاب السیل اور ذیل یعنی خریدۃ العصر دونوں میں کیا ہے، یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کتاب السیل اور خریدہ کے ذیل میں ذکر کیا ہے، اس لیے کہ خریدہ کا ذیل تو خود کتاب السیل ہے[1]

یہ چند سطریں صرف علم کی خدمت کے لیے لکھی گئی ہیں، کسی پر اعتراض یا تنقیص مقصود نہیں ہے، بالخصوص فاضل عزیز قاضی اطہر صاحب مبارک پوری سے میرے تعلقات کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ میرے معروضات کو ان پر اعتراض کی حیثیت دی جا سکے، مجھے جو بات صحیح سمجھ میں آئی اس کے اظہار میں محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے بھی میں معذرت خواہ ہوں۔

---

[1] یعنی "کتاب السیل اور خریدہ کے ذیل" میں "اور" زائد ہو گیا ہے اور صحیح "کتاب السیل خریدہ کے ذیل" ہونا چاہیئے، عماد اصفہانی کی اسی کتاب کے بعض اجزاء مثلاً قسم شعراء المغرب وغیرہ چھپے ہیں، ان میں کتاب کا نام "خریدۃ القصر وجریدۃ العصر" درج ہے۔

(۱۵)

ابن الانباریؒ کی کتاب الاضداد فی اللغۃ

عرب ممالک میں آزادی کی رو کے ساتھ ساتھ علمی و تحقیقی کاموں کا ذوق بھی ابھر رہا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ ذوق بڑی بڑی حکومتوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی امارتوں تک میں پھیل گیا ہے، چنانچہ گذشتہ سال خلیج فارس کی مشہور عرب امارت کویت میں اس کام کے لیے شیخ کویت الشیخ عبد اللہ السالم ال الصباح کی طرف سے ایک بہت بڑا مطبع قائم ہوا ہے یہاں سے نہایت قیمتی کتابیں جدید اسلوب میں شائع ہو رہی ہیں اور صرف ایک سال کی مدت قلیل میں ماہوار مجلہ العربی کے علاوہ تین اہم کتابیں یہاں سے شائع ہو چکی ہیں پہلی کتاب الذخائر والتحف قاضی رشید بن زبیر کی ہے (ابو الحسین احمد بن قاضی رشید ابو الحسن علی بن قاضی رشید ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن حسین بن زبیر غسانی اسوانی مصری متوفی ۵۶۳ھ) اس کتاب کا تفصیلی تعارف ہم کرا چکے ہیں۔

دوسری کتاب الاضداد فی اللغۃ امام ابوبکر ابن الانباری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ اس کتاب کا تعارف کرانے سے پہلے مناسب ہے کہ امام ابن الانباری کا مختصر طور سے تعارف کرایا جائے۔

امام ابوبکر محمد بن قاسم انباریؒ

امام ابوبکر محمد بن قاسم بن محمد بن بشار بن حسن بن بیان بن سماعہ بن فروہ بن قطن بن دعامہ انباری رحمۃ اللہ علیہ ۱۱ رجب ۲۷۱ھ کو بغداد میں پیدا ہوئے، آپ کے والد قاسم بن محمد اپنے زمانہ میں ادب و عربیت کے زبردست ماہر اور یکتائے فن تھے۔ ابوبکر محمد ابن انباری نے اپنے والد کی گود میں پرورش پائی اور خاندان کا علمی ماحول قبول کیا، نیز اپنے زمانہ کے اساطینِ علم و فن سے تحصیلِ علم کی جن میں بـ

حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ احمد بن یحییٰ ثعلب، اسمٰعیل القاضی، احمد بن ہشیم بزار وغیرہ اور لغت، نحو، ادب، اور تفسیر میں امامت کے درجہ کو پہونچے، زبیدی نے اپنی کتاب طبقات اللغویین والنحویین میں آپ کو کوفہ کے نحویوں میں طبقہ سادسہ کے اعلام میں شمار کیا ہے اور امام ثعلب کے ارشد تلامذہ میں بتایا ہے۔ آپ کی قرآنی علوم وفنون میں مہارت کا اندازہ ابو علی قالی کے اس بیان سے ہو سکتا ہے۔

انہ کان یحفظ ثلاثمائۃ الف بیت شاھد فی القرآن، وکان یحفظ مائۃ وعشرین تفسیراً باسانیدھا۔

آپ کو تین لاکھ اشعار صرف قرآن کے شواہد پر زبانی یاد تھے اور ایک سو بیس تفسیریں مع سندوں کے زبانی یاد تھیں۔

ابن الندیم نے الفہرست میں آپ کے بارے میں لکھا ہے۔

فی نہایۃ الذکاء والفطنۃ وجودۃ القریحۃ وسرعۃ الحفظ، وکان مع ذلک ورعاً من الصالحین، لایعرف حرمۃ وزلۃ، وکان یضرب بہ المثل فی حضور البدیھۃ وسرعۃ الجواب۔

آپ تیزی ذہن، فہم وفراست، جودت طبع اور سرعت حفظ میں انتہائی مرتبہ کے مالک تھے اس کے باوجود نہایت پرہیزگار بزرگ تھے، زندگی بھر حرام یا لغزش تک کو نہیں جانا۔ بداہت اور سرعت جواب میں ان کی مثال دی جاتی تھی۔

ازہری نے اپنی کتاب التہذیب کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

کان اوحد عصرہ واعلم من شاھدت بکتاب اللہ ومعانیہ واعرابہ ومعرفۃ اختلاف اھل العلم فی مشکلہ ولہ مولفات حسان فی علم القرآن وکان صائن النفس مقدماً فی صناعتہ مع وفاء بالصدق، حافظاً حسن البیان، عذب الالفاظ، لم نر

میں نے جن علماء کو پایا ان میں ابوبکر ابن انباری قرآن کے معانی واعراب اور قرآنی مشکلات میں اہل علم کے اختلافات کے سب سے بڑے عالم اور یکتائے زمانہ تھے، قرآنی علوم میں ان کی اچھی اچھی کتابیں ہیں، آپ پرہیزگار اپنے کام میں چست، سچائی میں مشہور، حافظ شیریں بیان تھے، اب تک ہمارے سامنے عراقی وغیرہ

إلیٰ هٰذه الغایة من الناشئین بالعراق سے کوئی شخص ایسا نہیں پیدا ہوسکا ہے جو ان کا
وغیرها من یخلفه اویسد مسده۔ جانشین یا قائم مقام ہو۔

ایک مرتبہ امام ابوبکر بن انباری سے پوچھا گیا کہ آپ کو کتنی کتابیں یاد ہیں تو انھوں نے
بتایا کہ مجھے تیرہ صندوق کتابیں زبانی یاد ہیں۔

امام ابوبکر محمد بن قاسم انباری نے اپنے دور کے مطابق تعلیم کے لیے مسجدوں کو مرکز بنایا
اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو کر بہت زیادہ کتابیں لکھیں ان کا مسجد کا حلقہ بہت وسیع
ہوتا تھا اور عوام کے علاوہ بغداد کے اعیان و اشراف اور وزراء و کتاب بھی اس میں شریک
ہوتے تھے اور آپ اپنی تمام تصنیفات کو اس حلقہ میں زبانی املا کراتے تھے، ایک گوشہ میں
اُن کے والد کا حلقۂ درس ہوتا تھا اور دوسرے گوشہ میں خود بیٹھتے تھے خلیفہ راضی سے خصوصی
تعلق تھا، اس کی اولاد کو تعلیم دیتے تھے۔ ایک مرتبہ راضی نے آپ کو ایک حسین و جمیل باندی
ہدیہ میں دی جسے دیکھ کر آپ کا دل کتابوں سے ہٹ کر اس کی طرف آگیا تو آپ نے اسی وقت
خادم سے فرمایا کہ اسے واپس کردو، کیونکہ میرے نزدیک اس کی اتنی قدر و منزلت نہیں ہے کہ وہ
میرے دل کو میرے علم سے پھیر دے رجب خلیفہ راضی کو یہ خبر لگی تو اس نے کہا:۔

لا ینبغی ان یکون العلم فی قلب احد اس آدمی کے سینے میں جس قدر علم کی حلاوت اور شیرینی
احلیٰ منه فی صدر هذا الرجل۔ ہے کسی دوسرے کے دل میں نہیں ہوسکتی۔

اس علمی آن بان کے باوجود آپ نہایت متواضع بزرگ اور صالح و متورع انسان تھے
اور ساتھ ہی شاعر بھی تھے، نیز نہایت دلچسپ اور حاضر جواب ادیب تھے۔

ابن انباری عید الاضحیٰ کی رات میں ۳۲۸ھ یا ۳۲۷ھ میں فوت ہوئے۔ اس جلیل القدر
امام علم و فن کی تصنیفات کی فہرست یہ ہے:۔

(۱) غریب الحدیث، ابن ندیم اور ابن خلکان نے اس کا تذکرہ کیا ہے، ابن خلکان نے
لکھا ہے "یہ کتاب ۴۵ ہزار ورق کی ہے۔"

(۲) کتاب المذکر والمونث، ابن خلکان کا بیان ہے کہ اس موضوع پر اس کتاب سے زیادہ کامل و مکمل کتاب کسی دوسرے نے نہیں لکھی، اس کے متعدد نسخے موجود ہیں۔

(۳) رسالۃ المشکل فی معانی القرآن۔ اس کتاب میں ابن انباری نے ابن قتیبہ اور ابوحاتم رازی کا رد کیا ہے۔

(۴) ادب الکاتب۔ ابن ندیم اور یاقوت نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(۵) الامالی۔ یاقوت نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(۶) کتاب الالفات، اس کا ایک قلمی نسخہ مصر کے مکتبہ میں موجود ہے۔

(۷) ایضاح الوقف والابتداء، اس کے چند نسخے اسکندریہ، کبرپلی اور اسکوریال، اور حلب کے کتب خانوں میں موجود ہیں

(۸) الرد علی من خالف مصحف عثمان، اس کا تذکرہ یاقوت نے کیا ہے۔

(۹) الزاہر فی معانی الکلمات التی یستعملہا الناس فی صلاتہم ودعائہم وتسبیحہم، اس کا ایک نسخہ کوپریلی کے کتب خانہ میں ہے اور اس سے فوٹو کیا ہوا ایک نسخہ دار الکتب المصریہ میں ہے، زجاجی نے اس کا اختصار کیا تھا، اس اختصار کا ایک نسخہ دار الکتب المصریہ میں ہے۔

(۱۰) السبع الطوال، یاقوت نے اس کا نام شرح الجاہلیات لکھا ہے اور ابن خلکان نے کتاب الجاہلیات بتایا ہے، نیز ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ کتاب سات سو ورق میں ہے، اس کا ایک نسخہ نور عثمانیہ کے کتب خانہ میں ہے، نیز اس کا ایک مختصر نسخہ دار الکتب المصریہ میں ہے اسی شرح سے مجلۃ الشرقیات میں زہیر بن ابی سلمیٰ کا معلقہ شائع کیا جا چکا ہے۔

(۱۱) شرح المفضلیات، اسے بیروت کے عیسائیوں نے مطبع الآباء میں چھاپ کر شائع کیا ہے

(۱۲) ضمائر القرآن۔ صاحب کشف الظنون نے اس کا ذکر کیا ہے اور بدر الدین زرکشی نے برہان میں اس سے نقل کیا ہے۔

(۱۳) الکافی فی النحو، ابن خلکان اور یاقوت نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ابن خلکان نے بتایا

ہے کہ یہ کتاب تقریباً ایک ہزار اوراق میں ہے۔

(۱۴) اللامات۔ ابن ندیم اور یاقوت نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(۱۵) المجالس۔ قفطی نے اس کا ذکر کیا ہے، یاقوت نے اس کا نام المجالسات لکھا ہے۔

(۱۶) مسائل ابن شعبنوز، ابن ندیم اور یاقوت نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(۱۷) المقصور والممدود، ابن ندیم، یاقوت اور قفطی نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(۱۸) کتاب الھاآت فی کتاب اللہ عزّ وجل، ابن خلکان نے اسے کتاب الھاآت کے نام سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کتاب ایک ہزار ورق میں ہے، اس کا ایک نسخہ پیرس میں موجود ہے۔

(۱۹) کتاب الہجاء، ابن ندیم، یاقوت، اور قفطی نے اس کا ذکر کیا ہے۔

(۲۰) الواضح فی النحو، اس کا ذکر ابن ندیم اور یاقوت نے کیا ہے۔

(۲۱) کتاب الاضداد، اسی کتاب پر ہم یہ مقالہ لکھ رہے ہیں۔ ان مستقل تصنیفات کے علاوہ امام ابن انباری نے کئی شعراء کے دیوان مرتب کئے ہیں۔ ابن ندیم نے زہیر، نابغہ ذبیانی، اعشیٰ، جعدی اور راعی کے دواوین مرتب کرنے کی تصریح کی ہے۔

کتاب الاضداد فی اللغۃ

اس جلیل القدر امام کی تصنیفات کی فہرست پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اگر مسلمان ان سے کام لیتے تو عربیت اور قرآن کے بارے میں کس قدر گراں قدر خزانہ ہمارے پاس ہوتا، مگر افسوس کہ مسلمانوں کے بے شمار علمی خزانوں کی طرح امام ابن انباری کی کتابوں کا خزانہ بھی یورپ اور ایشیا کے کتب خانوں میں بند پڑا ہے اور اس کا ایک معتدبہ حصّہ اس طرح گم ہو گیا کہ ہمارے پاس ان کے نام کے سوا کچھ نہیں رہا، وہ بھی تاریخ و تذکرہ کی کتابوں کی ورق گردانی کے بعد معلوم ہوا۔

امام ابن انباری کی صرف دو کتابیں، شائع ہو سکیں اور وہ بھی غیر مسلموں کی توجہ

اور کوشش سے "شرح المفضلیات" کو بیروت کے مسیحی ادبا نے چھاپ کر شائع کیا اور الاضداد کو پہلی مرتبہ ایک مستشرق عالم نے شائع کیا۔ یہ کتاب لیون میں ۱۸۸۱ء میں نہایت تحقیق کے ساتھ مستشرق ہولشما نے شائع کی تھی، اس کے بعد ۱۳۲۵ھ میں مصر میں شائع ہوئی، اب تک یہی مصری نسخہ متداول تھا، میں نے طالب علمی کے زمانہ میں ۱۳۵۳ھ میں اسے خرید ا تھا اور میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔ اب اسی کتاب کو کویت کے سلسلہ "دائرۃ المطبوعات والنشر" نے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مصر کے ایک مشہور محقق استاذ محمد ابو الفضل ابراہیم نے تعلیق و تحشیہ اور تصحیح و تنقیح کے فرائض انجام دیئے ہیں اور اسی سال ۱۹۶۰ء میں مطبعۃ الکویت سے چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ بہترین آرٹ پیپر کے بڑے سائز پر ۴۰۲ صفحات میں یہ کتاب چھپی ہے، ہر صفحہ میں تقریباً ۲۲ سطریں ہیں۔

الاضداد فی کلام العرب کے عنوان پر اصمعی سجستانی، ابن السکیت اور صنعانی وغیرہ نے کتابیں لکھی ہیں اور ان کا مجموعہ بیروت میں ۱۹۱۳ء میں ڈاکٹر اوغسٹ ہفنر کے اہتمام سے چھپ چکا ہے، قطرب کی کتاب انگریزی مجلہ "اسلومیکا" میں ۱۹۲۱ء میں ہانس کوفلر کے زیر اہتمام شائع کی جاچکی ہے اور ابن الدہان کی کتاب کو شیخ محمد آل یسین نے نجف میں چھاپ کر ۱۹۵۲ء میں شائع کیا ہے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ امام سیوطی نے المزہر میں بتایا ہے اس موضوع پر توزی اور ابو البرکات ابن انباری کی کتابیں بھی ہیں، مگر یہ دونوں کتابیں ناپید ہیں، نیز اس موضوع پر کتاب الجمہرہ ابن درید، الغریب المصنف ابو عبید، المخصص ابن سیدہ، فقہ اللغۃ، ثعالبی اور دیوان الادب فارابی کے ابواب و فصول میں بہت سی کام کی باتیں منتشر طور سے موجود ہیں۔

مگر ان سب میں الاضداد فی اللغۃ محمد بن قاسم انباریؒ اپنے محتویات کے اعتبار سے نہایت اہم جامع اور مستند ہے، اس میں قدما کی متفرق باتیں آگئی ہیں اور علل و شواہد کا خزانہ ہے، محمد بن قاسم انباری نے بسط و تفصیل کے ساتھ ہر ایسے لفظ پر کلام کیا ہے جو متضاد

معنی کو شامل ہے، اشعارِ عرب، احادیث و آیات کے شواہد بکثرت بیان کئے ہیں۔ اس سلسلے میں اکثر مقامات پر احادیث و آیات کی بہترین تشریحات بھی آگئی ہیں۔

مصنف نے مقدمہ میں اپنی کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

وقد جمع قومٌ من اھل اللغۃ الحروف المتضادۃ، وصنفوا فی احصائھا کتباً، نظرت فیھا فوجدت کل واحدٍ منھم أتی من الحروف بجزءٍ، واسقط منھا جزءًا، واکثرھم أمسك عن الاعتلال لھا، فرأیت ان اجمعھا فی کتابنا ھذا علی حسب معرفتی ومبلغ علمی لیستغنی کاتبہ والناظر فیہ عن الکتب القدیمۃ المؤلفۃ فی مثل معناہ، اذ اشتمل علی جمیع ما فیھا ولم یعدم منہ زیادۃ الفوائد وحسن البیان واستیفاء الاحتجاج واستقصاء الشواھد۔ (ص۱۳)

نیز مصنف نے مقدمہ میں اضداد کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات درج کی ہیں، کہنا چاہئے کہ یہ مقدمہ اس کتاب کی جان ہے۔

چند مفید اقتباسات

اس کے کچھ ٹکڑے ہم افادیت کے خیال سے یہاں نقل کرتے ہیں۔ مصنف حمد و صلوٰۃ کے بعد اس سلسلہ میں معترضین کے اعتراضات اور ان کے جوابات لکھتے ہیں:۔

ولیظن اھل البدع والزیغ والازراء بالعرب، ان ذلك کان منھم لنقصان حکمتھم، وقلۃ بلاغتھم، وکثرۃ الالتباس فی محاوراتھم، وعند اتصال مخاطباتھم، فیسألون عن ذلك ویحتجون بان الاسم منبئٌ عن المعنی الذی تحتہ ودالٌ علیہ وموضح تاویلہ، فاذا اعتور اللفظۃ الواحدۃ معنیان مختلفانِ لم یعرف المخاطَب ایّھما اراد المخاطِب (ص۱) وبطل بذلك معنی تعلیق الاسم علی المسمی، فاجیبوا عن ھذا الذی ظنوہ وسألوا

عند بضروب من الاجوبة، احدهن ان کلام العرب یصحح بعضه بعضاً ویرتبط اوله بآخره، ولا یعرف معنی الخطاب منه الا باستیفائه واستکمال جمیع حروفه، فجاز وقوع اللفظة علی المعنیین المتضادین لانها یتقدمها و یاتی بعدها ما یدل علی خصوصیة احد المعنیین حروف الآخر، ولا یراد بها فی حال التکلم والاخبار الا معنی واحد۔ (ص۲)

اس کے بعد اشعار و آیات سے اس کی متعدد دلیلیں بیان کی ہیں، پھر لکھا ہے :۔

و یجری حروف الاضداد مجری الحروف التی تقطع علی (ص۳) المعانی المختلفة وان لم تکن متضادة فلا یعرف المعنی المقصود منها الا بما یتقدم الحرف و یتاخر بعده مما یوضح تاویله (ص۴)

پھر لکھا ہے۔

وهذا الضرب من الالفاظ هو القلیل الظریف فی کلام العربیة، واکثر کلامهم یاتی علی ضربین آخرین، احدهما ان یقع اللفظان المختلفان علی المعنیین المختلفین کقولك الرجل والمرأة، والجمل والناقة، والیوم واللیلة وقام و قعد وتکلم وسکت، وهذا هو الکثیر الذی (لا یحاط به) والضرب الآخر أن یقع اللفظان المختلفان علی المعنی الواحد کقولك البر والحنطة، والعیر والحمار والذئب (ص۶) والسید، وجلس وقعد، وذهب ومضی قال ابو العباس عن ابن الاعرابی کل حرفین اوقعتهما العرب علی معنی واحد، فی کل واحد منهما معنی لیس فی صاحبه ربما عرفناه فاخبرنا به، وربما غمض علینا فلم نلزم العرب جهله، وقال الاسماء کلها لعلة خصت العرب ما خصت منها من العلل ما نعلمه ومنها ما نجهله (ص۷)

اس کے بعد ابن الاعرابی کے قول کی توضیح کرتے ہوئے مصنف نے مکہ، بصرہ، کوفہ، انسان، بہیمہ کی علت بیان کی ہے، پھر لکھا ہے :۔

فان قال لنا قائل لای علۃ سمی الرجل رجلا، والمرأۃ امرأۃ والموصل موصلا

وذعد دعداً (ص) قلنا لعلل علمتھا العرب وجھلناھا، او بعضھا

فلم تزل عن العرب حکمۃ العلم بما لحقنا من غموض العلۃ وصعوبۃ

الاستخراج علینا وقال قطرب انما اوقعت العرب اللفظتین علی المعنی الواحد

علی اتساعھم فی کلامھم کما زاحفوا فی اجزاء الشعر لیدلوا علی ان الکلام واسع

عندھم وان مذاھبہ لا تضیق علیھم عند الخطاب والاطالۃ والاطناب

وقول ابن الاعرابی ھو الذی نذھب الیہ للحجۃ التی دللنا علیھا والبرھان

الذی اقمناہ فیہ، وقال آخرون: اذا وقع الحرف علی معنیین متضادین

فالاصل لمعنی واحد ثم تداخل الاثنان علی جھۃ الاتساع (ص)

اس کے بعد اس کی متعدد مثالیں بیان کی ہیں اور اشعار وآیات سے اس قول کی توثیق کی ہے۔ آگے چل کر لکھا ہے:-

وقال آخرون:- اذا وقع الحرف علی معنیین متضادین فمحال ان یکون

العربی اوقعتہ علیھا بمساواۃ منہ بینھما، ولکن احد المعنیین لحیٍ من العرب،

والمعنی الآخر لحیٍ غیرہ، ثم سمع بعضھم لغۃ بعض فاخذ ھؤلاء عن ھؤلاء

وھؤلاء عن ھؤلاء قالوا فالجون الابیض فی لغۃ حیٍ من العرب، والجون الاسود

فی لغۃ حیٍ آخر (ص) ثم اخذ احد الفریقین من الآخر کما قالت قریش حسب یحسب۔

پھر کسائی کا قول نقل کیا ہے کہ حَسِبَ عرب کی ایک قوم کا اپنا لفظ ہے اور یحسِبُ دوسرے کی زبان ہے جسے انہوں نے سُن کر استعمال کیا اور کسائی کی توثیق میں فرار کا بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اُس نے بعض عرب کو فضِل یفضُل کہتے ہوئے سنا ہے حالانکہ یفعُل فعِل کا مضارع نہیں آتا اس لیے فضِل ایک قوم کا محاورہ ہے اور یفضُل دوسری قوم کی زبان ہے جسے انھوں نے سُن کر استعمال کیا۔

ہم نے مذکورہ بالا طویل طویل عربی عبارتوں کا ترجمہ اس لیے نہیں لکھا کہ یہ خالص علمی اور فنی باتیں ہیں۔ اہل علم وفن کو ترجمہ کی ضرورت نہیں اور جن کا یہ موضوع نہیں ہے ان کے لیے ترجمہ بیکار ہے۔

امام محمد بن قاسم انباری کے نزدیک جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے حروف اضداد بہت کم ہیں۔ وھذا الضرب ھو القلیل الطریف فی کلام العرب[۲] انھوں نے اپنی کتاب میں جو ایسے حروف درج کئے ہیں اور اُن کے متضاد معنوں پر دلالت کے دلائل وسوائد اور علل قرآن و احادیث اور اشعارِ عرب سے بیان کئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

(ا) ۱۳ حروف، (ب) ۱۴، (ت) ۵، (ث) ۳، (ج) ۱۱، (ح) ۱۷، (خ) ۱۳، (د) ۹، (ذ) ۲، (ر) ۱۹، (ز) ۸، (س) ۱۸، (ش) ۱۵، (ص) ۱۱، (ض) ۷، (ط) ۹، (ظ) ۹، (ع) ۲۳، (غ) ۸، (ف) ۸، (ق) ۱۷، (ک) ۵، (ل) ۵، (م) ۸، (ن) ۱۷، (ھ) ۲، (و) ۷، (ی) ۱۔

(۱۶)

ابو احمد عسکریؒ کی کتاب المصون فی الادب

ادبی اور شعری تنقید کا ابتدائی سرمایہ عربی زبان میں تنقیدی نظریات ہمیشہ کسی نہ کسی انداز میں پائے جاتے تھے، شاعری کے ابتدائی ادوار میں بھی اس پر تنقید ہوتی تھی، اور الفاظ و معانی کے اعتبار سے کلام کے معائب و محاسن کو نمایاں کیا جاتا تھا، جاہلی دور میں عکاظ کے مشاعرے میں فن شاعری کے نکھار پر خصوصی توجہ کی جاتی تھی اور یہاں کے اچھے قصائد پورے عرب میں شہرت پاتے تھے، کہا جاتا ہے کہ معلقات وہی قصائد ہیں جو سوق عکاظ کے نقادوں کے نزدیک شعری محاسن کے حامل تھے، نیز حولیات ان قصائد کو کہتے تھے جو سال بھر میں مکمل کئے جاتے تھے اور اس مدت میں ہر زاویہ نگاہ سے شاعر خود تنقید کر کے ان کو معیاری بناتا تھا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ سوقِ عکاظ کے مشاعرے میں اعشیٰ نے اپنے اشعار سنائے پھر حسانؓ نے اپنا کلام پیش کیا جس میں یہ دو اشعار بھی تھے۔

لنا الجفنات الغرّ یلمعن بالضحیٰ ... واسیافنا یقطرن من نجدۃٍ دما

ہماری چمکدار لگنیں اور تھالیں دن چڑھے تک دھوپ میں چمکتی رہتی ہیں اور ہماری تلواریں بہادری کی وجہ سے خون ٹپکاتی رہتی ہیں

ولدنا بنی العنقاء وابنی محرقٍ ... فاکرم بنا خالا واکرم بنا ابنما

ہماری اولاد میں بنو عنقاء اور بنو محرق ہیں ہمارے ماموں کیسے مکرم و محترم ہیں اور ہمارے بیٹے کتنے معزز ہیں

صدر مجلس نابغہ ذبیانی نے جو چمڑے کے خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا ان اشعار پر تنقید کرتے ہوئے کہا

انت شاعرٌ، ولکنک اقللت جفانک و ... تم شاعر ہو، مگر تم نے اپنی لگنوں اور تلواروں کو

سیوفك وفخرت بمن ولدت، ولم کم کرکے بیان کیا اور اپنی اولاد پر فخر تو کیا مگر اپنے
تفخر بمن وَلَدَك[1] آبار واجداد پر فخر نہیں کیا"

جاہلی دور کے شعری اور ادبی تنقید کی یہ ایک مثال ہے۔ دولت کویت کے شعبہ التراث العربی کے سلسلہ دائرۃ المطبوعات والنشر کی طرف سے تیسری کتاب ابواحمد عسکری متوفی ۳۸۲ھ کی کتاب المصون فی الادب ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی ہے یہ عجیب بات ہے کہ ابواحمد عسکری کے تلمیذ خاص ابوہلال عسکری متوفی ۳۹۵ھ کی کتاب الصناعتین مدت ہوئی طبع ہو کر عام ہو چکی ہے اور اسی موضوع پر استاذ کی کتاب اب شائع ہو رہی ہے، اس مقالہ میں کتاب المصون اور اس کے مصنف کا تعارف کرانا مقصود ہے، ساتھ ہی مختصر طور سے چوتھی صدی تک عربی فن تنقید کا جائزہ لینا ہے۔ عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں بھی اس قسم کی انفرادی اور جزوی تنقیدات ادب و محاضرات کی کتابوں میں ملتی ہیں، خاص طور سے حضرت عمرؓ کی ادبی و شعری تنقیدات کی بہت سی مثالیں ابن رشیق قیروانی نے کتاب العمدہ میں درج کی ہیں۔

تیسری اور چوتھی صدی میں فنِ تنقید پر مستقل کتابیں

پہلی اور دوسری صدی تک یہ تنقیدیں زبانی ہوا کرتی تھیں، اور فن کی حیثیت سے باقاعدہ مدوّن و مرتب شکل میں نہیں پائی جاتی تھیں، مگر تیسری صدی گزرتے گزرتے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں، چنانچہ ابوعبید قاسم بن سلام متوفی ۲۲۴ھ کی طبقات الشعراء، ابوالعباس احمد بن یحییٰ ثعلب متوفی ۲۹۱ھ کی کتاب معانی الشعر، عبداللہ بن معتز متوفی ۳۱۵ھ کی کتاب الشعراء، قدامہ بن جعفر متوفی ــــھ کی کتاب نقد الشعر، ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ کی کتاب الشعر والشعراء[2] وغیرہ اس دور میں فن شاعری (صناعۃ الشعر) پر تنقید نگاری کا بہترین نمونہ ہیں اور ان میں ان تمام زبانی تنقیدات کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی جو عربی شاعری کے حسن و قبح میں وقتاً فوقتاً ائمہ فن اور ارباب ذوق کی طرف سے کی گئی ہیں، اس کے بعد چوتھی اور پانچویں

---

[1] کتاب المصون فی الادب ص۳ و ص۴، [2] ان کتابوں کے لیے کتاب الفہرست میں ان ائمہ فن کے حالات ملاحظہ ہوں

صدی میں اس موضوع پر نہایت جامع کتابیں لکھی گئیں اور تنقید کو ایک مستقل فن کی حیثیت
ان کتابوں میں بیان کیا گیا، اس دور کی تنقیدی کتابوں میں ابواحمد عسکری متوفی ۳۸۲ھ
کتاب المصون فی الادب، ان کے شاگرد رشید ابوہلال عسکری متوفی ۳۹۵ھ کی کتاب الصناعتین
اور کتاب دیوان المعانی اور ابن رشیق قیروانی متوفی ۴۵۶ھ کی کتاب العمدۃ فی محاسن الشعر
نقدہ وغیرہ بہت مشہور ہیں، کتاب العمدۃ گویا عربی شاعری کے لیے دائرۃ المعارف اور اس
سلسلہ کی قدیم کی کتابوں میں سب سے زیادہ جامع اور کامل و مکمل کتاب ہے، مذکورہ بالا کتب
میں سے اکثر و بیشتر پہلے چھپ چکی ہیں، اور اب ۱۹۶۰ء میں دولت کویت کی علمی دوستی نے
کتاب المصون کو اپنے دائرۃ المطبوعات والنشر سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے او
چونکہ راقم اس ادارہ کا شبیر علمی ہے اس لیے اس کی دیگر مطبوعات کی طرح اس کتاب کو بھی میرے
پاس بھیجا ہے، چونکہ یہ اہم کتاب پہلی بار شائع ہوئی ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اہل علم کو اس
سے اور اس کے مصنف سے واقف کرایا جائے پہلے ہم مصنف کے حالات لکھتے ہیں، اس
کے بعد کتاب اور اس کے بعض اہم مباحث و محتویات پر مفصل بحث کریں گے،

ابواحمد عسکریؒ ابواحمد حسن بن عبداللہ بن سعید بن زید بن حکیم عسکری رحمۃ اللہ علیہ علاقہ
خوزستان واہواز کے شہر عسکر مکرم کے رہنے والے تھے، جسے مکرم بن معزا
بن حارث باہلی نے آباد کیا تھا، وہیں ۲۹۳ھ میں پیدا ہوئے، ابواحمد عسکری کے مشہور شاگ
ابوہلال عسکری بھی اسی شہر کے رہنے والے تھے اور یہ عجیب بات ہے کہ استاد اور شاگرد دون
کا نام اور دونوں کے والد کا نام ایک ہی تھا، یعنی حسن بن عبداللہ، بعض کہتے ہیں کہ ابوہلا
عسکری ابواحمد عسکری کے بھانجے تھے۔

ابواحمد عسکری کی شخصیت محدثین و فقہاء اور لغویین ادباء دونوں طبقوں کے لیے
بڑی پرکشش تھی، اور وہ حدیث و عربیت دونوں کے جامع تھے، انہوں نے ایک طرف بغ
بصرہ اور اصفہان میں حدیث کی روایت امام ابوالقاسم بغوی، امام ابوداؤد سجستانی او

امام ابوجعفر بن زبیر وغیرہ سے کی تھی، تو دوسری طرف شعر و ادب میں ابوبکر محمد بن یحیی صولی، ابوبکر بن درید اور نفطویہ جیسے ائمہ علم و فن کے شاگرد تھے تحدیث و روایت کی ریاست خوزستان، واہواز کے علاقہ میں ان کی ذات پر ختم تھی، اور محدثین نے دور دراز کا سفر کر کے ان سے روایت کی، انھوں نے خود بھی عسکر مکرم، تستر اور اپنے علاقہ کے مختلف بلاد و امصار میں جا کر اپنے قدیم شیوخ کی ان احادیث کی روایت جو ان تک عالی سند سے پہونچی تھیں، ان کے حدیث کے تلامذہ میں ابو عباد الصائغ تستری، ذوالنون بن محمد، حسین بن احمد جہرمی، ابن عطار شرطی، حافظ ابونعیم اصفہانی، ابوسعد احمد بن محمد بن عبداللہ مالینی، اور ابوالحسین محمد بن حسن بن احمد اہوازی وغیرہ شامل ہیں، موخر الذکر دونوں حضرات خطیب بغدادیؒ کے شیوخ میں ہیں، ان کے علاوہ ان کے محدثین تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ادب و عربیت اور تنقید میں ان کے خاص شاگرد ابوہلال حسن بن عبداللہ بن سہل بن سعید بن یحیی متوفی ۳۹۵ھ ہیں، جنھوں نے کتاب الصناعتین اور دیوان المعانی میں ابواحمد عسکری کے تنقیدی نظریات اور اس سلسلہ میں ابوبکر صولی اور ابن درید وغیرہ کی روایات کو نقل کیا ہے۔

ابواحمد عسکری کی جلالت شان کے سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے وزیر الصاحب ابوالقاسم اسمٰعیل بن عباد متوفی ۳۸۵ھ جیسا صاحب علم و فضل اور قدر دان آدمی ابواحمد سے ملاقات کی تمنا میں بار بار خط و کتابت کرتا تھا اور ہر مرتبہ ضعیفی اور کمزوری کی وجہ سے عدم حضوری کا جواب پاتا تھا، آخر اس نے ایک بہانہ سے عسکر مکرم جا کر ابواحمد سے ملاقات کرنی چاہی اور سلطان مؤید الدولہ بن بویہ سے کہا کہ عسکر مکرم کے حالات ابتر ہو رہے ہیں۔ مجھے خود وہاں جانا چاہیے، مگر الصاحب کے عسکر مکرم پہونچنے پر بھی ابواحمد اس سے ملنے نہیں گئے، اس نے ایک خط لکھا تھا جس میں چند اشعار بھی تھے، ابواحمد نے اس کا جواب دیا اور خنساء کے بھائی صخر بن عمرو کا ایک شعر جو الصاحب کے اشعار کا ہم قافیہ تھا لکھا مگر اس کے بعد سوچا کہ اب دل پر جبر کر کے چلنا چاہیے الصاحب کو اس جواب سے تسلی نہیں ہوگی جب دربار

پہونچے تو حشم و خدم کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے الصاحب تک نہیں پہونچ سکے اور ایک بلند مقام پر کھڑے ہو کر ابوتمام کے یہ اشعار پڑھے۔

مالی اری القبۃ الفیحاء مقفلۃ دونی وقد طال ما استفتحت مقفلھا

میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے سامنے لمبا چوڑا دربار مقفل ہے حالانکہ میں بہت دیر سے اس کا قفل کھلوا رہا ہوں

کانھا جنۃ الفردوس معرضۃ ولیس لی عمل زاک فادخلھا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دربار جنت الفردوس ہے اور میرے پاس کوئی نیک عمل نہیں ہے کہ اس میں داخل ہو سکوں

ان اشعار کو سنتے ہی الصاحب نے پاس بلایا اور بڑے تزک و احترام کے ساتھ ابواحمد دربار میں لائے گئے، اس وقت الصاحب نے کوئی علمی بات دریافت کی، ابواحمد نے کہا کہ الخبیر صادفت یعنی آپ اس کے عالم کو پا گئے ہیں حالانکہ ایسے مواقع پر عرب کی مشہور مثل سقطت علی الخبیر" ہے، الصاحب نے کہا کہ ابواحمد! آپ ہر چیز میں نیا اسلوب پیدا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ عام مثل میں بھی ندرت پیدا کرتے ہیں، ابواحمد نے جواب دیا۔ تفاءلت عن السقوط بحضرۃ مولانا یعنی میں نے جناب عالی کی خدمت میں لفظ سقوط (گرنا) کے استعمال کو بدفالی سمجھ کر ترک کر دیا ہے، یہ جواب سن کر الصاحب کے نزدیک آپ کی قدر و منزلت اور زیادہ ہو گئی اور اس نے انعام اکرام سے خوب خوب نوازا بلکہ آپ اور آپکے متعلقین و متوسلین کے لیے دائمی وظیفہ مقرر کر دیا جو آپ کے انتقال تک جاری رہا اور الصاحب نے آپ کے انتقال پر یہ مرثیہ کہا۔

قالوا مضی الشیخ ابواحمد وقد رثوہ بضروب الندب

لوگوں نے کہا شیخ ابواحمد گزر گئے اور طرح طرح کے گریہ و بکا سے ان کا مرثیہ کہا

فقلت ما ذا فقد شیخ مضی لکنہ فقد فنون الادب

اور میں نے کہا کہ یہ شیخ کا اٹھ جانا نہیں ہے بلکہ ادب کے علوم و فنون کا اٹھ جانا ہے۔

ابواحمد کے تذکرہ نگاروں نے ان کی حسب ذیل تصانیف کے نام لکھے ہیں (۱) التصحیف والتحریف، یہ ان کی بہت مشہور کتاب ہے، اس کا ایک حصہ ۱۳۲۶ھ میں طبع ہوا تھا

(۲) تصحیح الوجوہ والنظائر (۳) الحکم والامثال، (۴) راحۃ الارواح، (۵) الزواجر والمواعظ، (۶) علم النظم، یاقوت نے معجم الادباء میں اور سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں اس کا نام صناعۃ الشعر بتایا ہے، (۷) مالحن فیہ الخواص من العلماء، (۸) المختلف والمؤتلف فی مشتبہ اسماء الرجال، (۹) الورقۃ، اس کا تذکرہ ان کے تلمیذ خاص ابو ہلال عسکری نے دیوان المعانی میں ایک مقام پر کیا ہے (۱۰) کتاب المنطق وغیرہ (۱۱) کتاب الاوائل، اس کا مختصر سیوطیؒ نے الوسائل کے نام سے کیا ہے۔

کتاب المصون فی الادب اس نام کے ساتھ ابو احمد کی تصنیفات میں کسی کتاب کا تذکرہ نہیں ملتا، ممکن ہے یہی کتاب النظم ہو جس کا نام یاقوت نے معجم الادباء میں اور سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں صناعۃ الشعر لکھا ہے یا اسی کتاب کا کوئی حصہ کتاب المصون کے نام سے موسوم ہو گیا ہو، اس کے شروع میں حمد وصلوۃ نہیں ہے بلکہ "باب فی نقد الشعر" سے کتاب کی ابتدا ہوتی ہے، بہرحال ابو احمد کے تلمیذ خاص ابو ہلال عسکری نے دیوان المعانی میں اس کی جو سندیں اور روایتیں اپنے استاذ کے حوالہ سے درج کی ہیں ان سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ کتاب المصون فی الادب ابو احمد عسکری کی کتاب ہے، اس زمانے میں ان کے نام سے کتابیں لکھنے کا رواج بھی تھا چنانچہ ابن ندیم نے ابو العباس ثعلب کی تصنیفات میں کتاب المصون فی النحو کا نام درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ وجعلہ حدوداً یعنی ثعلب نے اس کتاب میں علم نحو کے مسائل اور ان کی تعریف بیان کی ہے[۱]

مقدمہ نگار اور محقق کی تصریح کے مطابق دنیا میں اس کا صرف ایک نسخہ کتب خانہ اسکوریال میں نمبر ۳۷۷ کے ماتحت تھا اور مصر کے مشہور ماہر مخطوطات ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے اس کا فوٹو معہد المخطوطات مصر کے لیے حاصل کیا، اس کے پہلے صفحہ کا فوٹو کتاب میں شامل ہے جس پر پہلی سطر میں کتاب المصون فی الادب، دوسری سطر میں یشتمل علی ابواب شتیٰ من الادب،

---

[۱] کتاب الفہرست ص۱۱۱

اور تیسری سطر میں تالیف ابی احمد الحسن بن عبد اللہ بن سعید العسکری درج ہے، اور پانچ تملیکات موجود ہیں اور دو مہریں ہیں، اور نیچے من ترجمۃ النحاۃ للسیوطی یعنی بغیۃ الوعاۃ فی ترجمۃ النحاۃ سے چار سطروں میں باریک خطِ فارسی میں ابو احمد عسکری کا حال درج ہے، پوری کتاب نہایت صاف ستھرے خطِ نسخ میں لکھی گئی ہے، کاتب کا نام یا سنۂ کتابت نہیں ہے البتہ خاتمہ پر یہ عبارت ہے:۔ تم الکتاب المصون، والحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی سیدنا محمد النبی وآلہٖ وسلم کثیرا، مشہور مصری محقق عبد السلام محمد ہارون نے اس کی تصحیح وتعلیق کی ہے، اور اس سلسلہ میں وہ تمام خدمات بوجوہ احسن انجام دی ہیں جو جدید طرزِ تحقیق وتعلیق کے لیے ضروری ہیں، اور ۱۳۹ کتابوں سے کام لیا ہے، ولایتی آرٹ پیپر پر نہایت واضح اور جلی ٹائپ میں چھپی ہے، اصل کتاب ۲۲۸ صفحات میں ہے، اس کے بعد تقریباً ۵۰ صفحات میں اعلام، قبائل، امکنہ، اشعار و ارجاز اور مراجع الشرح والتحقیق کی فہارس درج ہیں۔

چند تنقیدی اصول اور مباحث

ابو احمد عسکری نے کتاب المصون کی ابتدا "باب نقد الشعر" سے کی ہے اور اس باب میں شعری تنقید شخصی ذوق اور فنی احساس دونوں چیزوں پر موقوف ہے، اور شعر گوئی اور تنقید میں کوئی مناسبت نہیں ہے، ایسا بھی ہوتا ہے اچھا شعر کہنے والا تنقید کے ذوق و معیار سے محروم ہوتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ اچھا نقّاد شعر گوئی کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس باب میں ابوبکر صولی، ابن مقفع، اور جاحظ کے تنقیدی نظریات کو پیش کرکے ان کی روشنی میں کچھ تنقیدی واقعات نقل کئے ہیں، اور گویا پورا باب ان ہی نظریات کی توضیح ہے، ان ائمہ نقد و نظر کے خیالات کو نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ تیسری صدی کے وسط میں فن تنقید مستقل فن بن گیا تھا،

قال ابوبکر: نقد الشعر وترتیب الکلام و وضعہ مواضعہ وحسن الاخذ، والاستعارۃ
ابوبکر صولی کا قول ہے کہ اشعار کی تنقید، الفاظ کی ترتیب، ان کا برمحل استعمال، حسنِ انتخاب،

...ي المستكره والجاسي صنعته براسها،
لا تراه إلا لمن صحت طباعهم، واتّقدت
قرائحهم، وتنبهت فطنهم، وراضوا الكلام
...ووا، وميّزوا، هذا شاعر حاذق مميّز
...لد، مهذب الألفاظ، مثل البحتري
ويكمل لنقد جميع الشعر، ولو أن نقد الشعر
المعرفة كان يدرك بقول الشعر، وما
...رواية لكان من يقول الشعر من العلماء
...عرض لما أشعر الناس، هذا الخليل بن
...مد وحماد الراوية وخلف والأصمعي
...ائر من يقول الشعر من العلماء ليس
...شعرهم بالجيد من شعر زمانهم، بل
يحصى كل واحد منهم خلق كثير
...ن لجماعتهم علم واحد من هؤلاء،
...لهم أجود شعراً، فقد يقول الشعر الجيد
...ن ليس له المعرفة بنقده، وقال
...ره من لا يقول، وقيل لابن المقفع:
لا تقول الشعر مع علمك به؟ فقال
...كالمسنّ، اشحذ، ولا أقطع۔
...نا الفسوي قال: حدثني يموت
...المزرع قال سمعت الجاحظ يقول:

استعارہ، اور نامانوس واجنبی الفاظ سے بچنا
ایک مستقل فن ہے، اور تم کو اس فن کے ماہر
ایسے ہی لوگ نظر آئیں گے جو فطرت صحیح، روشن
ذوق اور بیدار شعور رکھتے ہیں اور انھوں نے
کلام پر قابو پاکر بصیرت وتمییز کے ساتھ اسے
پڑھا پڑھایا ہو، بحتری شاعری میں صاحب
نظر اور ماہر ہے اور حسین وخوبصورت الفاظ
استعمال کرتا ہے مگر وہ تمام اشعار کی تنقید کا
فن پورے طور سے نہیں جانتا، اگر صرف شعر
گوئی یا اشعار کی روایت سے شعر کی تنقید اور
معرفت حاصل کی جا سکتی تو ہر شعر کہنے والا
فنِ تنقید کا عالم ہوتا اور فنی اعتبار سے سب سے
بڑا شاعر ہوتا، خلیل بن احمد، حماد راویہ،
خلف الاحمر، اصمعی اور ان کے علاوہ علمائے
فن میں سے جو لوگ بھی شعر کہتے ہیں ان کے
اشعار اپنے زمانہ کے شعراء کے کلام سے بہتر
نہیں ہوتے ہیں، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ ہر زمانہ
میں بہت سے ایسے شعراء پائے جاتے ہیں کہ
ان کی ایک پوری جماعت کے پاس مذکورہ
بالا علمائے فن میں سے کسی ایک عالم کا بھی علم
نہیں ہوتا مگر وہ پوری جماعت کے پاس

اجود الشعر ما رایته متلاحم الاجزاء، سهل المخارج، کأنه سبك سبکا واحدًا وأفرغ إفراغا واحدًا فهو یجری علی اللسان کما یجری فرس الرهان، وحتی تراها متقفز مُلسًا، ولینة المعاطف سهلة، فاذا رأیتها متخلخلة متباینة ومتنافرة مستکرهة تشق علی اللسان، وتستکده، ورأیت غیرها سهلة لینة رطبة متواتیة مسلسلة فی النظام حتی کأن البیت بأسره کلمة واحدة، وحتی کأن الکلمة بأسرها حرف واحد، لم یخف علی من کان من أهله،

(کتاب الصون صفحہ ۵، و ۶، و ۷)

مذکورہ بالا علمائے فن میں سے کسی ایک عالم کا بھی علم نہیں ہوتا مگر وہ پوری جماعت بہترین اشعار کہتی ہے، اسی لیے بعض ایسے لوگ اشعار کہتے ہیں جو شعری تنقید کی معرفت نہیں رکھتے اور بعض لوگ اس میں تمیز و معرفت رکھتے ہیں مگر خود شعر نہیں کہتے، ایک مرتبہ ابن مقفع سے لوگوں نے کہا کہ تم شعر کیوں نہیں کہتے ہو حالانکہ تم کو شاعری کا علم ہے تو اس نے جواب دیا کہ میں سان کے مانند ہوں کہ چھری کو تیز تو کرتا ہوں مگر خود کاٹتا نہیں ہوں، جاحظ کا قول ہے کہ بہترین شعر وہ ہے جس کے اجزا مربوط ہوں، ادائگی آسان ہو گویا ایک ہی مرتبہ میں ڈھال دیا گیا ہے اور تیز رفتار گھوڑے کی طرح زبان پر جاری ہو، نہایت صاف سپاٹ ہو سہل و نرم ہو، اور اگر کوئی شعر اکھڑا اکھڑا سا ہو، اس کے اجزا جدا جدا ہوں اور نا مانوس الفاظ کی وجہ سے اس کی ادائگی زبان پر گراں گزرے اور اس کے مقابلہ میں کوئی شعر نہایت نرم و سہل ہو، اس کے الفاظ میں نظم و ترتیب اور ربط ہو، جیسے پورا شعر ایک کلمہ ہے اور

پورا کلمہ ایک حرف ہے، تو یہ شعر جس کسی کا ہو
معائب سے پاک ہے۔

اس کے بعد ان ہی تنقیدی اصولوں کے ماتحت بہت سے واقعات و روایات درج ہیں جن میں اشعار اور شعراء پر تنقید ہے، پھر عربی شاعری کی مختلف اصناف کے بہترین اشعار کا انتخاب ائمۂ فن کے ذوق کے مطابق ہے، اور ہر صنف شاعری میں اوصاف و تشبیہات کے اعتبار سے معیاری اشعار درج ہیں، خاص طور سے بدائع کون اور جمالِ فطرت کی عکاسی کے سلسلے میں بہت سے ایسے اشعار کا انتخاب دیا گیا ہے جو عربی شاعری کے تمام ادوار کے مفاخر و محاسن میں شمار کیے جا سکتے ہیں، ثریا، جوزی، شعریٰ، شمس و قمر، ہلال، لیالی مقمرہ، لیالی مظلمہ وغیرہ کی صفات و تشبیہات پر ایسے اشعار جمع کر دیئے گئے جو شعر و ادب کی بزم کے حسن و جمال اور آبرو ہیں، ان اشعار سے عرب شعراء کے جمالیاتی ذوق کی نزاکتیں اور بلندیاں معلوم ہوتی ہیں۔

پھر مشہور شاعر ابن المعتز کی تشبیہات کے شہ پارے درج ہیں جن میں اس نے مختلف اشیاء و احوال کے بیان میں تشبیہ کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا ہے، ابن المعتز کے تشبیہاتی شہ پاروں کے بعد عباسی دور کے مشاہیر شعراء کی حسین و بلیغ تشبیہات کے نمونے پیش کیے گئے ہیں، اس کے بعد "انواع التشبیہ عند العرب" کے عنوان سے لکھا ہے کہ عربوں کے نزدیک تشبیہ کی چار قسمیں ہیں (۱) تشبیہ مفرط (۲) تشبیہ مصیب (۳) تشبیہ مقارب (۴) اور وہ تشبیہ جو بیان و توضیح کی محتاج ہو اور بدا نہ نکل نہ ہو، اور ہر ایک قسم کی مثال اشعار کے ذریعہ بیان کی ہے، اور عجیب و غریب تشبیہات کی مثالیں بہت تفصیل سے دی گئی ہیں، اس طرح تقریباً نصف کتاب شعری محاسن اور اچھے شعراء کے کلام کے بارے میں ہے، اس حصہ سے عربی شاعری کے نوک پلک کا پتہ چلتا ہے، یہ حصہ صفحہ ۱۴۰ پر ختم ہو گیا ہے۔

صناعۃ الشعر کے بعد صناعۃ الکتابۃ (فن انشاء) کا حصہ شروع ہوتا ہے، اس کی ابتداء

یحییٰ بن خالد برمکی کے فصیح و بلیغ اور مرصّع کلمات سے ہوتی ہے، اس کے بعد علم نحو کی تاریخ اور ائمہ نحو کے طبقات کا مختصر تذکرہ ہے، اور اسی سلسلہ میں کچھ علمائے نحو و ادب کے حالات و واقعات ہیں، پھر شعر و ادب سے متعلق ادبا و شعرا کے کلام کے مختارات و انتخابات ہیں، اس کا سلسلہ بہت لمبا چلا گیا ہے، اور کتاب کے خاتمہ سے کچھ پہلے بلغاء و فصحاء کے کلام کا انتخاب ہے جو کہنا چاہئے کہ سابق بیان کا تتمہ ہے۔

(۱۷)

امام ابوبکر مراغی کی
کتاب تحقیق النصرۃ بتلخیص معالم دار الہجرۃ

۱۳ رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ (اگست ۱۹۵۶ء) میں مدینہ منورہ سے دو تازہ علمی تحفے ملے، ایک امام زین الدین ابوبکر بن حسین مراغی مدنی متوفی ۸۱۶ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب تحقیق النصرۃ بتلخیص معالم دار الہجرۃ، اور دوسرا امام جمال الدین مطری مدنی متوفی ۷۴۱ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب التعریف بما آنست الہجرۃ من معالم دار الہجرۃ، ان دونوں کتابوں کو مولانا شیخ محمد نمنکانی مدنی صاحب المکتبۃ العلمیۃ مدینہ منورہ نے شائع کیا ہے اور ہمارے پاس ہدیۃً روانہ فرمایا ہے، یہ دونوں مدینہ منورہ کی تاریخ ہیں۔

مدینہ منورہ کی قدیم تاریخیں حرمین شریفین کی تاریخ نویسی علمائے اسلام کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے اور ہر دور میں ان مقدس مقامات کی تاریخیں بڑے ذوق وشوق سے مرتب کی گئی ہیں، مدینہ منورہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی سب سے پرانی اور مفصل تاریخ جہاں تک ہمیں معلوم ہے امام حافظ محب الدین بن نجار رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الدرۃ الثمینۃ فی اخبار المدینۃ" ہے جو نہایت پر مغز اور جامع و مستند ہے، اس میں مدینہ منورہ کے اکثر و بیشتر آثار و علائم کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اور دوسری کتاب امام جمال الدین مطری کی "التعریف بما آنست الہجرۃ من معالم دار الہجرۃ" ہے یہ کتاب امام مراغی کی تحقیق النصرۃ سے چند سال پہلے لکھی گئی، اس کتاب میں، امام مطری نے نہایت سلیقہ مندی سے ابن نجار کے بعض مباحث کی تکمیل کی ہے، اور بہت سے تاریخی واقعات کا اضافہ

فرمایا ہے، امام مراغی نے امام جمال الدین مطری کے صاحبزادے شیخ ابو السعادت عفیف الدین سے اس کی روایت کی تھی، اور ان ہی دونوں کتابوں کو سامنے رکھ کر تحقیق النصرہ مرتب کی نیز بہت سے اہم فوائد کا اضافہ کیا،

آج کی مجلس میں ہم اس کتاب اور اس کے مصنف کا تعارف کرانا چاہتے ہیں، علامہ سخاوی نے الضوء اللامع میں امام مراغی کا سلسلۂ نسب یوں بیان کیا ہے، زین الدین ابو بکر بن حسین بن ابو حفص عمر بن ابو عبد اللہ محمد بن یونس بن ابو الفخر بن محمد بن عبد الرحمٰن بن بن طولو قرشی عبشی اموی عثمانی مراغی مصری مدنی رحمۃ اللہ علیہ مشہور ہے کہ آپ کی کنیت ہی آپ کا نام ہے بعضوں نے کہا ہے کہ آپ کا نام عبد اللہ اور کنیت ابو بکر اور ابو محمد ہے، ابن حسین مراغی کے لقب سے بھی مشہور ہیں، آپ کے والد ماجد اپنے وقت کے جلیل القدر عالم تھے، دار الکتب المصریہ کے ایک قلمی نسخہ کی پشت پر ان کا نام یوں درج ہے۔ "الشیخ الامام العالم المقری بدر الدین الحسین بن الشیخ سراج الدین عمر المراغی العبشی العثمانی"

امام ابو بکر مراغیؒ ابو بکر مراغی ۷۲۷ھ میں قاہرہ میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشوو نما پائی ویسے تو آپ نے بہت سے مصری علماء سے تحصیل علم کیا لیکن امام تقی الدین سبکیؒ سے بہت زیادہ پڑھا اور امام اسنویؒ کی صحبت میں رہ کر فقہ میں مہارت حاصل کی اور امام اسنویؒ نے آپ کو افتاء کی اجازت دی، زندگی کے ابتدائی دور ہی میں قاہرہ سے حجاز چلے آئے اور مدینہ منورہ میں پچاسوں برس تک مقیم رہے، یہیں ۷۵۷ھ میں ابن سبع اور شیخ محمد بن فرحون سے صحیح بخاری کا سماع کیا، یہیں شادی کی اور چند اولاد پیدا ہوئی ۱۲ ذوالحجہ ۸۰۹ھ کو شیخ بہاء الدین محمد بن محب زرندیؒ کی جگہ پر مدینہ منورہ کے قاضی اور امام بنائے گئے، اور جب تک اس منصب پر رہے نہایت عمدگی اور سلیقہ مندی سے خدمات انجام دیتے رہے، ڈیڑھ سال کے بعد صفر ۸۱۱ھ میں اپنے داماد شیخ رضی الدین ابو حامد مطری کے حق میں ان عہدوں سے برطرف ہو گئے، مدینہ منورہ میں آپ کی ذات

فضل کا مرکز تھی، حجاج و زائرا آپ کے علمی فیوض و برکات سے نفع حاصل کرتے تھے، مسجد نبوی میں آپ کا مستقل حلقۂ درس تھا جس میں حدیث کی تعلیم دیتے تھے، وصال سے پہلے آپ نے ۸۹۴ھ اور ۸۹۵ھ میں مکہ مکرمہ میں مجاورت اختیار فرمائی تو مکہ، منیٰ اور جعرانہ وغیرہ میں بھی لوگوں نے آپ سے درس لیا۔

علامہ سخاوی لکھتے ہیں کہ امام ابوبکر مراغیؒ سے حدیث کا سماع ان کی اولاد کے علاوہ ان کے نواسے محب الدین اور امام فاسی نے کیا، پھر لکھتے ہیں ومن لا احصیھم کثرۃ اور اتنے زیادہ لوگوں نے آپ سے سماع کیا ہے کہ میں ان کا شمار نہیں کرسکتا، ان سے حدیث کی اجازت رکھنے والے اس وقت بھی کئی حضرات ہیں مگر میرے علم میں ان سے سماع کرنے والوں میں شیخ ابوالفتح ابن علیبک مدینہ میں، اور شیخ ابوبکر بن فہد مکہ میں رہ گئے ہیں، ان کی مجلس درس میں جو عالم آخری دور میں حاضر ہوا وہ شیخ ابوبکر بن علی بن موسی قرشی ہیں۔

ان کا انتقال ۸۹۵ھ یا ۸۹۸ھ میں ہوا، آپ بہترین اور مشہور قاری و مجود بھی تھے، مدینہ منورہ میں بعض لوگوں نے آپ سے تجوید و قراءت کی تعلیم بھی حاصل کی،

وقت کے بڑے بڑے علمائے اسلام نے آپ کے بارے میں قیمتی رائے کا اظہار فرمایا ہے اور آپ کے فیوض و برکات کا برملا اعتراف کیا ہے، جو علما حج و زیارت کے سلسلے میں آپ سے فیضیاب ہوئے انہوں نے اپنی تصانیف میں آپ کا ذکر شاندار طریقہ پر کیا ہے مثلاً ایک تذکرہ نویس نے آپ کو ان القاب سے یاد کیا ہے، الشیخ، الفقیہ، الامام العالم العامل مفتی المسلمین المدرس والمتصدر بالحرم الشریف اسی طرح امام جزریؒ نے آپکے بارے میں لکھا ہے، الامام، العالم العامل العلامۃ البحر الفرید الحجۃ، المحقق، القدوۃ، مفتی المسلمین زین الدین والملۃ جمال العلماء العاملین شرف الاعیان والمدرسین اور شیخ برہان الدین ابناسیؒ کے والد نے آپ کو ان القاب سے یاد کیا ہے۔ الشیخ الصالح المولی کہف الفقراء والمساکین اور خود شیخ برہان الدین ابناسیؒ نے اپنے لڑکے کے اجازت نامہ میں آپ کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے

الشیخ الامام العالم العلامۃ ذی الفوائد الجسیمۃ والفرائد الیتیمۃ صدر المدرسین زین المفتیین
ان الفاظ و القاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام مراغی کس مرتبہ کے عالم و بزرگ تھے
آپ کی وفات ابتدائے ذی الحجہ ۸۱۶ھ میں مدینہ منورہ میں ہوئی، اور جنت البقیع میں
دفن کیے گئے، رحمۃ اللہ (الضوء اللامع جلد ۱۱ صفحہ ۲ تا ۲۸)

آپ کی تصنیفات میں یہ کتابیں ہیں۔

(۱) روائح الزہر، یہ کتاب الزہر الباسم فی سیرۃ ابی القاسم صلے اللہ علیہ وسلم کا اختصار ہے، جو سیرت نبوی پر ایک مفصل کتاب ہے۔

(۲) منافع الحرز، یہ بھی ابوالقاسم عبد الغفار بن محمد سعدی کی کتاب الحرز المعد لمن فقد رسولہ کا اختصار ہے۔

(۳) مرشد الناسک الی معرفۃ المناسک، یہ مناسک حج پر مختصر اور مفید کتاب ہے۔

(۴) الوافی تکملۃ الکافی، یہ ان کے استاذ امام اسنویؒ کی شرح المنہاج کا تکملہ ہے کہا جاتا ہے کہ ابوبکر مراغی نے امام اسنویؒ کی حیات ہی میں ان کی اس شرح کی تکمیل کا کام شروع کر دیا تھا۔

(۵) العمدۃ فی شرح الزبدۃ، یہ بارزیؒ کی کتاب الزبدۃ کی شرح ہے۔

(۶) تحقیق النصرۃ بتلخیص معالم دار الہجرۃ، یہ مدینہ منورہ کی تاریخ ہے جس پر ہم یہ مقدمہ لکھ رہے ہیں، ان کتابوں کے علاوہ اور بھی آپ کی تصنیفات ہیں۔

تحقیق النصرۃ کی خصوصیات

تحقیق النصرہ کو امام مراغی نے ۷۶۶ھ میں لکھا ہے جیسا مسجد نبی ساعدہ کے ذکر میں لکھتے ہیں "اس جگہ پر مدینہ کے دروازہ داب جہینہ کا نشان ۷۶۶ھ تک باقی ہے جو اس کتاب کی تصنیف کا زمانہ ہے (صفحہ ۱۴۶) نیز کتاب کے خاتمہ پر لکھتے ہیں "میں اس کتاب کی تبییض سے شنبہ ۱۲ رجب ۷۶۶ھ کو فارغ ہوا" (صفحہ ۲۱۱) اس کے چالیس سال کے بعد آپ کا انتقال ہوا اس

تالیف وتصنیف کے سلسلہ میں ابن نجار کی الدرۃ الثمینہ اور مطری کی التعریف آپ کے پیش نظر رہی اور ان ہی دونوں کو آپ نے ماخذ قرار دیا جیسا کہ لکھتے ہیں " میں نے ان دونوں کتابوں کی سندوں کو حذف کرکے ان کے مقاصد کو باقی رکھنے کے بارے میں اللہ تعالٰی سے استخارہ کیا اور بعض مقامات پر ایسی باتوں کا اضافہ کیا جن کو ان دونوں حضرات نے اختصار یا ندرت کے خیال سے ذکر نہیں کیا تھا' تاکہ اہل صدق وصفا ان باتوں کو بھی معلوم کرسکیں' نیز میں نے بہت سے نوادر اور فوائد کا اضافہ کیا جو خواص کے لیے بہت اہم ہیں' اختصار اور مناسبت کی وجہ سے مجھے واقعات میں تقدیم وتاخیر' حذف وتطویل اور تکرار سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ تاکہ عوام کو فائدہ ہو' جہاں جہاں میں نے اضافہ کیا اس کے شروع میں قیل کذا' نقل کذا النقل فلاں کذا' ینبغی کذا کے الفاظ لکھ کر آخر میں واللہ اعلم لکھ دیا ہے' یہ میں نے اس لیے کیا کہ یہ فرع اپنی اصل کی جامع ہو جائے' اور فوائد جلیلہ میں منفرد بھی رہے' (صفحہ ۱ و ۱۱) واقعہ یہ ہے کہ امام مراغی نے اپنی طرف سے جن فوائد کا اضافہ کیا وہی اس کتاب کی امتیازی حیثیت کا باعث ہیں' اور ان ہی سے سابقہ دونوں کے مقابلہ میں اس کتاب کی اہمیت معلوم ہوتی ہے' اس کتاب کے تین قلمی نسخوں کا پتہ چل سکا' دو دارالکتب المصریہ میں موجود تھے' جن میں ایک ۷۶۷ھ میں لکھا گیا ہے یعنی کتاب کی تصنیف کے ایک سال بعد کا ہے اور مدینہ منورہ ہی میں لکھا گیا ہے۔ یہ نسخہ نہایت قیمتی اور اہم ہے' اس کے آخر میں یہ عبارت ہے "یہ نسخہ مبارکہ بروز چہارشنبہ ۹ ار رجب ۷۶۷ھ کو فقیر عبداللہ بن عبداللہ کافی بن علی حسنی طباطبی شافی صوفی نزیل حرم رسول اللہ صلے اللہ کے ہاتھ پر تمام ہوا" اور ایک نسخہ خود ناشر کے پاس محفوظ تھا۔ جو تیرہویں صدی کے ایک نسخہ کی نقل در نقل ہے' اس کے پہلے ناقل شیخ لطف اللہ بن شیخ محمد فاکر سندھی مدنی ہیں' یہ بھی مدینہ منورہ ہی میں لکھا گیا ہے' اس کے آخر میں ہے " اس نسخہ مبارکہ کا اتمام یک شنبہ ۲۶ ار ربیع الاوّل ۱۲۲۱ھ کو مدینہ منورہ کے حجرہ شریفہ علی صاحبہا افضل الصلوات واشرف التسلیمات کے سامنے ہوا' عبد ضعیف

نحیف فقیر محتاج الی اللہ لطف اللہ بن شیخ علامہ فہامہ محمد ذاکر سندی نقشبندی" پھر اس سے شیخ عبد الرحیم بن شیخ عبد اللہ صدیق مدنیؒ نے نقل کیا، جس کی کچھ عبارتیں ان کے استاذ شیخ عمر حمدانی محرسیؒ نے بھی لکھیں، اور اس کی نقل جمعہ ۱۲ محرم ۱۳۱۳ھ کو ہوئی، اسی مدنی نسخہ کو اصل قرار دے کر دونوں مصری نسخوں سے اختلاف نسخ درج کیا گیا ہے۔

دار الکتب المصریہ کے ایک عالم محمد عبد الجواد الاصمعی نے اس کتاب کی تصحیح و تحقیق نئے انداز پر کی ہے، اور اسماء داماکن، امم و قبائل اور قوافی کی مفصل فہارس آخر میں دی ہیں، نیز ناشر نے جگہ جگہ اختلاف نسخ کو نقل کیا ہے، اور وفاء الوفاء وغیرہ سے اہم فوائد اور معلومات کا اضافہ کیا ہے ساتھ ہی بہت سی حالیہ تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے، نیز پانچ صفحات میں مسجد نبوی کی جدید عزیزی اور سعودی تعمیرات کا ذکر کر کے دروازوں، مناروں اور ستونوں کی تفصیل دی ہے، جس سے کتاب کی افادیت واہمیت بڑھ گئی ہے، پوری کتاب ۲۷۶ صفحات میں ہے۔

(۱۸)

المنجد پر ایک تنقیدی نظر

"فروری ۱۹۵۶ء میں عربی لغت کی مشہور اور جدید لغت المنجد کا نیا ایڈیشن نکلا جس کے آخر میں المنجد فی الآداب والعلوم کا اضافہ تھا، اس کے چند ہی ماہ بعد یہ جدید ایڈیشن ہمارے سامنے آیا اور ہم نے اکتوبر ۱۹۵۶ء کے "البلاغ" میں "المنجد کی غلطیاں اور افترا پردازیاں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں اس کے جدید حصّہ کی چند غلطیوں اور افترا پردازیوں کو ظاہر کیا، تاکہ اہلِ علم متنبّہ رہیں، اسی زمانہ میں رسالہ دارالعلوم دیوبند نے اسے نقل کر کے اس فرض کفایہ کی ادائگی میں حصّہ لیا، اور اب تیرہ سال کے بعد ایک مصری فاضل اور ماہر ادب ولغت الاستاذ عبدالستار احمد فرّاج نے مجلہ "العربی" کویت بابت ماہ جنوری ۱۹۷۰ء میں المنجد کے اس حصّہ پر ایک تنقیدی مضمون بعنوان "المنجد معجم فی اللغۃ، نقدلہ لامفرمنہ" شائع کیا ہے، پہلے ہم اپنے مقالہ کو درج کرتے ہیں، پھر مصری فاضل کے مضمون کا خلاصہ اور ان کی بتائی ہوئی اہم غلطیوں کو درج کریں گے۔"

المنجد فی الآداب والعلوم اسی سال (۱۹۵۶ء) فروری میں لغت کی مشہور کتاب المنجد کا جو جدید ایڈیشن چھپا ہے، اس کے دو حصّے ہیں، ایک تو وہی المنجد جسے بیروت کے ایک کیتھولک پادری لوئیس معلوف لیسوعی نے لکھا ہے، اور بڑی حکمت عملی سے جگہ جگہ اسلامی لغات ومفاہیم میں کتر بیونت کی ہے، اس طباعت میں اس کا نام "المنجد فی اللغۃ"

دالادب رکھا گیا ہے' اور دوسرا جدید حصہ بیروت ہی کے دوسرے پادری عیسائی فردنیان توتل نے مرتب کیا ہے اور اس کا نام المنجد فی الادب والعلوم مقلب بہ معجم لاعلام الشرق والمغرب ہے' یہ حصہ بھی تقریباً چھ سو صفحات میں ہے اور طباعت قدیم المنجد کی طرح ہے' گویا یہ عام معلومات کا دائرۃ العلوم ہے اور مؤلف نے بڑی محنت وتلاش سے اسے مرتب کیا ہے' اور ہر قسم کی معلومات جمع کرنے کی کوشش کی ہے' یہ کتاب ابھی ابھی مکہ مکرمہ سے ہمارے پاس آئی ہے۔ چونکہ قدیم المنجد کی طرح یہ جدید المنجد بھی بہت ہی سہل اور معلوماتی ہے اس لیے ہمارے عربی مدارس کے طلبا اسے بھی پڑھیں گے' اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ جدید حصہ کی بعض غلطیوں اور چالوں کی نشاندہی کردی جائے تاکہ اس کے مطالعہ کے وقت معلوم رہے کہ یہ عربی زبان کی کوئی ایسی مستند لغت نہیں ہے کہ اس کی ہر بات مان لی جائے' بلکہ بڑی حد تک اس کے معانی و مطالب اسلام اور مسلمانوں کے حق میں سخت مضر ہیں' ہم نے سرسری مطالعے کے بعد یہ چند غلطیاں اور سہو گیاں جمع کی ہیں' اگر اسے غور سے پڑھا جائے تو اس سے کہیں زیادہ شرارتیں معلوم ہوسکتی ہیں' ہمارا منشا فی الحال چند مثالوں کے ذریعہ باخبر کرنا ہے تاکہ اس کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا جائے' اس میں تین قسم کی غلطیاں ہیں' ایک وہ جو مؤلف کے سہو یا لاعلمی سے سرزد ہوگئی ہیں' ان کے لیے وہ ماخوذ و مسئول نہیں ہیں' بڑے سے بڑے مصنف و مؤلف سے اس طرح کی غلطی ہو جاتی ہے' دوسری وہ جو مطبع کی بے پروائی سے ہوئی ہیں' ان پر بھی مؤلف کو مطعون نہیں کیا جاسکتا ہے مگر ان دونوں کے مضر اثرات اور غلط نتائج سے انکار کی گنجائش نہیں ہے' اور ایسا ہونا بہرحال معیوب ہے' تیسری وہ غلطیاں ہیں جو جان بوجھ کر تعصب اور جانبداری کی وجہ سے کی گئی ہیں' ایسی غلطیاں ہلکی ہونے کے باوجود بھاری ہوتی ہیں' اور اگر بھاری ہوں تو بڑی مجرمانہ ہوتی ہیں' افسوس کہ اس میں ہر اقسام کی غلطیاں بکثرت ہیں' اور پادری فردنیان توتل علم و تحقیق کی عدالت میں مجرم ہے' اس میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہی تعصب و تنگ نظری ہے جو ہر عیسائی میں ہوتی ہے

خواہ وہ کتنا ہی صاف ذہن معلوم ہو اور کتنا ہی بڑا محقق بنے، اصل مضمون سے پہلے ایک حقیقت کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

اسلام اور عیسائیت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی، اور ساتھ ہی تین طاقتیں مخالفانہ سرگرمی دکھانے لگیں، ایک طرف کفار مکہ تھے جو کھل کر مسلمانوں کے مقابلہ میں آگئے، اور ان سے مسلمانوں کی جنگ رہا کرتی تھی، دوسری طرف اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ تھے جو عرب میں سرمایہ داری، جاگیرداری اور اپنے علوم کی وجہ سے کافی اثر رکھتے تھے، اور ان کی چالیں کبھی مسلمانوں کو چین لینے نہیں دیتی تھیں، اور تیسری طرف منافقوں کا گروہ تھا جو بظاہر مسلمانوں سے میل جول رکھتا تھا مگر درپردہ کفار اور اہل کتاب سے ساز باز رکھتا تھا، ان تینوں طاقتوں میں کفار عرب کی طاقت فتح مکہ کے بعد ختم ہوگئی اور اسی کے بعد منافقوں کا گروہ بھی تقریباً ختم ہی ہوگیا، مگر تیسرا گروہ یہود و نصاریٰ کا باقی رہا اور بعد میں اسلام اور مسلمانوں کو اس سے نبرد آزما ہونا پڑا، اس میں سے یہود بڑی حد تک شکست خوردہ ہو کر سامنے سے ہٹ گئے، البتہ نصاریٰ کا گروہ آج تک مختلف شکلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کام کیا کرتا ہے، مدتوں تک عیسائیوں نے صلیبی جنگوں کی صورت میں اسلام کا مقابلہ کیا، اور شکست کے بعد جب ادھر سے رُخ پھرا تو ان کے پادریوں اور عام عالموں نے اپنی کتابوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر اُگلنا شروع کیا، اور کئی صدیوں تک عیسائی مصنفین اپنی کتابوں میں اسلام کے خلاف طرح طرح کی بے سروپا باتیں لکھتے رہے اس کے بعد اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہ نصاریٰ استشراق اور علم و تحقیق کے نام پر اسلامی علوم و فنون میں دخل انداز ہو کر اسلام پر رکیک حملے کرتے رہتے ہیں اور مصری کے ساتھ زہر مسلمانوں کو دیتے ہیں، بہت سے عیسائی مصنفوں نے بڑی چالاکی سے مسلمانوں ہی سے علم و فضل کی سند حاصل کی، اور ان کے ہمنوا بن کر ان کے دین اور رجال دین کو تختۂ مشق بنایا، اور یہی حال المنجد کے عیسائی پادری

مؤلف و مرتب کا ہے، اس کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں،۔

چند فاش غلطیاں اور افترا پردازیاں

آدم کے ماتحت لکھا ہے کہ آدم و حوا نے اللہ کی نافرمانی کی تو جنت الفردوس سے نکال دیئے گئے، پھر لکھا ہے کہ ولکنھما وعدا بمخلص ھو المسیح (مگران دونوں سے ایک نجات دہندہ کا وعدہ کیا گیا جو عیسیٰ مسیح ہیں) دیانت داری اور ذمہ داری کا تقاضا یہ تھا کہ یہاں عند المسیحیین بھی لکھنا چاہیئے تھا جیسا کہ بعض دوسرے مقامات پر ایسے مواقع پر لکھا ہے، یہ آدم و حوا کی لغوی تحقیق نہیں ہے بلکہ مسیحی عقیدہ کی ترجمانی ہے، فرقہ احمدیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ فرقہ اسلام سے منفق ہے، صرف تین باتوں میں اختلاف ہے مگر ان تین باتوں میں عقیدہ ختم نبوت کا نام تک نہیں لیا ہے، حالانکہ فرقہ احمدیہ اور مسلمانوں کے درمیان یہی مسئلہ سب سے اہم ہے جس میں قادیانیت اور اسلام کا اختلاف ہے، اور اسی کے قائل نہ ہونے کی وجہ سے قادیانی اسلام سے خارج ہیں، مسئلہ ختم نبوت کو بیان نہ کرنا مؤلف المنجد کی شدید جہالت یا بددیانتی ہے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر بالواسطہ حملہ ہے، ازد کے ماتحت لکھا ہے کہ یہ قبیلہ محمدؐ کی وفات کے بعد اسلام سے مرتد ہو گیا تو فاضطرھم ابوبکر الی الرجوع الیہ یعنی ابوبکر نے اس کو اسلام کی طرف لوٹنے پر مجبور کیا "اضطرار" کے لفظ سے حضرت ابوبکر کی طرف سے قبیلہ ازد پر جبر و تشدد دکھانا مقصود ہے، اس طرز تحریر سے اسلام میں جبر و اکراہ ثابت کرنا معلوم ہوتا ہے

اہل الکتاب کے متعلق لکھا ہے کہ یہ نام قرآن نے یہود و نصاریٰ کو دیا ہے تاکہ وہ بت پرستوں سے ممتاز ہو جائیں کیونکہ ان کے پاس آسمانی کتابیں ہیں اور اس کے بعد لکھا ہے کہ وبعض التفصیل فی حمایة اھل الکتاب نماکبیرا یعنی اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی حمایت میں تقصیر کرنے کو بہت بڑا گناہ شمار کیا گیا ہے، مؤلف نے یہ بات اپنی طرف سے یوں بیان کی ہے جیسے یہ اسلام کا حکم ہے اور اس نے مسلمانوں کو ابھارا ہے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی مدد کریں اور ان

کی حمایت وطرفداری میں تقصیر کرکے گناہ عظیم کے مرتکب نہ ہوں، یا لفاظ دیگر موجودہ حکومت اسرائیل کی نہ صرف یہ کہ مخالفت کریں بلکہ اس کی پوری حمایت کریں، ان چند لفظوں میں بددیانتی کا انبار ہے،

بحیرا راہب کے بیان میں "قیل" کہہ کر یہ لغویت ظاہر کی ہے کہ وہ نسطوری مذہب کا عیسائی تھا اور علم نجوم اور جادو جانتا تھا اس لیے راہبوں کے سردار نے اسے کلیسا سے نکال دیا، وہ جاتے جاتے عرب پہونچا اور عربوں کی تجارتی گزرگاہ پر ایک گرجا بنایا جہاں عربوں کو توحید کی دعوت دیا کرتا تھا، اس میں مؤلف المنجد نے بحیرا راہب سے رسول اللہؐ کی ملاقات اور اس کی بشارتوں پر بدترین رائے کا اظہار کیا ہے اور بتانا چاہا کہ اسی نے محمدؐ کو توحید اور جادو و نجوم کی باتیں سکھا دی تھیں، نعوذ باللہ۔

براق کے لفظ کی تشریح کے لیے حدیث کا حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ براق وہ جانور ہے جو محمدؐ کو لے کر مکہ سے یروشلم اور مسجد اقصیٰ تک اڑا، حالانکہ حدیث میں براق کے آسمان تک اڑنے کا ذکر ہے، مگر اس نے اسے چھپا دیا اور پوری حدیث بیان نہیں کی، یہ بھی تعصب کا مظاہرہ ہے

الخراج کے ماتحت خراج پر چند کتابوں کا ذکر کرکے لکھا ہے، وکتاب الخراج للفقیہ یحیی بن سلیمان القرشی حالانکہ یہ یحییٰ بن آدم قرشی مشہور محدث ہیں، ان کے والد کا نام سلیمان نہیں بلکہ آدم ہے، ایسے مشہور مصنف کے نام کے بارے میں ایسی جہالت قابل افسوس ہے،

خضر کو "خضر" لکھا ہے جو سراسر غلط ہے پھر لکھا ہے کہ احد اولیاء المسلمین رفعہ القرآن فوق الانبیاء باعتبار الدلیل المعهود الیہ بارشاد موسیٰؑ یعنی خضر مسلمانوں کے ایک ولی کا نام ہے جسے قرآن نے انبیاء سے بلند مرتبہ دیا ہے کیونکہ انہوں نے موسیٰؑ کی رہبری کی تھی، یہ قرآن پر کھلا ہوا بہتان ہے کہ اس نے ایک ولی کو انبیاء سے زیادہ بلند بتایا ہے، قرآن میں خضر کا نام کہیں نہیں ہے، جہاں حضرت موسیٰؑ کی رہبری کا ذکر ہے وہاں عبد کا لفظ ہے، پھر کسی نبی کو کوئی عبد صالح کچھ باتیں بتا دے تو اس سے اس کی فوقیت کی دلیل پکڑنا نادانی کی بات ہے۔ آگے چل کر

لکھا ہے کہ خضر کے اوصاف ایلیا ر نبی اور جرجیس کے مانند ہیں، پھر یہ صرف مسلمانوں کے ولی کیسے ہے

ابن خِلّکان، خار کو زبر کے ساتھ لکھا ہے، حالانکہ یہ ابن خَلّکان خار کے زبر کے ساتھ ہے، اور مشہور مورخ کا لقب ہے۔

دارالاسلام کے بارے میں لکھا ہے کہ اس میں غیر مسلم شروط معینہ کے ساتھ اسلامی حکم کے تابع ہوتے ہیں: الا انهم لا يتمتعون بالحقوق المدنية الكاملة یعنی مگر دارالاسلام کے یہ غیر مسلم پورے شہری حقوق سے فائدہ نہیں اٹھاتے، اس جملہ میں ان تمام اسلامی احکام اور کردار کو چھپانے کی کوشش کی ہے جو ذمیوں کے بارے میں موجود ہیں اور دور خلافت میں جن کا تجربہ وظہور ہو چکا ہے۔

دار العلم یا بیت الحکمۃ کے ماتحت لکھا ہے کہ اسے مامون نے بنوایا تھا، كان مكتبة ينقل فيها بعض النصارى المولفات اليونانية القديمة یعنی یہ ایک دفتر تھا جس میں بعض نصاریٰ قدیم یونانی کتابوں کا ترجمہ کرتے تھے، کس آسانی سے عباسی دور کی اس عظیم الشان علمی اکاڈمی کو مولف یہ کہہ کر بے حیثیت بنانا چاہتا ہے کہ اس میں بعض عیسائی یونانی کتابوں کے تراجم کی خدمت انجام دیتے تھے، اس نے اپنے عیسائی علماء کی علمی خدمت کا تذکرہ تو کیا مگر مسلمانوں کے اور دوسرے اقوام کے حکماء و فلاسفہ اور علماء کے بارے میں اشارہ تک نہیں کیا، یہ چال ایک طرف مسلمانوں کے علمی کارناموں کو چھپاتی ہے اور دوسری طرف عیسائی علماء کا پروپیگنڈا کرتی ہے، مؤلف کی یہ ذہنیت پوری کتاب میں نمایاں ہے اور جہاں کہیں کسی ایسے مسلمان عالم، ادیب شاعر اور محدث وفقیہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے جن کے آبائی مذہب کے متعلق معلوم ہوا کہ مسیحیت تھا تو اسے خاص طور سے بیان کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مسیحیت کا صدقہ ہے،

رتن بابا کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں کے ولی ہیں جو درازی عمر میں مشہور ہیں، اور ان سے بہت سی حدیثیں اور کہانیاں روایت کی گئی ہیں، رتن کے بارے میں

یہ سب لکھتے وقت شاید مؤلف کو معلوم نہیں تھا کہ مستند علمائے اسلام نے رتن ہندی کو دجال وکذاب تک کہا ہے جیسا کہ اصابہ اور میزان الاعتدال میں حافظ ابن حجرؒ اور امام ذہبیؒ نے تصریح کی ہے، یہ درست ہے کہ بعض مشائخ نے رتن ہندی کو تسلیم کیا ہے، مگر اسے بیان کرکے علمائے اسلام کی تصریحات سے صرفِ نظر کرنا جہالت اور تعصب ہے۔

رِقّ (غلامی) کے ماتحت لکھا ہے کہ کان للرق نظام مصروف عند الیهود، و الیونان، والرومان والعرب فی الجاهلیة والاسلام یعنی غلامی کا مستقل نظام یہودیوں، یونانیوں، رومیوں اور عربوں کے دورِ جاہلی اور دورِ اسلام میں موجود تھا، پھر لکھا ہے کہ آہستہ آہستہ اس نظام کو ختم کیا گیا، بڑی چالاکی سے مؤلف نے یہود اور اسلام میں غلامی کے نظام کو بیان کیا ہے، اور نصاریٰ کا نام اس میں نہیں لیا، حالانکہ نصرانیوں کے یہاں بھی اس کا نظام تھا اور اسلام نے سب سے پہلے تدریجی طور سے رق اور غلامی ختم کرنے کے احکام نافذ کئے، اور انسان کو غلامی سے بچانے کے لیے قدیم نظام کے خلاف اقدام کیا۔

ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے والد کا نام جہش ہائے ہوز سے لکھا ہے جو سراسر غلط ہے۔

حضرت ابوبکر شبلی بغدادیؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ بالغ فی التقشف حتی الجنون فکان یکحل عینیه بالملح کی لاینام، یعنی وہ تقشف اور خشکی میں جنون کی حد تک پہونچ گئے تھے، حتیٰ کہ اپنی آنکھوں میں نمک کا سرمہ لگاتے تھے تاکہ نیند نہ آئے کسی مسیحی تارک الدنیا راہب کے بارے میں جنون اور پاگل پن کا لفظ استعمال تو صحیح ہو سکتا ہے مگر کسی مسلمان ولی و زاہد کے بارے میں یہ صحیح نہیں ہے، معلوم نہیں مؤلف کو آنکھ میں نمک کا سرمہ لگانے کی روایت کہاں .... ملی اور اس کی تصدیق کے کیا اسباب تھے؟ اہل علم و تحقیق کے نزدیک ایسی روایات عموماً غیر معتبر ہوتی ہیں، شیبانی کے ماتحت لکھا ہے کہ ابو عبداللہ محمد شیبانی واسط میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ابو حنیفہ کے مسلک پر رائے کا علم حاصل کیا، اور مالک بن انس

سے حدیث میں وسیع علم حاصل کیا اور ابویوسف سے فقہ حاصل کی۔ ان کی مولفات میں الاصل فی الفروع اور المبسوط اور الجامع الکبیر ہے' پھر اسی کے ماتحت لکھا ہے کہ محمد بن حسن واسط میں پیدا ہوئے' اور رے میں فوت ہوئے' انہوں نے ابوحنیفہ سے فقہ حاصل کی' اور ہارون رشید کے دربار میں شافعی کے ساتھ مجالست کی' ان کی مولفات میں الجامع الصغیر اور موطا ہے' اتنی مشہور شخصیت کے بارے میں یہ جہالت کہ امام ابوعبداللہ محمد بن حسن شیبانی کو دو افراد سمجھ کر الگ الگ تذکرہ کیا جائے قابل افسوس ہے' اور کسی محقق و مستند عالم کے لیے زیبا نہیں ہے۔

صلیبیہ کے ماتحت صلیبی لڑائیوں کے ذکر میں لکھا ہے کہ نصاریٰ محاربین مغربی یورپ سے آئے تاکہ قبر مسیح اور مقدس زمینوں کو واپس لیں' پھر لکھا ہے' وکان من نتائجها التعارف والتفاهم بين الشعوب وتبادل العلاقات الثقافية والصلات التجارية بين المشرق والغرب وازدهار فن البناء وترقي الصناعات ، یعنی صلیبی جنگوں کا فائدہ اور نتیجہ یہ ہوا کہ قوموں کے درمیان تعارف و تفاہم ہوا' ثقافتی تعلقات قائم ہوئے' اور مشرق و مغرب میں تجارتی علاقے عام ہوئے' اور فن تعمیر وغیرہ میں بڑی رونق پیدا ہوئی' اور صنعتوں میں ترقی ہوئی' فردینان توتل نے بڑی چالاکی سے نصرانیوں کی خونریزیوں اور خون آشامیوں کو خوبصورت الفاظ کے پردے میں چھپا کر اس پر وہ حسین و جمیل مناظر پیش کئے ہیں اور مغربی درندوں کے احسانات مشرق کے مسلمانوں پر شمار کرائے ہیں اور مسلمانوں کو عیسائی بھیڑیوں کا رہین منت بنانے کی کوشش کی ہے کس چالاکی سے کہہ دیا کہ مغربی یورپ کے عیسائی قبر مسیح اور مقدس زمین کو واپس لینے آئے تھے' گویا اسی لیے یہ تمام خون آشامی کی گرائی' حالانکہ ان کے عقیدہ کے مطابق مسیح کی ہر چیز مسلمانوں کے دور حکومت میں ان کے مذہبی رہنماؤں اور ذمہ داروں کو دے دی گئی تھی' اور وہ اس کے سب کچھ تھے' اسلام پر عیسائیت کی اس زبردست یلغار کو صرف اتنا معمولی کر کے بتانا علم و ادب کی خدمت نہیں اپنے مذہب کی غلط جانبداری ہے۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کو عبدالقادر دہلوی بن ولی اللہ بن عبدالرحمن لکھا ہے، حالانکہ شاہ ولی اللہ صاحب کے والد کا نام عبدالرحیم ہے۔ قرآن کے بارے میں لکھا ہے کہ

وَقد جمع عثمان نصّہ کما بلغ الینا واتلف کل نصٍ سواہ حفاظًا علی سلامۃ نقلہ

یعنی عثمان نے قرآن کی نص کو جمع کیا جیسا کہ وہ ہم تک پہونچا ہے اور اس کے سوا تمام نصوص کو تلف کر دیا تاکہ نقل عثمانی سالم و محفوظ رہے معلوم ہوتا ہے کہ فردینان توتل، یوحنا، متی، مرقس اور لوقا کی انجیلوں یعنی ان کی یادداشتوں اور کہانیوں کی طرح قرآن کو بھی چند افراد کی نص اور یادداشت سمجھتا ہے، اور کہتا ہے کہ عثمان نے اپنے قرآن کو جمع کرنے کے بعد دوسرے تمام قرآنی نصوص کو ضائع کر دیا، قرآن کے بارے میں اس قسم کی بات کرنا عیسائی مصنفین کا خاص شیوہ ہے۔

قرمط کے ماتحت قرامطہ ملاحدہ کے تخریبی نظام اور جارحانہ اقدام کو چھپا کر لکھا ہے۔

اسمُ اطلق فی سعۃ المعنی علی الحرکۃ الاصلاحیۃ الشاملۃ الحیاۃ الاجتماعیۃ والقائلۃ بالتساوی بین طبقات الناس یعنی قرامطہ کا لفظ عمومی معنی میں ایک ایسی اصلاحی تحریک پر بولا جاتا ہے جو اجتماعی زندگی کو شامل ہے، اور انسانی طبقات میں مساوات کی قائل ہے۔ اس کے بعد اس تحریک کے بارے میں معلومات درج ہیں۔ قرامطہ جیسی دشمنِ اسلام منظم سازش کو اصلاحی تحریک اور انسانی مساوات کا علمبردار بتانا اسلام دشمنی ہے۔ اس دور میں خونریزی، سفاکی، قتل و غارت ...، سلب و نہب میں کوئی طبقہ اس سے بڑھ کر نہیں تھا۔ اسے اصلاحی تحریک بتانا عجیب بات ہے جیسے صلیبی جنگوں کو اجتماعی اور ثقافتی فوائد کا واسطہ قرار دینا عجیب بات ہے۔

اللکنوی کے ماتحت مولانا عبدالحئی لکھنوی کا نام محمد بتایا ہے اور لکھا ہے ابوالحسنات محمد حالانکہ ابوالحسنات محمد عبدالحئی ہونا چاہیئے، اسی طرح اس کتاب میں بہت سی باتیں ہیں جو تاریخی، لغوی اور مذہبی حیثیت سے غلط ہیں، ہم نے سرسری طور پر چند باتوں کو ذکر کر دیا ہے تاکہ المنجد کا مطالعہ کرنے والے اس کی ہر بات کو صحیح نہ سمجھیں اور اسے بغیر تحقیق کے تسلیم

نہ کریں، پھر ایک المنجد پر کیا موقف ہے۔ کسی عیسائی عالم کی کتاب کو مذہبی تعصب سے پاک نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ ادنیٰ سے اونچا عیسائی عالم اسلام کے بارے میں بہر حال اچھی رائے نہیں رکھتا ہے۔

ایک مصری فاضل کی تنقید

جیسا کہ ہم نے بتایا ہے تیرہ سال کے بعد ایک مصری فاضل استاد عبد الستار احمد فراج نے مجلۃ العربی کویت بابت ماہ جنوری ۱۹۷۰ء میں المنجد کے اس حصہ پر تنقید کی ہے۔ اور مثال کے طور پر ایک سو غلطیاں بیان کر کے طبع ثانی میں اعادۂ نظر کی توقع کی ہے، انہوں نے اغلاط کی تین قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ غلطیاں جو خاص طور سے اسلامی لغات و متعلقات کے بارے میں ہیں۔ دوسری وہ جو علمی و تاریخی اور فنی ہیں اور تیسری وہ جو اعراب یا حروف کی ہیں، اور ان کا تعلق مطبعی غلطیوں سے بھی ہو سکتا ہے، ہم اس مقالہ کے چند اہم اغلاط کو بیان کرتے ہیں۔

اسلام کے بارے میں غلط بیانیاں

پادری فرڈینان توتل نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کے متعلق لکھا ہے کہ محمدؐ مسلمانوں کے نبی ہیں۔ بنی ہاشم سے ہیں۔ خدیجہ سے شادی کی، اور ان سے فاطمہ پیدا ہوئیں اور اعراب کو اسلام کی دعوت دی، بدر کی لڑائی میں اہل مکہ پر غالب آئے۔ مگر اہل مکہ احد کی جنگ میں ان پر غالب آئے، پھر آپ نے لوٹ کر حنین میں ان سے جنگ کی اور مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے یہ اس درجہ ناقص اور سطحی ہیں کہ ایک نبی تو کیا ایک مشہور آدمی کے تعارف میں ناکافی ہیں انداز بیان نہایت عامیانہ ہے۔ خاص طور سے یہ جملہ کہ دعا الاعراب إلى الاسلام یعنی بدوؤں کو اسلام کی دعوت دی نہایت گرا ہوا ہے۔

اثر شریف یا ذخیرے کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بعض متبرکات ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ محمدؐ کے ہیں جیسے ان کے بال، ان کے دانت، ان کے کپڑوں کے ٹکڑے

اور ان کے خط کے نمونے آثارِ متبرکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک کا تذکرہ سراسر غلط ہے اور آپ کے خط کے نمونے کا ذکر سراسر بہتان ہے، دنیا کو معلوم ہے کہ آپ امّی تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔

قرآن شریف کی سورہ ص کو یوں لکھا ہے "الصاد السورۃ ۳۸ من القرآن"۔ اس میں "ص" کو "صاد" اور سورہ کو "صورۃ" لکھ کر تحریف کی ہے، حضرت خضر کے بارے میں لکھا ہے کہ خضر مسلمانوں کے ایک ولی ہیں جن کو قرآن نے انبیاء پر فوقیت دی ہے، یہ قول خلل وافترا ہے اور بے وقوفوں کی سادہ بات ہے اور لفظ "خُضر" ضمہ کے ساتھ نہیں ہے۔ بلکہ کسرہ کے ساتھ "خِضر" ہے۔

آدم کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ آدم وحوا نے اللہ کے احکام کی نافرمانی کی اس لیے وہ جنت الفردوس سے نکالے گئے، مگر ان دونوں سے ایک نجات دہندہ کا وعدہ کیا گیا اور وہ مسیح ہیں، تو تل کو چاہیے تھا کہ یہاں یہ لکھ دیتا کہ یہ مسیحیوں کے اعتقاد کی رو سے ہے، اسے خوب معلوم ہے کہ المنجد کی پڑھنے والی اکثریت مسلمان ہے جو مسیح کو صرف ایک محترم مانتی ہے۔

حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ کو لکھا ہے کہ وہ "من موالید محمد یعنی وہ محمد کی اولاد میں سے ہیں، شاید موالید موالی کا محرف ہو، مگر کیسے معلوم کہ موالید جان بوجھ کر لکھا ہے یا یہ موالی کا محرف ہے؟

حضرت لقمان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ان حکماء میں سے ہیں جن کے حکم وامثال بیان کیے جاتے ہیں اور وہ ایک افسانوی شخصیت ہیں" حالانکہ مسلمانوں کے یہاں لقمان افسانوی شخصیت (شخصیہ اسطوریہ) کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ ان کے نام سے ایک مستقل سورہ قرآن میں ہے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ نصیحت نقل کی يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ، اگر اسرائیلی خرافات ان کے بارے میں ہیں جو ان کو افسانوی شخصیت بناتی ہیں تو دوسرے انبیاء ومرسلین جیسے محمد، موسیٰ، عیسیٰ، یوشع، عزیر، مریم وغیرہ کے بارے میں بھی ان کی واہی تباہی باتیں ہیں تو کیا تمام حضرات افسانوی شخصیت قرار پا جائیں گے؟

حضرت ادریس کے متعلق لکھا ہے کہ ایک شخص ہیں جن کا ذکر دو بار قرآن میں آیا ہے، اور بارہ اور نبی کے ساتھ ملقب کیا گیا ہے، حالانکہ قرآن نے حضرت ادریس کو صدیق اور نبی کے لقب سے ملقب کیا ہے اور کہا ہے انہ کان صدیقا نبیا (سورۂ مریم آیت ۵۶) مؤلف نے عربی مراجع خاص طور سے قرآن سے رجوع کیوں نہیں کیا؟۔

مسیلمہ کذاب کے متعلق درج ہے کہ مسیلمہ یمامہ میں بنی حنیفہ کا نبی تھا، محمدؐ کا معاصر تھا، اوران کے سامنے تجویز پیش کی وہ اسے نبوت میں شریک کرلیں، اس کے بعد عقربار کی جنگ میں قتل کیا گیا، اتنا لکھ کر مؤلف خاموش ہوگیا اور یہ نہیں بتایا کہ مسیلمہ کی نبوت جھوٹی تھی یا سچی اور اس کی حقیقت کیا تھی، اس کی وجہ ظاہر ہے۔

حضرت عاتکہؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ ھی بنت عبد المطلب عم النبی اس میں لفظ "عم" سجث طلب ہے، اگر یہ عبدالمطلب کے بارے میں ہے تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے عم (چچا) نہیں بلکہ "جد" (دادا) ہیں، اور اگر عاتکہ کے بارے میں ہے تو اسے عمّہ (پھوپھی) ہونا چاہیے مشہور کتاب الف لیلہ ولیلہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ وہ قصے ہیں جن کو شہرزادی شہرزاد نے اپنی بہن دنیا زاد کے بارے میں امیرالمومنین کے سامنے بیان کیا ہے، ہم پوچھتے ہیں کہ یہ امیرالمومنین کون ہے؟۔ معمولی پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ ان قصوں کو شہرزاد نے بادشاہ شہریار کے دربار میں بیان کیا ہے۔ اور یہ دونوں خیالی شخصیتیں ہیں، تو تل نے خواہ مخواہ اس میں امیرالمومنین کا ذکر کیا ہے اسے مبہم رکھ کر امرائے مسلمین کے بارے میں گمراہی پھیلائی ہے، حضرت ذوالکفل کے متعلق لکھا ہے کہ ذوالکفل ایک آدمی ہے جس کا ذکر قرآن میں انبیاء کے ساتھ کیا گیا ہے، یہ لفظ "ذوالکفل" نہیں بلکہ "ذوالکفل" قرآن میں ہے۔ سورۂ شعراء کے بارے میں ہے کہ الشعراء السورة ۲۶ من القرآن، حالانکہ صحیح الشعراء ہے جو شاعر کی جمع ہے۔

یہ چند اشارات خاص طور سے دینِ اسلام کے ساتھ بدخواہی اور غلط بیانی کے متعلق ہیں اب ہم ان ہی چند مثالوں پر اکتفا کر کے کچھ علمی اور تحقیقی اغلاط کی مثال پیش کرتے ہیں۔

علمی وتاریخی غلط بیانیاں

اصمعی کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے بصرہ میں خلیل، عیسیٰ بن عمر، اور ابوعمر بن الاعلیٰ سے علم حاصل کیا اور ان سے ابوالفضل ریاشی، ابوعبیدہ، سجستانی اور سکری نے پڑھا، اس عبارت میں چند غلطیاں ہیں، اصمعی کے اساتذہ میں "ابوعمر بن الاعلیٰ" نامی کوئی عالم نہیں ہے بلکہ "ابوعمرو بن العلاء" ہے، اور ابوعبیدہ عمر میں اصمعی سے بڑے تھے اور انھوں نے اصمعی سے نہیں پڑھا ہے۔ اور جس سال اصمعی کی وفات ہوئی اسی سال سکری پیدا ہوئے، پس وہ اصمعی کے شاگرد کیسے ہوسکتے ہیں؟۔

"العلاء ابوعمر زبان" غلط ہے، صحیح "ابوعمرو زبّان" ہے۔

ایک جگہ لکھا ہے کہ ازہری نے ثعلب، ابن دُرید، اور نفطویہ سے پڑھا ہے، حالانکہ ازہری نے ابن دُرید سے تحصیل علم نہیں کی ہے۔

مجنوں کے متعلق لکھا ہے کہ مجنوں "قیس بن الاہتج" کا لقب ہے، اس نے لیلیٰ نامی ایک عورت سے مل کر اپنا اونٹ ذبح کیا تاکہ اس کی محبت کو پیغام دے، یہ غلط ہے۔ مجنوں کا نام "قیس بن الملوح" ہے، اور اس کے تذکرہ میں ذبح اونٹ کا واقعہ نہیں ملتا بلکہ یہ قصہ مشہور شاعر امرئ القیس کا ہے جسے مؤلف نے مجنوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔

بلاذری کی کتاب انساب الاشراف کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں عبدالملک اور ولید کے زمانہ کی بنوامیہ کی خبریں بہت زیادہ ہیں، یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے انساب الاشراف اب تک نہیں دیکھی ہے۔

الاغانی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا آخری حصہ یورپ کے بعض کتب خانوں سے ملا اور چھاپا گیا، یہ بات اس کے اکیسویں حصہ کا نہ جاننے والا ہی کہہ سکتا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مستشرق عالم نے قدیم طباعت کی کتاب الاغانی اور اس کے بعض مخطوطات کو ملایا اور مخطوطات میں بعض ایسے تراجم اور واقعات ملے جو مطبوعہ نسخہ میں نہیں تھے، اس نے ان ہی کو جمع کرکے الاغانی کی اکیسویں جلد کے نام سے چھاپ دیا ہے، جعفر بن یحییٰ برمکی کے بارے میں لکھا ہے

کہ اس نے ہارون رشید کی بہن عباسہ سے شادی کی تھی، یہ خرافات ہے اور جعفر برمکی سے عباسہ کی شادی کی کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ بہت بعد کی کہانی ہے جو برامکہ کے قتل کی وجہ کے طور پر بنائی گئی ہے۔

مازنی (ابو عثمان بکر ۲۴۸ھ) کے حال میں ہے کہ اس سے مبرد، ریاشی اور تبریزی نے علم حاصل کیا، حالانکہ تبریزی کے بارے میں اسی المنجد میں ہے کہ اس کا زمانہ ۴۲۱ھ اور ۵۰۲ھ کے درمیان ہے اس لیے تبریزی مازنی کا شاگرد نہیں ہو سکتا۔

مشہور شاعر ذوالرمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا دیوان ایک تہائی لغت عرب کو شامل ہے یہ نہایت غیر ذمہ دارانہ انکشاف ہے، اگر ذوالرمہ کے تمام اشعار یکجا کر کے شایع کیے جائیں تو الفاظ کی تکرار کے باوجود عربی لغت کے پچاسویں حصہ کے برابر نہیں ہوں گے۔

ایک مقام پر لکھا ہے کہ نضر بن حرث بن کلاہ ثقفی، نبی کی خالہ کا لڑکا ہے، اطبائے عرب میں ہے اس نے علم طب اپنے باپ سے حاصل کیا، واقعہ بدر کے بعد قتل کیا گیا"، اس میں متعدد غلطیاں اور فرد گذاشتیں ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ حارث کو حرث لکھا دوسرے حارث بن کلاہ ثقفی نے نضر نامی کوئی لڑکا نہیں چھوڑا تھا، صاحب المنجد دراصل نضر بن حارث بن علقمہ بن کلاہ بن عبد مناف کو بیان کرنا چاہتا ہے جو قبیلہ قریش کی شاخ بنی عبد الدار سے ہے وہ ثقفی نہیں ہے اور نہ اس نے اپنے باپ سے علم طب سیکھا اور نہ وہ اطبائے عرب سے ہے۔

امام سیوطی کی لغت کی مشہور کتاب کا نام "اَلْمَزْهَر" بتایا ہے حالانکہ صحیح "اَلْمُزْهِر" میم کے ضمہ اور ہا کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اسی طرح عبد الستار فراج نے نمونہ کے طور پر ایک سو غلطیاں بیان کی ہیں، ہم نے ان میں سے چند کا ذکر کیا ہے، اعراب اور حروف کی غلطیاں بھی اسماء و اماکن میں بہت زیادہ ہیں اور یہ کتاب بغیر دوسرے مراجع کی تصدیق کے لائقِ اعتماد نہیں ہے۔

---

(۱۹)
اِستشراق اور مستشرقین

مشرق میں بنوامیہ کی خلافت وحکومت کے زوال کے نتیجہ میں مغرب کی سرزمین نے ان کے لیے اپنی آغوش کھولی، اور عبدالرحمٰن الداخل نے اندلس کے شہر قرطبہ میں ۱۳۸ھ میں ایک تازہ دم خلافت وحکومت کی بنیاد ڈالی، جس میں ۲۸۴ سال کی مدت میں یکے بعد دیگرے ۱۹ خلفاء وسلاطین تخت نشین ہوئے، اس کے بعد یہاں طوائف الملوکی پھیل گئی، اور مختلف خاندانوں نے اندلس کے مختلف علاقوں پر اپنی اپنی حکومت وریاست قائم کرلی، اِدھر مشرق میں بنوعباس نے اپنی خلافت کی بنیاد رکھی، اور بیک وقت مشرق ومغرب دونوں سمتوں میں اسلامی حکومتیں اپنے اپنے انداز میں کام کرتی رہیں، بنوامیہ نے دین اسلام، عربی تہذیب وتمدن اور اپنے علوم وفنون کو اغیار کے اثرات سے ہر طرح محفوظ رکھا، ساتھ ہی مغرب کی مختلف غیر مسلم قوموں سے میل جول قائم کرکے انکے ساتھ دینی اور علمی ربط وتعلق پیدا کیا گر مشرق کی طرح مغرب میں بھی انہوں نے دوسروں کے اثرات سے اپنے کو بچا کر ان کو اپنے اثرات سے متاثر کیا، یہ اُموی حکومت کا طغرائے امتیاز ہے جو مشرق ومغرب میں نظر آتا ہے۔ بخلاف اس کے مشرق میں عباسیوں نے اپنی خلافت قائم کرکے عجمی اقوام سے یوں تعلق پیدا کیا کہ خود ان کے اثرات سے بہت زیادہ متاثر ہوگئے، اور بڑی حد تک اسلامی افکار ونظریات عربی تہذیب وتمدن علوم وفنون پر عجمیت حملہ آور ہوگئی، مشرق ومغرب کی دونوں مسلم حکومتوں میں یہ فرق نمایاں طور پر ظاہر ہے، اس کی وجہ سے اندلس اور اس سے ملحقہ مغربی ممالک اٹلی اور فرانس وغیرہ کے باشندوں نے اسلامی اور عربی علوم وفنون حاصل کیے اور مغربی اقوام کو پہلی بار مشرقی علوم سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس تیزی سے عربی زبان نے ترقی کی کہ یورپ کے مسیحی پادریوں کو مجبوراً اپنی مذہبی کتابیں عربی زبان میں منتقل کرنی پڑیں۔

یورپ میں اسلامی علوم وفنون کی ابتداء

اندلس میں خلیفہ عبدالرحمٰن ثانی (سنہ ۲۰۶ھ تا سنہ ۲۳۸ھ) سے لے کر خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث (سنہ ۳۰۰ھ تا سنہ ۳۵۰ھ) اور اس کے بیٹے خلیفہ حکم بن عبدالرحمٰن تک کا زمانہ عربی اور اسلامی علوم وفنون کی ترقی کے اعتبار سے نہایت زریں دور گذرا ہے، اس دور میں وہاں مشرقی علوم وفنون نے خوب ترقی کی اور اسلامی تہذیب وثقافت نے مغربی اقوام کو اپنے اندر گویا جذب کر لیا، اس زمانہ میں یورپ کی قومیں جہالت کے اندھیرے میں تھیں اور کلیسائی سیاست نے مسیحی عالموں اور مسیحی حکمرانوں کی عظمت وسطوت کا تخت عوام کے فکر وذہن کی سطح پر بچھا رکھا تھا، اسی درمیان میں اندلس کی اسلامی درسگاہوں سے یورپ کو علم کی روشنی ملی، شہر طلیطلہ میں ایک درسگاہ جاری ہوئی جس میں عربی علوم وفنون کے لاطینی زبان میں ترجمہ کا شعبہ قائم ہوا، جس کا نگراں ریمونڈ نامی ایک پادری تھا، اندلس کے یہودیوں نے بھی اس اکاڈمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس ادارہ میں نہایت تیزی سے عربی کی بڑی بڑی کتابوں کے تراجم لاطینی زبان میں ہوئے جنہوں نے مغربی اقوام میں علم و فن کی روشنی بخشی، اور یورپ میں مشرقی علوم سے دلچسپی نئے رنگ اور نئی امنگ کے ساتھ بڑھنے لگی اور بارھویں صدی عیسوی سے لے کر تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی تک عربی کتابوں کے تراجم کا عظیم الشان ذخیرہ مغرب کو مل گیا، ڈاکٹر نکلارک نے شمار کر کے بتایا ہے کہ اس مدت میں تین سو بڑی بڑی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔

یورپ میں عقلی اور فکری دور کی ابتداء

اس دور میں جن کتابوں کے تراجم ہوئے ان میں زیادہ حصہ فلسفہ اور طبعی وعقلی علوم کا تھا، خاص طور سے زکریا رازی، ابوالقاسم زہراوی، ابن رشد، بوعلی ابن سینا جیسے فلاسفہ اور علوم عقلیہ وطبعیہ کے ماہرین کی کتابوں کے ترجمے ہوئے، نیز اہل یورپ نے مسلمانوں کے واسطہ سے اسی زمانہ میں جالینوس، بقراط، افلاطون، ارسطو، اور اقلیدس کی کتابوں سے استفادہ کیا جو یونانی زبان سے عربی زبان میں منتقل کی گئی تھیں اور پھر ان کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا تھا، بارھویں صدی

عیسوی کے بعد سے ان کتابوں میں سے اکثر یورپ کی درسگاہوں میں عقلی اور طبعی علوم کے نصاب میں داخل رہیں، اور پانچ چھ صدیوں تک یورپ کا تمام تر عقلی و طبعی علوم کا سرمایہ یہی کتابیں رہیں، بلکہ ان میں سے بعض کتابیں انیسویں صدی تک وہاں کی یونیورسٹیوں میں داخل درس رہیں، اس طرح اہل مغرب نے اندلس کے اسلامی علوم و فنون کی شمع سے روشنی پاکر کلیسائی جہالت سے نجات پائی اور مسلمانوں کے توسط سے قدیم یونانیوں کی کتابیں اور خود مسلمان عقلاء و فلاسفہ کی کتابیں بھی پڑھائیں، اگر اہل یورپ کو اندلس سے علم و فن کی روشنی نہ ملی ہوتی تو یقیناً وہ آج بھی دنیا کی جاہل ترین قوموں میں شمار کیے جاتے۔

ایک انگریز مورخ مسٹر ملر نے اپنی کتاب "تاریخ فلسفہ" میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "مغربی علوم کے اصلی ماخذ عربوں کے وہ مدارس ہیں جو اسپانیہ میں قائم تھے، اور یورپ کے ہر ملک کے طلبہ ان مدرسوں کی طرف دوڑتے تھے، اور ان میں جاکر علوم طبعیہ، علوم ریاضیہ، اور علوم ماوراء الطبعیہ حاصل کرتے تھے، اسی طرح جب عربوں نے جنوبی اٹلی پر قبضہ کیا تو وہ بھی یورپ میں اسلامی علوم کے داخلہ کا سبب ثابت ہوا۔"

یورپ کے اسلامی اندلس سے استفادہ کا عہد شباب

اسپانیہ کی مسلم درسگاہ سے جو پہلا مغربی عالم نکلا، وہ جیربرٹ نامی ایک فرانسیسی پادری تھا، اس نے فرانس میں لاہوتی علم حاصل کرکے اشبیلیہ کی راہ لی اور وہاں تحصیل علم کرکے قرطبہ گیا اور تین سال تک ریاضی اور فلکیات وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، پھر فرانس واپس آکر لوگوں کو ان عربی علوم سے واقف کرایا، جس پر اسے جادوگر اور کافر کا خطاب دیا گیا، مگر ۹۹۹ء میں اس کو نادانوں سے نجات ملی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا، اسی زمانہ میں قرطبہ کی یونیورسٹی سے شانجہ نامی ایک مغربی حکمران نے علوم مروجہ کی تکمیل کی، نیز اٹلی کے بعض لوگوں سے عربی زبان سیکھی اور اسے دنیا کی بہترین علمی و ادبی زبان کے نقطہ نظر سے حاصل کرکے مہارت حاصل کی، اس کے بعد یورپ میں کھل کر اسلامی علوم و فنون سے دلچسپی لی جانے لگی، چنانچہ ایک پادری نے مسیحی قوموں کو عربی زبان کی

ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ "اللہ جسے چاہتا ہے اسی کو حکمت و دانائی سے نوازتا ہے، اس نے لاطینی زبان کو حکمت نہیں دینا چاہا بلکہ عربی زبان بولنے والے عربوں کو دیا ہے اس لیے تم لوگ عربی زبان سیکھ کر حکمت حاصل کرو۔"

ان ابتدائی ادوار کے بعد یورپ والوں نے عربی زبان اور اسلامی علوم کو بلا جھجک پڑھا پڑھایا اور ان میں علمی اور فنی شعور کی جڑیں مضبوط ہوئیں ساتھ ہی وہاں کے جس ملک میں علم کا شوق پیدا ہوا وہاں کے طلبہ نے اندلس کی درسگاہوں کا رخ کیا اور واپس آکر اپنے ملک میں علم و حکمت کی بساط بچھائی

استشراق میں مذہبی اور سیاسی رجحان

ابتدا میں اہلِ یورپ کو اسلامیات اور مشرقیات سے دلچسپی خالص علمی اور فکری انداز میں تھی اور انھوں نے اسی انداز سے ان کو سیکھا سکھایا اور ان سے استفادہ کیا، مگر بعد میں مذہبی طبقہ نے اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی عداوت میں ان علوم سے کام لینا شروع کیا اور مسلمانوں کی کتابوں سے اپنے بنے بنائے ذہن کے مطابق اقتباسات لے کر اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا، اس سلسلہ میں پادریوں نے نہایت مکروہ کارنامہ چھوڑا ہے، جسے خود یورپ کا باخبر طبقہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، اور اپنے تنگ نظر اور جاہل مذہبی پیشواؤں کے ایسے علمی کارناموں پر شرم محسوس کرتا ہے، اس دور میں اسلامیات اور مشرقیات سے متعلق جو کتاب بھی مذہبی حلقہ سے سامنے آئی اس میں کھلے طور سے یہ خرابی پائی جاتی ہے، اس کے بعد یورپ میں وطنیت و قومیت کی ہوا چلی اور ملک گیری کی ہوس نے ان کو مشرقی ممالک خاص طور سے مسلم ممالک کی طرف متوجہ کیا، اس دور میں یورپ کی علمی و فکری سرگرمی نے دوسرا رنگ اختیار کیا اور مغربی علماء نے مشرقی علوم و فنون کے علاوہ مشرقی ممالک کے دوسرے ملکی اور قومی معاملات میں بھی دلچسپی لینی شروع کی، ان کے استعمار پسند حکمران اور ارباب سیاست ان ممالک میں تجارت، استعماریت اور ملک گیری کے حق میں سرگرمی دکھانے لگے اور مذہبی طبقہ کے لوگ جو پہلے ہی سے اسلام اور مسلمانوں کو اپنی مسیحیت کا مدِّ مقابل سمجھتے تھے.... مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت میں مشغول ہوئے، ان ہی گوناگوں نظریات کے پیش نظر مغرب نے مشرق سے خصوصی تعلق پیدا کیا، یہاں کے ملکی و جغرافیائی حالات دریافت کیے، یہاں کی قوموں کے

مذہبی، دینی، تہذیبی، تمدنی، فکری اور معاشرتی رجحانات کا پتہ چلایا، اس سلسلہ میں یہاں کے ہمہ اقسام کے علوم وفنون حاصل کیے، اپنے یہاں مشرقی علوم وفنون کو زندہ کیا، کتابیں شایع کیں، ان کے ترجمے کیے۔ اور عربی زبان کے علاوہ فارسی، اردو، ہندی سنسکرت اور مشرقی دنیا کی دوسری زبانیں حاصل کیں۔ اس طرح یورپ کے مستشرقین نے استشراق کو ایک مستقل فن کی حیثیت دے دی اور اس کے ماتحت انہوں نے مشرق کی زندہ اور مردہ زبانوں کو حاصل کیا اور ان کے اسلوب وادب کی نزاکتوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔

عربی کتابوں کی طباعت واشاعت

اس مقصد کے لیے اہلِ مغرب نے اپنے یہاں عربی کے پریس جاری کیے، اور عربی زبان کی بہت سی نادر و نایاب کتابیں شایع کیں، اس سلسلہ میں سب سے پہلے انھوں نے المجموع المبارک، ابن العمید مسکین کی تاریخ، ابن العربی کی تاریخ الاول، سعید بن بطریق کی نظم الجواہر، اور اس کے بعد تاریخ ابوالفداء اور مقامات حریری چھاپ کر شایع کی، ساتھ ہی اسلامی اور مشرقی علوم وفنون کے لیے خاص خاص کتب خانے قائم کیے اور دنیا بھر سے نادر و نایاب قلمی کتابیں بڑی بڑی قیمت دے کر حاصل کیں، انیسویں صدی کی ابتدا میں یورپ کے مختلف کتب خانوں میں عربی زبان کی ڈھائی لاکھ سے زیادہ مطبوعہ اور مخطوطہ کتابیں لیڈن گراڈ، پیرس، برلن، لندن، آکسفورڈ اٹلی اور اسکوریال (اسپین) وغیرہ میں موجود تھیں، نیز اہلِ مغرب نے اس مقصد کے لیے بہت سی علمی اکاڈمیاں قائم کیں اور علمی مجلسیں بنائیں جن میں عربی کتابوں کی نشر واشاعت کا کام ہوتا تھا، اس سلسلہ کی سب سے قدیم اکاڈمی ۱۷۸۱ء میں جاوا کے دارالسلطنت میں قائم ہوئی پھر ۱۷۸۴ء میں سرولیم جونس نے کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی اور ۱۷۸۸ء سے ۱۸۳۶ء تک اس کے سلسلہ کی بیس جلدوں میں کتابیں شایع ہوئیں۔ نیز اس سوسائٹی کی طرف سے ایک رسالہ ۱۸۳۲ء میں جاری ہوا، اسی زمانہ میں لندن میں شاہ انگلستان کی سرپرستی میں مشرقیات کے لیے ایک سوسائٹی قائم کی گئی جس میں بڑے بڑے فضلاء شامل تھے، ۱۸۲۰ء

میں فرانس کے مستشرقین نے اپنے یہاں عربی کتابوں کی طباعت واشاعت کے لیے ایک سوسائٹی قائم کی، اور اس کی طرف سے ایک رسالہ بھی جاری کیا اسی طرح امریکہ، روس، اٹلی، بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک وغیرہ کے مستشرقین نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے نقش قدم پر چل کر عربی علوم کی اکاڈمیاں اور سوسائٹیاں قائم کیں اور رسالے جاری کیے اور کتابیں شایع کیں۔

جدید طبقہ کے خوش آئند رجحانات

یورپ کے مستشرقین نے بڑی بڑی کانفرنسیں کیں اور اسلامیات و مشرقیات کے مختلف موضوعات پر داد تحقیق دی، مستشرقین کی پہلی عالمی کانفرنس ۱۸۷۲ء میں پیرس میں منعقد ہوئی پھر ۱۹۰۸ء میں بھی وہیں ہوئی، اور اس کا سلسلہ جاری ہے چنانچہ تیسرے سال اسکی سالانہ کانفرنس دہلی میں ہوئی تھی،

واقعہ یہ ہے کہ اہل یورپ نے دنیا بھر سے مخطوطات اور قلمی کتابوں کے ذخیرے جمع کیے اور نادر و نایاب کتابوں کو بہترین تعلیق و تحقیق کے ساتھ شایع کیا، ان میں مضامین، اسمار، مقامات وغیرہ کی الگ الگ فہرست مرتب کر کے لگائی۔ ان تمام حقایق کے اعتراف کے باوجود اس حقیقت کا بھی برملا اعتراف کرنا چاہیے کہ یورپ کا کوئی مستشرق کتنا ہی صاف ذہن اور کھلے دل کا نظر آئے، اس کے اندر اسلام دشمنی کا جرثومہ ضرور موجود ہوگا اور وہ اپنی بظاہر غیر جانبدارانہ وغیر متعصبانہ تحقیق میں کہیں نہ کہیں اسلام کے خلاف بات ضرور کریگا۔ اور یہ مرض جو ان کے پادریوں سے ورثہ میں ملا ہے اب تک ختم نہیں ہوا ہے، ان کی مخفی سے مخفی تر دسیسہ کاریوں کو معلوم کرنے کے لیے مرحوم ڈاکٹر مصطفےٰ سباعیؒ کی کتاب "السنة ومکانتها فی التشریع الاسلامی" کا مطالعہ کافی ہے، اسی لیے اب خود یورپ اور امریکہ کا سنجیدہ طبقہ اپنے پادریوں، مورخوں اور محققوں کی کتابوں سے اسلام کو نہیں سمجھنا چاہتا ہے بلکہ مسلمان فضلار اور عربی زبان سے براہ راست اسلام فہمی کی کوشش کر رہا ہے حتیٰ کہ اسپین کی یونیورسٹیوں میں دراسات اسلامیہ کے مستقل شعبے قائم کیے ہیں جن میں عرب علمار و فضلا درس دیتے ہیں حالانکہ اسلام دشمنی میں شاید کوئی ملک مجموعی حیثیت سے آج کے اندلس سے آگے ہو مگر اب وہاں وطنیت و قومیت کے نام ہی سے سہی اندلسی علمار کی عربی

کتابوں کی اشاعت اور ان کی یادگار قائم کرنے کا سلسلہ جاری ہوگیا ہے۔ اس سلسلہ میں یورپ وغیرہ میں یہ رجحان بھی کام کر رہا ہے کہ اسلام کو اس کے قدیم ترین ماخذوں سے سمجھنا چاہیے اور ان قدیم اسلامی مدوّنات کا مطالعہ کرنا چاہیے جو احوال وظروف کے اثرات سے پاک تھیں اور جن کے مصنفین اسلامی روح کے سمجھنے میں زیادہ کامیاب تھے، شاید یہی وجہ ہے کہ ادھر پچھلے پچیس سالوں میں حدیث وفقہ پر قدما کی جس قدر کتابیں شایع ہوئی ہیں اس سے پہلے شایع نہیں ہوئی تھیں اور یورپ و امریکہ کے دانشوروں میں ان کی کھپت بھی زیادہ ہوئی ہے پھر مسلمانوں کا علمی طبقہ بھی علم وتحقیق کی راہ میں اپنے طور پر یہ کام کر رہا ہے، اور اپنے قدیم ترین دینی وعلمی سرمایوں کو اچھے انداز میں پیش کرنے لگا ہے۔

عربی طباعت اور عربی ٹائپ کے مطابع

اس سلسلہ میں عربی مطبع اور پریس کی تاریخ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ہم مختصر طور سے اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں، ٹائپ کے ذریعہ طباعت کی ایجاد ایک جرمن نے ۱۴۴۰ء میں کی تھی، اس کو عربی تلفظ میں "یحنا جو تمبرج" کہتے ہیں اس کے بعد ایک مدت تک یورپ میں پریس کی مدد سے علوم وفنون کو ترقی ہوتی رہی، اور عربی زبان کی سب سے پہلی کتاب ۱۵۱۴ء میں چھاپی گئی اس کے بعد نزہۃ المشتاق ادریسی، قانون بوعلی ابن سینا، تحریر اصول اقلیدس، وغیرہ یورپ کے عربی مطابع سے چھپ کر شایع ہوئیں، اس کے بعد مشرقی دنیا میں طباعت کا فن سلطنت ترکیہ عثمانیہ کی راہ سے ۱۴۹۰ء میں داخل ہوا، اور آستانہ میں ایک یہودی عالم نے اس سال پریس قائم کر کے کئی علمی اور مذہبی کتابیں چھاپیں، مگر یہاں اب تک چھپائی کا کام رومن رسم الخط میں ہوتا تھا، اور ۱۷۲۸ء میں عربی حروف کی ابتدا ہوئی اور عربی طباعت کا پریس جاری ہوا، اس زمانہ میں عربی حروف کا سب سے مشہور پریس آستانہ کے پریسوں میں مطبعہ جوائب تھا، جو احمد فارس شدیاق مرحوم کی ملکیت میں تھا، اس مطبع میں مختلف علوم وفنون کی امہات کتب چھاپی گئیں اور یہ ترکی کا مشہور مطبع تھا۔

عرب ممالک میں عربی حروف میں طباعت کی ابتداء لبنان میں ہوئی، اور مسیحی پادریوں نے سترھویں صدی کے شروع میں بیروت میں پہلا پریس قائم کیا، اس کے بعد ہی ان کی طرف سے ۱۸۴۸ء میں مطبع کاثولیکیہ جاری ہوا، جو کیتھولک پادریوں کے قبضہ میں تھا، اس پریس نے عربی کی بہت سی قدیم اور نادر کتابوں کو شایع کیا جن کا تعلق عیسائی شعراء و ادباء اور مصنفین سے تھا، اس کے علاوہ بھی بعض علمی و ادبی اور لغوی کتابیں یہاں سے چھپ کر شایع ہوئیں، اس کے بعد مصر میں ۱۷۹۸ء میں نپولین کے ہاتھوں چھپائی کا کام جاری ہوا، اس نے سرکاری فرامین و احکام کو عربی زبان میں چھاپنے کے لیے مطبع اہلیہ کے نام سے پریس قائم کیا اور ۱۸۲۱ء میں محمد علی پاشا نے مطبع اہلیہ کی جگہ مطبع بولاق جاری کر کے اس کا نگراں ایک شامی ماہر طباعت نقولا مسابکی کو بنایا، مطبع بولاق کے لیے خاص طور سے مختلف سائز کے بہترین حروف ڈھالے گئے، دوسری بار عربی حروف کی ڈھلائی مصر کے مشہور خطاط جعفر بیگ کی کتابت سے ہوئی اور مصر میں اب تک ان ہی کے اصول پر حروف ڈھال کر استعمال کیے جاتے ہیں، عربی ٹائپ کے جوڑ ان ہی کے قائم کردہ ہیں۔ مطبع بولاق سے مختلف علوم و فنون کی تقریباً تین سو کتابیں طبع ہوئیں اور اس کے شعبہ القسم الادبی سے ادب عربی کی امہات کتب چھاپی گئیں، بعد میں اس مطبع میں سرکاری کاغذات اور درسی کتابیں چھپنے لگیں، اس کے بعد مصر میں بہت سے مطابع قائم ہوئے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے پرتگیزیوں نے جنوبی ہند میں ٹائپ پریس جاری کیا اور تامل اور ملیالم زبانوں میں اپنی مذہبی کتابیں چھاپیں، کلکتہ میں ۱۷۸۱ء میں ٹائپ پریس کا اجراء ہوا جس میں بہت سی عربی کتابیں چھاپی گئیں، بمبئی میں سنہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں ایک ٹائپ پریس تھا جس میں شیخ عبد الجلیل بن یاسین بصری متوفی ۱۲۷۰ھ کا دیوان ۲۸۰ صفحات میں چھاپا گیا۔ اس کے بعد بمبئی میں کئی پریس جاری ہوئے مگر وہ بہت معمولی قسم کے تھے اور زیادہ دنوں تک نہیں چل سکے، اس سلسلہ میں یہ عجیب بات ہے کہ گذشتہ صدی میں ایک ہندوستانی منشی ممتاز علی صاحب میرٹھی ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف

لے گئے، تو وہ اپنے ساتھ اپنا مطبع مجتبائی لائے اور ۱۲۹۸ھ میں اس میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی کتاب جہاد اکبر چھاپی۔ اس کے بعد حجاز میں سب سے پہلا ٹائپ پریس مطبع حجازیہ کے نام سے ۱۳۰۱ھ میں حکومت ترکی نے قائم کیا جو سرکاری مطبع تھا (تذکرہ شعراء حجاز اردو ص۸، ص۹) زمانہ ہوا مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے مطبعہ خیریہ کے نام سے ٹائپ پریس جاری کیا تھا، جس میں حدیث کی مشہور کتاب، جمع الفوائد پہلی بار چھپ کر شائع ہوئی، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے اپنے ابتدائی دور میں ٹائپ پریس جاری کر کے اسی میں اپنی کتابیں چھاپیں اور اب وہاں مستقل پریس جاری ہے۔ اِدھر چند سالوں سے ہندوستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں عربی ٹائپ کے چھوٹے چھوٹے مطابع قائم ہو رہے ہیں اور اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کام کرتے ہیں۔

(۲۰)

ہنگری کے مستشرقین اور ان کے علمی کارنامے

ذیل کے مقالے سے جہاں یہ معلوم ہوگا کہ ہنگری کے مستشرقین کہاں تک مشرقی علوم و فنون اور اسلامیات سے دلچسپی رکھتے ہیں اور انھوں نے اس سلسلہ میں کیا کیا علمی کارنامے انجام دیئے ہیں وہاں یہ بھی معلوم ہوگا کہ دنیا کی قوموں میں کس طرح آبائی وطن اور وہاں کی آب و ہوا کے اثرات نسلاً بعد نسلٍ ہزارہا سال تک علم و فکر پر چھائے رہتے ہیں اور انقلاب و تغیر کے ساتھ ساتھ وطن و نسل کی خوبو چلتی رہتی ہے۔

ہنگری وسط یورپ میں چیکوسلاویہ، آسٹریا، یوگوسلاویہ، رومانیہ اور سوویٹ یونین کے مابین ایک آزاد ریاست ہے جس کا رقبہ ۹۳۰،۷۳ کلومیٹر اور آبادی ۱۰،۰۰۰،۰۰۰ کے لگ بھگ ہے۔ اس کا دارالسلطنت بوڈاپسٹ ہے جس کی آبادی ۹۳۰،۰۰۰ ہے، یہ بہت بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز ہے، پہلے اس کا دارالسلطنت صرف بوڈا نامی شہر تھا، مگر جب ۱۵۴۱ء میں ترکی سلطان سلیمان قانونی نے ہنگری پر قبضہ کیا تو پسٹ نامی شہر کو بھی بوڈا کے ساتھ ملا دیا، اس وقت سے بوڈاپسٹ ایک شہر بن کر دارالسلطنت بن گیا۔ ان دونوں شہروں کے درمیان دریائے ڈونہ (DANUDE) بہتا ہے۔ ہنگری بڑا سرسبز و شاداب اور زراعتی ملک ہے، صنعت و حرفت کے اعتبار سے بھی یہ ملک یورپ کے دوسرے ملکوں سے پیچھے نہیں ہے۔

ہنگری کے باشندوں کا مشرقی ممالک اور مشرقی علوم سے قدیم تعلق

ہنگری کو عرب مورخ و جغرافیہ نویس عام طور سے مجر کہتے ہیں اور یہاں کی زبان کو مجری کے نام

سے یاد کرتے ہیں، یہاں کے باشندے نسلاً مشرقی ہیں، قدیم زمانہ میں ان کا مسکن ایران تھا اور شاہانِ ایران کے دور میں یہ لوگ بہت مہذب و متمدن تھے بعد میں یہ مغربی ترکستان کی طرف گئے اور ان کا تعلق ترکوں سے ہو گیا جس کی بنا پر ترکی کہلائے، ترکی حدود میں آنے کے بعد اس قوم کی شان و شوکت بہت بڑھ گئی، اور اس علاقہ کے لوگوں نے اس کے خلاف اقدام کیا جس کے نتیجہ میں اس قوم کا ایک حصہ یورپ چلا گیا اور ایک حصہ مشرقی ایشیا کی طرف پسپا ہو گیا۔ جو لوگ یورپ چلے گئے انھوں نے ہنگری کو اپنا مسکن بنایا اور ان میں سے اکثر نے نصرانی مذہب قبول کر کے ایک شاندار حکومت قائم کی۔ چونکہ یہ لوگ نسلاً و اصلاً مشرقی تھے اس لیے مغرب میں آباد ہو جانے اور وہاں پر اپنی حکومت قائم کرنے کے باوجود ان کو اپنے قدیم مشرقی علوم و فنون سے تعلق باقی رہا اور وہ اس کی تلاش و جستجو میں رہا کیے۔ سولھویں صدی میں سلاطینِ ترکی کے قبضہ کے بعد خصوصاً اٹھارھویں صدی میں ان لوگوں میں اپنے قدیم علوم و فنون کی تلاش زیادہ بڑھ گئی۔

جیسا کہ معلوم ہوا ہنگری میں آباد ہو جانے کے بعد اکثریت کا مذہب تو عیسائیت ہو گیا لیکن جو لوگ اسلام سے وابستہ رہے، ان کو مجری مورخ اسماعیلی بتاتے ہیں، یہ لوگ عام طور سے تجارت اور صرافے کا کاروبار کرتے تھے اور تیرھویں صدی تک اپنی اولاد کو حلب کے حنفی مدارس میں دینی اور فقہی تعلیم کے لیے بھیجتے تھے، صلیبیہ کے پانچویں حملے (۱۲۱۹ء تا ۱۲۲۱ء) جنگی اخراجات کے لیے مسیحی بادشاہ اندریا ثانی نے ان مجری مسلمانوں کو سکہ ڈھالنے کا حکم دیا تو انھوں نے اسلامی انداز پر سکہ تیار کیا جس پر "لا الٰہ الا اللہ" لکھا تھا۔

ایک زمانہ میں یورپ کو عثمانیوں سے سخت خطرہ لاحق ہوا اور ان سے جنگ کرنے کے لیے ہنگری کے بادشاہ سگسمند کی قیادت میں ہنگری، پولونیا، فرانس اور جرمنی کے جوانوں کی فوج تیار کی گئی، جسے سلطان بایزید عثمانی نے ۱۳۹۶ء میں نیقوپولیس کی جنگ

ہیں مغلوب کیا، اس کے بعد ۱۵۲۶ء میں عثمانیوں نے واقعہ موہاج میں ہنگری فوج کو شکست دی اور ۱۵۴۱ء میں اس کے دارالسلطنت پر قبضہ کر لیا تو وہاں کا حکمراں خاندان و ڈینیوب کے مغرب میں پناہ گزین ہو گیا، اس واقعہ کے بعد ہنگری کے باشندے عام طور سے سلاطین عثمانیہ کے طرف دار بن گئے، اور ٹرانسلوانیا کی حکومت نے عثمانیوں سے معاہدہ کر لیا، یہاں تک کہ عثمانیوں اور ہنگری کے مغلوب حکمراں خاندان کے مابین جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں بڑی تباہی آئی۔

ان تمام ادوار میں مجریوں (ہنگری والوں) نے اپنے نسلی ورثہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش جاری رکھی اور جنگ و پیکار کے زمانہ میں بھی وہ اپنے آبائی علوم وفنون سے غافل نہیں ہوئے ان کے گرجاؤں میں مشرقی علوم کے نادر مخطوطات محفوظ رہے، خاص طور سے باکونی بیل (BAKONY BEL) کا گرجا ان کا ثقافتی و علمی مرکز رہا، جہاں ان کے لاطینی مخطوطات نوّے جلدوں میں موجود تھے، نیز مجریوں نے ان ایام میں مشرقی غنا، عروض اور قصص و روایات کو مجری ادب میں منتقل کیا، اس زمانہ میں مشرقی علوم سے زیادہ متاثر ہونے والوں میں بالینٹ صف اوّل کا عالم تھا۔

عثمانی سلاطین نے مجر پر ڈیڑھ سو سال تک حکومت کی اور بوڈا کے ساتھ پیسٹ کو بھی اس کا دارالسلطنت بنایا، چنانچہ ۱۸۷۳ء سے آج تک بوڈاپیسٹ ہنگری کا دارالسلطنت ہے، اس درمیان میں مجریوں نے خاص طور سے اپنے آبائی ذہن و فکر والوں کی حکمرانی سے فائدہ اٹھا کر ترکی اور عربی زبانیں سیکھیں، اور ترکی حکومت میں کام کیا، اس وقت مجریوں میں استشراق اور مشرقی علوم سے نیا ذوق و شوق پیدا ہوا، اور ترکی حکومت کے سرکاری آفسوں کے کارندوں اور منشیوں میں مستشرقین پیدا ہونے شروع ہو گئے، ان ہی میں فیض روشنیاسی نامی ایک سرکاری عہدیدار نے مجری زبان میں کلیلہ دمنہ کا ترجمہ کیا، ہنگری پر ترکی حکومت کی خیر و برکت کا یہ پہلا علمی و فکری ظہور تھا جو اس زمانہ میں ترجمہ کی شکل میں

ظاہر ہوا، ترکی حکومت کا یہ علمی وفکری پودا ہنگری کے اہلِ علم میں بڑھتا رہا اور مشرقیات سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی رہی، یہاں تک کہ وہاں آزادی کی لہر آئی اور ساتھ ہی عام طور سے دنیا میں استشراق کا ذوق پیدا ہوا جس سے وہاں کے باشندوں میں علم و تحقیق کا ذوق بڑھا، چنانچہ وہاں کے طلبہ ہالینڈ، جرمنی، آسٹریا کی یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں کی خاص طور سے عبرانی زبان کی تعلیم کے لیے جانے لگے، ان میں مذہبی طلبہ بھی تھے جنھوں نے ترکی اور عربی کو اپنا موضوع قرار دیا اور وہ ان زبانوں میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ ان کی تعداد کم ہونے کے باوجود ان کو علمی شہرت ملی۔

درسگاہیں اور مجلات

ہنگری میں مشرقی علوم وفنون کے کئی مرکز ہیں، جن میں ٹرانسلوانیا کا پروٹسٹنٹ کالج بوڈاپسٹ یونیورسٹی اور اس کے معہد مشرقی، معہد وسط ایشیا اور معہد یہودی جن میں سامی زبانوں کی بھی تعلیم ہوتی ہے بہت مشہور مرکز ہیں، مشرقی علوم کے کتب خانوں میں ہنگری کی علمی اکیڈمی کی لائبریری بہت مشہور ہے، اسی طرح وہاں پر مشرقیات کے میوزیم اور عجائب خانے بھی ہیں۔ ایشیائی فن کا میوزیم جسے بوڈاپسٹ میں ۱۹۱۹ء میں فرنسیس ہوپ (FR. HOPP) نے قائم کیا تھا، اس کا پہلا محافظ و نگراں زولطان طاقاج (Z. TAHACJ) تھا اس نے اس کی ترتیب دی اور اس کی فہرست تیار کی، یہ فاضل آج تک بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہنگری چینی اور جاپانی فنون کا استاذ ہے اس کی پیدائش ۱۸۸۱ء میں ہوئی۔

نیز اس میوزیم سے ارون بقطالی (E. BAKLAY) کا خصوصی تعلق ہے، یہ فاضل ہندی فن اور ہندوستان کی زبانوں کا متخصص ہے، اس کی پیدائش ۱۸۹۰ء میں ہوئی۔

اس میوزیم کے موجودہ نگراں ڈاکٹر ٹیبور حورات (T. HORVATH) ہیں جنھوں نے کئی سال جاپان میں گزارے ہیں اور ایشیائی فن پر انگریزی میں ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی ہے۔

مشرقیات پر بحث کرنے والے مجلدات ورسائل میں (۱) مجلہ شرقیہ کلی سملہ (REVUE ORIENTALE) (۲) کوروشی گوما (REVUE KOROSIG SONA) (۳) اور حجری زبان کا سالنامہ (ACTA ORIENTALIA) جو ہنگری کی علمی اکیڈمی کی طرف سے شائع ہوتا ہے، یہ رسالے مستشرقین کے مباحث کو شائع کرتے ہیں اور ان کا خصوصی موضوع استشراق ہے

ہنگری کے قدیم وجدید مستشرقین

(۱) کانٹ کاروی ریوبیسکی (CTA. REVIC3KY. K.) (۱۷۷۶ء، ۱۷۹۳ء) اس نے وائنا کی درسگاہ میں تعلیم پائی جسے ملکہ ماریہ تریزہ نے مشرقی ممالک میں اپنے سفرا اور مندوبین کی تعلیم کے لیے قائم کیا تھا۔ کاروی کو آسٹریا کے بادشاہ نے فارسو دیہ میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا، پھر لندن بھیجا جہاں کاروی اور سر ولیم جونس کے درمیان تعلقات نہایت خوشگوار ہو گئے سر ولیم جونس بہت مشہور انگریز مستشرق تھا۔ کاروی نے ۱۷۷۱ء میں حافظ شیرازی کے فارسی دیوان کا لاطینی ترجمہ شائع کیا، بعد میں اس ترجمہ کو بنیاد قرار دے کر ۱۷۷۴ء میں انگریز مستشرق انشاء سون نے دیوان حافظ کا ترجمہ کیا، نیز کاروی کے ترجمہ کی بنیاد پر ۱۷۸۲ء میں فریڈل نے اس کا ترجمہ جرمنی زبان میں شائع کیا۔

(۲) یانوش اوری (URI J) (۱۷۲۴ء، ۱۷۹۶ء) یہ ناگو کوروش میں پیدا ہوا، ۱۷۵۳ء میں ہالینڈ کی ہاؤرویگ یونیورسٹی سے فراغت حاصل کی اور اپنے دور میں مشرقی علوم میں سب سے آگے گیا، ۱۷۵۶ء سے ۱۷۶۰ء تک لیڈن میں مقیم رہا۔ اور اسی جگہ سے ۱۷۶۱ء میں امام بوصیری کا قصیدہ بردہ شائع کیا، یورپ میں اس قصیدہ کو نہایت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، اور دس سال بعد ۱۷۷۱ء میں اس کا دوسرا اڈیشن شائع کرنا پڑا، نیز اوری نے قصیدہ نسفی کا لاطینی ترجمہ کیا، ۱۷۶۶ء میں اس کا تعلق آکسفورڈ یونیورسٹی سے ہو گیا جہاں اس نے ۱۷۸۷ء میں کتب خانہ بودلیہ کے مشرقی مخطوطات کی فہرست مرتب کی، اس کتب خانہ میں عربی، عبرانی، کلدانی، سریانی، قبطی، ترکی اور فارسی زبانوں کے مخطوطات تھے بعد

اس فہرست کی تکمیل نیکول اور بوازی نے کی' نیز اوری آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں
کا مقرر کیا گیا، اس کی علمی عظمت کا یہ حال تھا کہ جب وہ مرا تو قدیس میٹیل کے جوار میں
کیا گیا۔

(۳) شاندور کوارش گوما (CSOMA, A. K.) (۱۷۸۴ء ۱۸۴۲ء) اس نے پروٹسٹنٹ
میں عربی، ترکی، فارسی اور عبرانی زبانوں کی تعلیم حاصل کی اور ان کی تکمیل انجورن سے کی، اس
ہنگریوں کے قدیم اور اصل مسکن کی تحقیق و تلاش میں پیدل سفر شروع کیا، ترکی، ایران اور
افغانستان ہوتا ہوا تبت پہونچا جہاں سات سال رہ کر ایک بودھی درسگاہ میں تبتی زبان
سیکھی اور ۱۸۳۴ء میں انگریزی زبان میں تبتی زبان کی نہایت مستند لغت تیار کی جو بعد میں
اس زبان کے لیے مرجع بنی۔ تبت کے بعد ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں مدتوں مقیم رہا۔
۱۸۴۲ء میں پھر تبت کے سفر کے ارادہ سے نکلا، مگر راستہ میں موت واقع ہوگئی اور دارجلنگ
کے انگریزوں کے قبرستان میں دفن ہوا۔

(۴) جارج کانبورسکی (HANYURSZKY, G.) (۱۸۱۹ء) اس نے وائنا یونیورسٹی
میں تعلیم پائی اور وہیں سے ۱۸۸۳ء میں عربی نحو کا مشہور متن اجرومیہ مجری زبان میں شرح
کے ساتھ شائع کیا۔

(۵) کوفمان (KAUFMANN, D.) (۱۸۵۲ء ۱۸۹۹ء) بریسلاؤ یونیورسٹی میں
تعلیم حاصل کی اور بوڈاپسٹ کے معہد علمی یہودی میں مدرس بنایا گیا، کوفمان نے اپنا قیمتی کتب
خانہ علمی اکیڈمی مجر پر وقف کیا، اس نے بوڈاپسٹ سے ۱۸۹۹ء میں سلموں بن جبرول
کے علمی و تحقیقی کارناموں کو شائع کیا اور خود جو علمی اور تحقیقی کارنامے چھوڑے جن کی اشاعت
بعد میں فرانکفورٹ سے ۱۹۱۰ء میں تین جلدوں میں کی گئی۔

(۶) کانٹ غیزاقوون (CTE. KUUN, G.) (۱۸۳۷ء ۱۹۰۵ء) نخوتنفن یونیورسٹی
میں تعلیم حاصل کی اور مجر کی قدیم تاریخ کے عربی اور فارسی مآخذ و مصادر کا خصوصی طور سے

پتہ چلایا۔ طبی تصنیفات وکتب پر ایک جامع کتاب لکھی، نیز ترکوں کے ادب ولغت پر متعدد مقالات لکھے۔

(۷) وہ جیف توری (THURY) (۱۸۶۱ء۔۱۹۰۶ء) بوڈاپسٹ اور لیپزگ یونیورسٹیوں سے فراغت حاصل کی، اور وسط ایشیا کی زبانوں اور ترکی لب ولہجہ پر داز کے طرز پر کتاب لکھی۔

(۸) ولہلم باخر (BACHER, W.) (۱۸۵۰ء۔۱۹۱۳ء) بران یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور بوڈاپسٹ یونیورسٹی اور اس سے متعلق معہد علمی یہودی میں سامی زبانوں کے استاد کی حیثیت سے مقرر کیا گیا، باخر نے لیپزگ سے ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۴ء کی درمیانی مدت میں موسیٰ بن میمون پر ایک کتاب دو جلدوں میں شائع کی اور ۱۹۰۹ء میں "سامی زبانوں کے تاریخی ادوار" کے نام سے کتاب لکھی، نیز اس نے "تاریخ یمن" اور "بلادِ عرب میں یہودی مستعمرات" نامی کتابیں لکھیں۔

(۹) آمن وامبیری (YAMBERY, A.) (۱۸۳۲ء۔۱۹۱۳ء) اس نے بغیر استاد کے مشرقی زبانیں سیکھیں، ایک زمانہ تک ترکی میں رہ کر مجریوں کے اصل مسکن کے آثار وعلامات پر بحث کی، پھر درویشانہ صورت اختیار کر کے ایران کے شہروں سے خیوا تک سفر کیا نیز سمرقند اور بخارا گیا، واپسی پر بوڈاپسٹ یونیورسٹی کے معہد علمی میں ترکی اور فارسی زبانوں کا پروفیسر مقرر کیا گیا اور ایسی کتابیں لکھیں جن سے وسط ایشیا کی قدیم زبانوں پر نئی روشنی پڑتی ہے۔

(۱۰) کموشکو یا وری (KAMOSKO, M.) (۱۸۷۶ء۔۱۹۱۳ء) مشہور مستشرق غولد صیہر سے بوڈاپسٹ کے معہد میں تعلیم حاصل کی اور استاذ کے بعد ان کی جگہ سنبھالی، کموشکو نے نصوص سریانیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو اپنے موضوع پر نہایت قیمتی کتاب ہے اس کی کئی شرحیں ہیں۔

(۱۱) پیٹر ہاٹالا (HATALA, P.) (م ۱۹۱۵ء) لیپزگ یونیورسٹی میں تعلیم پائی

...ک کا علمی سفر کیا، واپسی پر سامی زبانوں کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا، ہاٹالا نے ۱۸۷۶ء
...عربی نحو کا مشہور متن اجرومیہ اپنے اہتمام سے شائع کیا۔ اور اس کے ساتھ سامی
...نوں کی باریکیوں کے مباحث بھی شامل کیے۔

(۱۲) سالمون اسنرٹرن د.ی د (OSZTERN) (پیدائش ۱۸۶۰ء) بوڈاپسٹ یونیورسٹی
...تعلیم پائی، اسلامی تاریخ اور اسلامی فقہ کے مباحث میں خصوصی شہرت پائی، اسلامی
...یخ کے اجتماعی نظریات پر بہت کچھ لکھا، اسنرٹرن نے مجری زبان کے علاوہ کئی اجنبی
...نوں میں کتابیں لکھیں، قرآن حکیم میں اخلاق کی آواز اور قرآن حکیم میں جہاد اور شریعت
...ادائیگی کے موضوعات پر کتابیں اور مقالات لکھے۔

(۱۳) غولدصیہر (۶۰ رہ GOLDZIER) بوڈاپسٹ لیپزیک اور برلن کی یونیورسٹیوں
...ان کے بڑے بڑے اساتذہ سے سامی زبانیں حاصل کیں، جب ان کی علمی شہرت زیادہ
...ی تو ۱۸۷۳ء میں ہنگری کی حکومت نے شام کے سفر کی دعوت دی، شام میں ایک
...تک شیخ طاہر[۱] جزائری سے علمی تعلقات رہے، پھر وہاں فلسطین اور پھر مصر جانا ہوا

---

[۱] شیخ طاہر جزائری (۱۸۵۱ء، ۱۹۲۰ء) دمشق میں ۱۲۶۸ھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد
...محمد صالح سمعونی جزائری مالکی مسلک کے زبردست عالم و فقیہ تھے، الجزائر سے ہجرت کر کے
...آئے اور مالکیہ کے مفتی بنے۔

...شیخ طاہر جزائری نے شیخ عبدالرحمن بوشناقی اور شیخ عبدالغنی میدانی وغیرہ سے پڑھا
...علوم کے ساتھ لغت ... و ادب سے بڑا شغف تھا۔ سات سال کی عمر سے قلمی کتابوں
...پڑھنے اور جمع کرنے کا شوق تھا، ۱۲۹۵ھ میں مدحت پاشا کی گورنری کے زمانہ میں
...کے ابتدائی مدارس کے مفتش بنائے گئے، ۱۳۲۵ھ میں مصر چلے گئے اور وہیں
...یخ یا زیارت سے مشرف ہوئے اور پیرس میں مستشرقین کی (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مصر میں غولدصیہر نے جامع ازہر کے اساتذہ و شیوخ سے خصوصاً شیخ محمد عبدہ سے خوب
استفادہ کیا اور سامی لغات کے اصول پر بیش بہا معلومات حاصل کیں۔ نیز اسلامی
مسلمانوں کے علوم و فنون اور ان کی فکری حرکات پر بے نظیر تحقیقات کیں، جس کی وجہ
غولدصیہر کا مشاہیر مستشرقین میں شمار ہونے لگا، اور بڑے بڑے مستشرقین نے ان کی علمی
کا لوہا مانا اور وسعت علمی کے ساتھ ان کی بے تعصبی کا اقرار کیا، غولدصیہر بوڈاپسٹ
یونیورسٹی میں سامی زبانوں کے پروفیسر بنائے گئے، اور بہت سی علمی اکیڈمیوں کے
چنے گئے، چنانچہ مجمع علمی دمشق اور مجمع لغوی قاہرہ کے ممبر رہے، ایرڈین اور کیمبرج کی
نے ان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی، ۱۳۰۸ھ میں لندن کی مستشرقین کانفرنس
میں امام داؤد ظاہری کے مذہب پر علمی اور تحقیقی مقالہ پیش کیا، امام داؤد ظاہری اور ابن
حزم کی کتابیں جمع کی تھیں، اور ابن حزم کی کتاب الابطال کا ایک حصہ شائع بھی کیا

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) کانفرنس میں شرکت کی، ۱۳۲۸ھ میں دمشق واپس آئے تو المجمع العلمی کے
رکن اور دار الکتب الظاہریہ کے مدیر بنائے گئے، اس کتب خانہ کو آپ نے اپنے چند ہم
کی مدد سے قائم کیا تھا مگر مصر چلے جانے کی وجہ سے اس سے تعلق باقی نہیں رہا تھا، طاہر
عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے عالم تھے، ساتھ ہی فرانسیسی، سریانی، حبشی اور زردادی زبانوں
سے تھوڑے بہت واقف تھے۔ ۱۳۳۹ھ میں فوت ہوئے۔

بیسیوں کتابیں لکھیں جن میں الجواہر الکلامیہ فی بعقائد الاسلامیہ، قصص الانبیاء
تسہیل المجاز الی فن المعنی والالفاظ الارشاد البار الی طریق تعلیم الف بار، توجیہ النظر الی
علم الاثر، التبیان لبعض مباحث القرآن، التقریب الی اصول التبویب وغیرہ زیادہ
مشہور سامی ادیب و محقق علامہ محمد کرد علی نے شیخ طاہر جزائری کی شاگردی سے بڑا
پایا تھا، وہ ان کو ائمہ اصلاح میں شمار کرتے تھے اور شیخ المصلحین کہا کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں ہمبرگ کی مستشرقین کانفرنس میں "عربوں کے نزدیک علم المرایا" پر ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا، نیز اسلام سے متعلق بہت سے علمی مقالات ایشیا اور یورپ کے جرمنی، فرانسیسی، انگریزی، روسی، مجری، اور عربی زبانوں کے جرائد و مجلات میں شائع کیے، غولڈصیہر نے اپنی مشہور کتابیں، جرمنی، فرانسیسی، اور انگریزی زبانوں میں لکھیں، ان کے ذاتی کتب خانہ میں چھ ہزار ایسی کتابیں تھیں جن کا تعلق فقہ، فلسفہ، فنون، لغت اور ادب سے تھا، ان کتابوں پر غولڈصیہر نے نہایت قیمتی حواشی، استدراکات اور تحقیقات درج کی تھیں، ان کے علاوہ ہزاروں علمی و تحقیقی مجلات و کتب تھیں جن کو دنیا کے مستشرقین نے ہدیہ میں پیش کر کے ان کے علم و فن کا اعتراف کیا تھا، ان کے مرنے کے بعد اس کتب خانہ کو ان کے خاندان نے قدس کے مکتبہ عربیہ کو فروخت کر دیا، اس طرح غولڈصیہر کا یہ کتب خانہ اس کے لیے بنیاد بنا۔

استاذ غولڈصیہر نے مختلف موضوعات پر علمی اور تحقیقی آثار و متروکات چھوڑے اور اسلام، اسلامی فقہ، اور عربی ادب پر فرانسیسی جرمنی اور انگریزی زبانوں میں کتابیں لکھیں یہود انگریزی میں (لیبزیگ ۱۸۷۰ء) شیعہ کے آداب جدل جرمنی میں (لیبزیگ ۱۸۷۴ء) یہود کے اساطیر (لیبزیگ ۱۸۷۶ء) ۱۸۷۷ء میں اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اسلام جرمن زبان میں (بوڈاپسٹ ۱۸۸۱ء، نیز ہیڈلبرگ ۱۹۱۰ء) آج تک مستشرقین میں کسی نے اس موضوع پر ایسی کتاب نہیں لکھی، غولڈصیہر کی نگرانی میں ارن نے اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں اسلام میں عقیدہ اور شریعت کے نام سے کیا (پیرس ۱۸۹۰ء) اس کے بعد عربی میں اس کا ترجمہ ہوا، درس اسلام دو ضخیم جلدوں میں لکھی۔ (ہالہ ۱۸۸۵ء و ۱۸۹۰ء) "فقہ اسلامی پر فلسفیانہ بحث" جرمنی زبان میں دو جلدوں میں (۱۸۸۹ء) مشہور عربی شاعر حطیئہ کا دیوان عربی متن اور ترجمہ و تعلیق کے ساتھ شائع کیا (لیپزیگ ۱۸۹۳ء) نیز غولڈصیہر نے اپنے درست شیخ طاہر جزائری کی کتاب توجیہ النظر فی علم الاثر کو جرمن زبان میں منتقل کیا، اسی طرح سجستانی کی کتاب المعمرین کا ترجمہ کیا۔

کیا (لیڈن ۱۸۹۹ء) مرجیہ کے نزدیک عقائد و شرائع اور قدریہ و معتزلہ نامی کتابیں ۱۸۹۶ء میں شائع کیں، امام غزالی کی کتاب المستظہرین فی فضائح الباطنیہ و فضائل المستظہریہ کے ایک بڑے حصّہ کو ۸۱ صفحے کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا (لیڈن ۱۹۰۶ء) پھر اس کتاب کے بارے میں ۱۱۲ صفحات کی ایک بحث لکھی۔

نیز غولڈصیہر نے کئی قیمتی مقالات لکھے، ایک مقالہ میں اللہ تعالےٰ کے اسماء حسنیٰ کے بارے میں اسرائیلی تصریحات پر بحث کی، فرانسیسی زبان میں سامری اور اس کے سونے کے بچھڑے پر ایک رسالہ لکھا اور حسین بن منصور حلاج پر ایک رسالہ لکھا جس میں کتاب الطو اسین پر اچھوتے انداز میں بحث کی، یہ رسالہ ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔

(۱۴) شاندور کیجل (KEGEL ی د) بوڈاپیسٹ کے معہد میں استاد غولڈصیہر سے تعلیم حاصل کی اور ادب فارسی کے نوادر و عجائبات میں تخصص کیا، کیجل کے علمی کارناموں میں جدید ادب فارسی (بوڈاپیسٹ ۱۸۹۲ء) جلال الدین رومی، فارسی کی قومی شعر و شاعری (۱۸۹۹ء) اور امیر خسرو اور ان کے اشعار (بوداپیسٹ ۱۹۱۱ء) کتابیں ہیں۔

(۱۵) بوناٹ مونقاجی (MUNKACSI B.) (۱۸۶۰ء ۱۸۳۷ء) بوڈاپیسٹ یونیورسٹی میں مشرقی زبان کی تعلیم حاصل کی، پھر ہنگری کی علمی اکیڈمی کے مجلہ مشرقیہ کے مدیر تحریر ہوئے اور اس میں "فنلینڈ کی زبان کا تعلق ترکی اور تاتاری مصطلحات سے" کے موضوع پر نہایت کامیاب بحثیں لکھیں، اور مجری زبان میں قوقازی زبان کے مفردات کو جمع کیا۔

(۱۶) اوریل شٹین (SLEIN, AU. M.) (۱۸۶۲ء ۱۹۴۳ء) یہ شخص وسط ایشیا چین، ایران اور عراق کے آثار کا سب سے بڑا عالم مانا جاتا ہے اور اس کی کتابیں اب تک نئی دہلی کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔

(۱۷) ہللر (HELLER, B) (۱۸۷۳ء ۱۹۴۵ء) بوڈاپیسٹ یونیورسٹی میں تعلیم

پائی اور اسلامی اور یہودی علوم کو اپنا موضوع بنایا، اس نے غول صیہر کے ان باقی ماندہ علمی کارناموں کو شائع کیا جن کا تعلق اسلام اور یہودیت کے مباحث سے تھا اور رہ اب تک شائع نہ ہو سکے تھے، اس کا مقدمہ ماسینیون نے لکھا، یہ کتاب مجری، جرمنی، فرانسیسی، انگریزی، روسی، سویدی اور عربی زبانوں میں چھپی۔

(۱۸) ڈیلموس پرولی (D. V. E. L. PROHLE) (۱۸۷۱ء۔۱۹۴۶ء) اس نے ترکی، فارسی عبرانی اور عربی زبانوں کو حاصل کیا، اور ۱۹۲۳ء تک ڈیبرین یونیورسٹی میں پروفیسر رہا، پھر بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں آگیا، اس کی کتابوں میں "تاریخ ادب عثمانی" اور "تاریخ ادب جاپانی" زیادہ مشہور رہی۔ نیز اس نے ترکی زبان کے قواعد لکھے، جس میں قوقازیں ترکی لہجوں اور مشرقی ایشیا کی زبانوں کے قواعد میں ہم آہنگی پر بحث کی۔

(۱۹) ڈاکٹر عبدالکریم جیرمانوس (دیولی GERMANUS) (پیدائش ۱۸۸۴ء) آپ بوڈاپسٹ میں پیدا ہوئے، شروع ہی سے سامی زبانوں کا شوق تھا چنانچہ بوڈاپسٹ معہد کے دو بڑے اساتذہ وامبیری اور غول صیہری سے یہ زبانیں حاصل کیں اور انہی دونوں اساتذہ کی تعلیم و تربیت سے اسلامی اور مشرقی علوم و فنون کا ذوق پایا بوڈاپسٹ سے نکلنے کے بعد ۱۹۰۵ء تک استنبول اور روائنا کی یونیورسٹیوں میں مشرقیات کی تعلیم حاصل کرتے رہے، ۱۹۰۶ء میں ادب عثمانی پر جرمنی زبان میں کتاب لکھی نیز ترکی کی فتح کے بعد ہنگری کی یونیورسٹیوں کی تاریخ لکھی اور ایک مدت تک لندن کے برطانوی میوزیم میں رہ کر ترکی زبان کے قدیم نصوص کی تحقیق کی، ۱۹۱۲ء میں بوڈاپسٹ آئے اور اس کے معہد میں مشرقی زبانوں کے استاذ مقرر کئے گئے جہاں انھوں نے اسلامی فکر اور عربی و ترکی زبانوں کی تعلیم دی اور امم اسلامیہ کی تاریخ کو اپنا موضوع قرار دے کر ان کے قدیم تفسیات اور جدید اجتماعی نہضت کے مابین تعلقات پر بحث کی۔

ٹیگور نے آپ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی، آپ نے دعوت قبول کر کے

۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۲ء تک دہلی، لاہور، اور حیدر آباد کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دی، اسی زمانہ میں دہلی کی جامع مسجد میں اپنے اسلام کا اعلان کیا، اور ۱۹۳۰ء میں اسلام میں جدید تحریکات نامی کتاب شائع کی نیز ۱۹۳۱ء میں جدید ادب ترکی اور ۱۹۳۳ء میں " اسلامی تاریخ میں ترکوں کا زمانہ" شائع کی۔

ڈاکٹر صاحب قاہرہ بھی گئے جہاں جامع ازہر میں دقتِ نظر کے ساتھ اسلامی علوم کو حاصل کیا، پھر وہاں سے حرمین شریفین گئے اور حج وزیارت سے مشرف ہوئے اور اپنے حج کے احوال وکوائف " اللہ اکبر" نامی کتاب میں متعدد زبانوں میں شائع کئے۔

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک قاہرہ اور سعودی عرب میں رہ کر علمی تحقیقات کرتے رہے اور نتیجہ کے طور پر ادب عربی کی بلندیاں اور عربی زبان کی تراکیب نامی کتابیں شائع کیں ۱۹۵۵ء میں حکومت مصر کی دعوت پر چند ماہ قاہرہ اور اسکندریہ میں گذارنے کے لیے آئے نیز دمشق آئے تاکہ فکر عربی اور موجودہ ادبِ عربی اور ادبِ مجری پر لکچر دیں، اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں مشہور شاعر ابن الرومی اور اس کے افکار پر کتاب لکھی اور ۱۹۵۹ء میں ابن الرومی کے مجموعہ اشعار کا جرمن زبان میں ترجمہ شائع کیا، ۱۹۵۸ء میں عرب کے مشرقی علاقوں کا سفر کیا تاکہ عروبت کی تحریک، جدید عربی ادب اور موجودہ ادبار کے بارے میں معلومات فراہم کریں ۱۹۵۳ء میں اٹلی کی اکیڈمی کے اور ۱۹۵۶ء میں قاہرہ کی المجمع اللغوی کے ممبر منتخب کیے گئے۔

تقریباً دو سال ہوئے ڈاکٹر عبدالکریم صاحب دوبارہ ہندوستان تشریف لائے تھے، اور مختلف تعلیمی اداروں میں اسلامیات اور دوسرے عنوانات پر معلوماتی لکچر دئے الحمد للہ آپ بقید حیات ہیں اور علمی ودینی کاموں میں مشغول ہیں۔

(۲۰) غیولا نیمث (NEMETH, G.) (پیدائش ۱۸۹۰ء) بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ترکی علوم کی تحصیل کی اور اس میں ترکی تاریخ کے پروفیسر مقرر کیے گئے، نیمث کی تصنیفات

ہیں" عثمانی دورِ حکومت میں مجر کی تاریخ" ہے۔

(۲۱) دی شوموجی (SOMOGYI J. D. E.) (پیدائش ۱۸۹۹ء) بوڈاپسٹ میں پیدا ہوئے اور استاد غولدصیہر سے بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں سامی زبانوں کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس سے پڑھا اور اپنی علمی کاوش کو اسلامی تاریخ میں محدود کیا، اس میں اتنی ترقی کی کہ عرب مورخین کے ہم رنگ بن گئے، ۱۹۳۱ء میں امام ابن جوزی کی کتاب المنتظم کی تلاش و تحقیق میں لندن گئے۔ اس سے پہلے اس کی تکمیل کے لیے یورپ کے مختلف بلاد و امصار کا سفر کیا، اس کتاب کی بارہ جلدیں یورپ، قاہرہ اور قدس کے مختلف کتب خانوں میں بکھری پڑی ہیں " دائرۃ المعارف العثمانیہ" حیدرآباد میں بڑی تلاش و جستجو کے بعد ۱۳۵۷ھ سے ۱۳۵۹ھ تک اس کی پانچویں جلد سے دسویں جلد تک چھپ سکی نیز شوموجی نے اس سفر میں کمال الدین دمیری کی کتاب حیاۃ الحیوان کے ماخذ و مصادر کی تلاش کی، غولدصیہر نے اس کام کو شروع کیا تھا شوموجی فی الحال ولایات متحدہ امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں کام کرتے ہیں اور اسلام کی تمدنی تاریخ کے لکچرار ہیں۔

(۲۲) لاسلو راشونی (RASONYI L.) (پیدائش ۱۸۹۹ء) بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں تعلیم پائی، پھر ترکی کے علوم میں تخصص حاصل کیا اور انگورہ یونیورسٹی میں ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۲ء تک پروفیسر رہے، اس کے بعد ہنگری کے مجمع علمی کے مشرقی شعبہ کے ذمہ دار بنائے گئے، موصوف نے ترکی زبان کے اصول و قواعد پر متعدد مباحث لکھے ہیں۔

(۲۳) سیغموند تلغدی (TELEGDI Z.) (پیدائش ۱۹۰۹ء) بوڈاپسٹ، برسلاؤ اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں کی تعلیم حاصل کی، اور بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں فارسی زبان و ادب کے پروفیسر مقرر کئے گئے مجلہ ایشیا میں " فارسی ادب کا تعلق مشرقی زبانوں سے " کے موضوع پر سلسلہ بحث شروع کیا،

(۲۴) کاروی تسیو لیدی (K. CZEGLEDY) (پیدائش سنہ ۱۹۱۴ء) لیڈن اور پلواسٹ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی اور بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں سامی زبانوں کے پروفیسر بنائے گئے مجر کی قدیم تاریخ عربی زبان کی بحث پر ماہرین لغات کی تحقیقات میں حصہ لیا، موصوف نے ابن فضلان اور خوارزمی کے سفرناموں پر ایک رسالہ لکھا اور انگریزی زبان میں قدیم مجریوں کی تاریخ کے مباحث لکھے ہیں۔

(۲۱)

اسپین میں امام ابن حزمؒ کی نو سو سالہ یادگار تقریب

اسپین میں عربی و اسلامی علوم سے دلچسپی

آٹھ دس سال کی بات ہے کہ بمبئی کے ایک تاجرِ کتب کے یہاں "الکلیات" کے نام سے طب کی ایک کتاب دیکھنے میں آئی تھی جو اندلس کے ایک مشہور مسلمان فلسفی و طبیب کی تصنیف تھی، اس وقت مصنف کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ اسے اندلس کی سرکاری جمعیۃ الادب العربی نے بڑے اہتمام سے آرٹ پیپر پر قلمی نسخہ کا فوٹو لے کر شائع کیا تھا، تقریباً چار سو صفحات کی تھی؛ سرورق پر لکھا تھا کہ یہ کتاب حکومت اسپین کے صدر جنرل فرانکو کی زیر سرپرستی قائم شدہ جمعیت کی طرف سے شائع کی جا رہی ہے، اسی وقت یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وطنیت اور قومیت ہی کے نام سے سہی حکومتِ اسپین نے اسلامی علوم و فنون کی طرف کچھ توجہ تو کی، شاید آگے چل کر اس کے نتائج اچھے نکلیں۔

اس کے بعد تقریباً تین سال ہوئے بمبئی کے مدرسہ عربیہ کوئٹہ میں ایک دن مغرب بعد ایک اندلسی نوجوان مسلمان زید نامی سے ملاقات ہوئی۔ جو غالباً ہانگ کانگ سے واپس ہوتا ہوا ایک آدھ دن کے لیے بمبئی میں ٹھہر گیا تھا۔ یہ نوجوان اسپینی اور انگریزی زبان کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں جانتا تھا، ہم نے اپنے ایک مصری گریجویٹ دوست کے ذریعہ اس سے بات کی، اس نے بتایا کہ اسپین میں الجزائر اور مراکش کے کئی ہزار مسلمان مزدور اور عمال کی حیثیت سے مقیم ہیں، اور معمولی کام کرتے ہیں، وہاں پر ان مسلمانوں کی نہ کوئی تنظیم ہے نہ کوئی مسجد و مکتب ہے اور نہ ہی ان کا کوئی ترجمان اخبار یا رسالہ ہے۔ اسپین کے عیسائی

باشندے اپنے عقیدے میں بہت ہی سخت ہیں، حتیٰ کہ عیسائیوں کے دوسرے فرقوں کو بھی برداشت نہیں کرتے، اور نہ ہی ان کے ساتھ کسی قسم کی مذہبی رواداری اور رعایت برتتے ہیں جنرل فرانکو صدر مملکت کی خصوصی فوج میں بہت سے مسلمان شامل ہیں بلکہ ان کا افسر اعلیٰ ایک مسلمان فوجی ہے۔

چند دن ہوئے ایک کتاب "تتعلم الاسبانیۃ فی اسبوعین" ہاتھ لگی تھی، جس کے دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ اسپینی زبان عربی زبان سے اب تک بے حد متاثر ہے، تقریباً ہر مفرد لفظ کے شروع میں "ال" کا استعمال عام ہے اور بہت سے الفاظ عربی ہی کے ہیں جن کو اسپینی لب ولہجہ میں ڈھال لیا گیا ہے۔ اسی دوران میں طنجہ سے بین الاقوامی تولیت کے ختم ہونے کی بات آئی تو سب سے پہلے جنرل فرانکو نے بحق مغرب اقصٰی (مراکش) اس سے اپنی دست برداری ظاہر کی، جس سے جانبین میں اعتماد و تعلق کی خوشگوار فضا پیدا ہوئی، نیز مراکش اور الجزائر کی آزادی اور ذمہ دارانہ روش نے اسپین سے ان کے تعلقات کی نوعیت میں دوستانہ رنگ بھرا، اور ایک دوسرے سے قریب ہوئے، اس کے بعد اسپین میں کئی ایسے ادارے قائم ہوئے جن میں اسلامی اور عربی علوم و فنون پر ابحاث و تحقیقات ہو رہی ہیں چنانچہ (۱) معھد الاسبانی العربی للثقافۃ (۲) مدرسۃ الابحاث العربیہ میڈرڈ (۳) مدرسۃ الابحاث العربیۃ غرناطہ (۴) معھد الدراسات الاسلامیۃ میڈرڈ، وغیرہ کسی نہ کسی مقدار اور انداز میں کام کر رہے ہیں۔ جن میں عرب فضلاء و محققین بھی شامل ہیں، جیسے ڈاکٹر حسین مونس وکیل معہد دراسات عربیہ میڈرڈ، اور ڈاکٹر محمود علی مکی، وکیل معہد دراساتِ اسلامیہ میڈرڈ۔

ان ہی مذکورہ بالا عربی و اسلامی ابحاث و دراسات کے اداروں نے اس سال ۱۲ مئی ۱۹۶۳ء سے لے کر ۱۸ مئی تک مشہور اندلسی عالم امام ابن حزمؒ کا نوسو سالہ جشن منایا اور حکومت اسپین کی نگرانی میں یہ پورا ہفتہ اسی اندلسی امامِ اسلام کی یادگار منانے

میں گزرا۔

یادگاری جشن کی کیفیت

یہ جشن امام ابن حزمؒ کے وطن قرطبہ میں بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منایا گیا، اس میں بیس[۲] محققین و فضلاء نے امام ابن حزمؒ پر مقالات پیش کیے، جن میں چودہ[۴] مستشرقین اور چھ عرب فضلاء تھے، نیز اس جشن میں اسپین میں موجود تمام عرب ممالک کے سفراء اور مندوبین نے شرکت کی۔ اور اسپین کے مشہور و ماہر مصوّر و فنکار" امادیو رو یت" نے ابن حزم کی تصانیف کی روشنی میں ان کا خیالی مجسمہ تیار کیا، جسے بڑی شان و شوکت سے ۱۲ مئی کو باب العطارین (موجودہ باب اشبیلیہ) کے سامنے ایک چبوترے پر نصب کیا گیا، اس کی نقاب کشائی کے موقع پر اسپین کا سرکاری ترانہ سنایا گیا، پھر عربی قومی ترانہ گایا گیا اور مجسمہ کے قدموں پر پھول نچھاور کئے گئے، ۱۵ مئی کو امام ابن حزمؒ کے نام اور یادگار کی تختی کی نقاب کشائی کی گئی جسے ان کے مکان کی جگہ پر لگایا گیا ہے، اس یادگار تقریب کے موقع پر امام ابن حزمؒ کی زندگی سے متعلق قرطبہ کے مقامات کی تحقیق و تعیین بھی کی گئی۔ یہاں پر ان مقامات کی نشاندہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔

مختصر حالات

امام ابو محمد علی بن احمد سعید بن حزم قرطبی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ ۳۰ رمضان ۳۸۴ھ (۷ نومبر ۹۹۴ء) کو قرطبہ کے سب سے خوبصورت محلہ مُنیۃ المغیرہ میں پیدا ہوئے، اس محلہ کے چاروں طرف ہرے بھرے باغات تھے، اسے قرطبہ کے دسویں اموی خلیفہ ہشام المؤید کے چچا مغیرہ نے آباد کیا تھا، جب خلیفہ عبدالرحمٰن المستظہر کا دور آیا تو اس نے مغیرہ کو قتل کر دیا، اور اس کے آباد کردہ علاقہ میں وزراء، عمال اور سرکاری آدمیوں نے اپنے قصور و محلات تعمیر کرائے، چنانچہ امام ابن حزمؒ کے ایک خاندانی بزرگ اور خلیفہ وقت کے وزیر احمد بن حزم نے بھی مُنیۃ المغیرہ میں ایک محل تعمیر کیا۔ اسی میں امام ابن حزم پیدا ہوئے، نیز اسی علاقہ میں بنو شُہید، بنو زجالی، بنو طبنی، بنو بُرد، وغیرہ قبائل کے مکانات

تھے جن کے حالات اندلس کی اسلامی تاریخوں میں کثرت سے ملتے ہیں۔

یہ علاقہ موجودہ شہر قرطبہ کے شمالی حصہ میں واقع ہے آج کل اس محلہ کو "سان لورنزو" کہتے ہیں، اور تحقیق کے مطابق امام ابن حزم کا مکان اسی مقام پر تھا جہاں آج "سان لورنزو" کا گرجا واقع ہے خدا کی شانِ بے نیازی کا یہ منظر کتنا عبرت ناک ہے کہ جہاں پر قصر بنی حزم تھا وہاں پر صلیب و تثلیث کی عمارت کھڑی ہے۔

امام ابن حزم اپنے محلہ سے جامع قرطبہ میں درس و تدریس کے لیے آتے جاتے باب عبد الجبار سے گزرتے تھے، یہ عبد الجبار خلیفہ عبد الرحمٰن الناصر کی اولاد میں مغیرہ مذکور کا بھائی تھا جسے منصور بن ابی عامر نے قتل کر دیا تھا۔ ابن حزم باب عبد الجبار سے گزر کر تنگ راستوں سے ہوتے ہوئے محجۃ العظمیٰ تک جاتے تھے، یہ مقام موجودہ شہر قرطبہ کی سب سے بڑی سڑک میں آ گیا ہے۔ جو وادی کبیر کے پل کے سامنے سے شروع ہو کر انتہائی شمال میں باب یہوذ تک جاتی ہے۔

۴۱۴ھ (۱۰۲۳ء) میں ابن حزم کو خلیفہ عبد الرحمٰن المستظہر نے اپنا وزیر بنایا، اس لیے انھوں نے منیۃ المغیرہ میں واقع اپنے آبائی مکان کو چھوڑ کر شہر کے مغربی علاقہ میں بلاط مغیث میں سکونت اختیار کی، یہ محلہ حضرت طارق بن زیاد اور حضرت موسیٰ بن نصیر کے ایک فوجی افسر مغیث رومی کے نام سے منسوب تھا، اس محلہ سے دار الوزارۃ تک جانے کے لیے ابن حزم کو وادی کبیر کے قریب باب العطارین سے گزرنا پڑتا تھا جسے آج کل باب اشبیلیہ کہتے ہیں، یہ شہر پناہ کے قریب واقع ہے، کئی بار اس دروازہ کی اصلاح و مرمت ہو چکی ہے اسی دروازہ کے سامنے امام ابن حزمؒ کا اسٹیچو بلند چبوترے پر نصب کیا گیا ہے۔ چونکہ عبد الرحمٰن المستظہر جلد ہی قتل کر دیا گیا، اس لیے ابنِ حزم وزارت سے خود بخود الگ ہو گئے اور اپنے مکان بلاط مغیث میں رہنے لگے کیونکہ یہ محلہ جامع قرطبہ سے قریب تھا جہاں آپ درس و تدریس کے لیے جایا کرتے تھے، مگر تشدد کی وجہ سے اواخر ۴۱۶ھ (۱۰۲۶ء) میں ان کو اور ان کے استاذ ابو الخیار مسعود بن سفلت کو جامع قرطبہ چھوڑنی پڑی، اس واقعہ کی وجہ سے ابن حزم بہت رنجیدہ ہوئے، یہاں تک کہ قرطبہ چھوڑ کر

اندلس کے مختلف علاقوں میں گھومتے رہے۔ اسی درمیان میں وہ ایک مرتبہ قرطبہ آئے اور بنیۃ المغیرہ اور بلاط مغیث کے قصور و محلات کی تباہی و بربادی کا منظر دیکھا تو پھر وہاں سے نکل کر اندلس کے مغربی علاقہ میں گئے، جہاں "ہفت لیشم" نام کے ایک گاؤں میں ان کی خاندانی جاگیر اور جائداد تھی، آج گاؤں کا نام مونتیجا رہے، جو مرلیدہ کے شمالی جانب سات کیلومیٹر پر واقع ہے، اس دور افتادہ مقام پر امام ابن حزم نے تقریباً ۲۵ سال بسر کئے، اور درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں رہ کر علمی و دینی خدمات انجام دیں، یہاں تک کہ اسی جگہ پر ۲۸ شعبان ۴۵۶ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۰۶۴ء کو فوت ہوئے، (رحمہ اللہ تعالیٰ)

شرکائے جشن جن مغربی مستشرقین اور عرب فضلاء نے اس جشن میں ابن حزم پر مقالات پیش کئے اُن کے نام اور مقالات کے عنوانات یہ ہیں:۔

(۱) ڈاکٹر خوان برنیت خینیس، پروفیسر برشلونہ یونیورسٹی، "ابن حزم کے نزدیک علمائے ریاضیات کا مقام"

(۲) ڈاکٹر روجیہ ارنالدیز، پروفیسر لیون یونیورسٹی، "ابن حزم اور اسلامی الٰہیات کے اہم مسائل"

(۳) ڈاکٹر شارل بیلا، پروفیسر پیرس یونیورسٹی، "ابن حزم اور ابن شہید اور عربی شاعری"

(۴) ڈاکٹر مانویل اوکانیا خیمینیث، رکن قرطبہ اکیڈمی "قرطبہ ابن حزم کے زمانہ میں"

(۵) ڈاکٹر خاثینتو بوسک بیلا، پروفیسر غرناطہ یونیورسٹی، "ابن حزم ماہر انساب"

(۶) ڈاکٹر فرناندو دی لاجرانخا سنتا ماریا، پروفیسر میڈرڈ یونیورسٹی، "ابن حزم کے نزدیک محبت کی تاثیر میں مشرقی ادبیات"۔

(۷) ڈاکٹر داریو کابانیلاس رودریجث، پروفیسر غرناطہ یونیورسٹی، "ابن حزم اور اندلس میں طریقہ تعلیم"

(۸) ڈاکٹر پدرو مارتینیث مونتابث، ممبر معہدِ اسپانی عربی برائے ثقافت، "عربی شاعری میں دارالخلافہ قرطبہ اور اندلس"

(۹) ڈاکٹر الیاس ترلیس (بطرس) ساوایا، پروفیسر میڈرڈ یونیورسٹی، "ادب اور تنقید میں ابنِ حزم کی آراء"

(۱۰) ڈاکٹر دافید جوستالوبالیسو، پروفیسر غرناطہ یونیورسٹی، "ابن حزم اور ابن النغریلہ یہودی کے مابین دینی مباحثہ"

(۱۱) ڈاکٹر میجیل کروث ایز ناندیث، پروفیسر سلمنقہ یونیورسٹی "دورِ خلافت میں ثقافتِ اندلسیہ اور ابن حزم کے افکار"
(۱۲) ڈاکٹر خایمہ اولیفر آسین، مدیر مدرسہ ابحاث عربیہ میڈرڈ، "ابن حزم کی طوق الحمامہ اور اسپینی ادب میں اس کا اثر"
(۱۳) ڈاکٹر ہنری تیراس، مدیر دار بلاسکت میڈرڈ، "دسویں صدی کے اواخر میں اندلسی فن کے منصوبے"
(۱۴) ڈاکٹر لویس سیکوری لوثینا، مدیر مدرسہ ابحاث عربیہ غرناطہ "ابن حزم کی نقط العروس میں جدید نظریئے"

یہ اسپین کے مستشرقین ہیں، جن کے ناموں کو عربی سے لیا گیا ہے اسپینی زبان میں ان کا تلفظ کچھ مختلف ہوگا۔ عرب اساتذہ کے نام اور ان کے مقالات کے عنوانات یہ ہیں:-

(۱) ڈاکٹر سعید الافغانی، عمید کلیۃ الآداب، دمشق یونیورسٹی، "ابن حزم کے نظریات لغت میں"
(۲) ڈاکٹر حسین مونس، مدیر معہد دراساتِ اسلامیہ میڈرڈ، "ابن حزم کے نزدیک علوم کے مراتب"
(۳) ڈاکٹر محمود علی مکی، وکیل معہد دراساتِ اسلامیہ میڈرڈ، "قرطبہ کے فقہی کارنامہ میں ابن حزم کا موقف"
(۴) ڈاکٹر جمال الدین الشیال، پروفیسر اسکندریہ یونیورسٹی، اور مشیر ثقافی برائے سفارت متحدہ عرب جمہوریہ متعینہ رباط، "اسکندریہ اور ابن حزم کے تعلقات"
(۵) ڈاکٹر احمد مختار عبادی، پروفیسر اسکندریہ یونیورسٹی و رباط یونیورسٹی، "ابن حزم اور ابن الخطیب کے باہمی تعلقات"
(۶) استاذ محمد عبداللہ عنان، "ابن حزم اور مختلف اقوام کا اجتماع"

غالب گمان ہے ان تمام مقالات و محاضرات کو اور امام ابن حزم کے نو سو سالہ یادگار جشن کی جملہ کارروائی کو اس کی کمیٹی کی طرف سے کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا، اس تقریب کے موقع پر جلسہ گاہ میں عربی زبان میں یہ بورڈ آویزاں کیا گیا تھا:-

احتفال الذکری المئویۃ التاسعۃ لوفاۃ ابن حزم القرطبی قرطبۃ من ۱۲ الی ۱۸ مایو ۶۳
ملن بتہ قرطبۃ معہد الدراسات الاسلامیۃ فی مدرید مدرسۃ الابحاث العربیۃ فی غرناطۃ المعہد الاسبانی العربی للثقافۃ

(۲۲)

فرقۂ یزیدیہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ اوران کے اہلِ بیت کے ساتھ مفرط غلو اور حضرتِ معاویہ رضی اللہ عنہ اور امویوں کے ساتھ بیجا بدگمانی کے ردِّ عمل میں حضرت معاویہ اور یزید کے بارے میں بھی مبالغہ آرائی شروع ہوئی، اوران کو ایک جماعت نے اسی سطح پر رکھا جس پر حضرت علیؓ کو ان کے غالی معتقدین نے رکھا ہے۔

اس فرقہ کی تاریخ علامہ مقدسی بشاریؒ نے احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم میں چوتھی صدی کے آخر میں اس کی نشاندہی اس طرح کی ہے کہ بغداد میں ایسے غالی لوگ بھی ہیں جو حُبِ معاویہؓ میں بہت غلو سے کام لیتے ہیں، ایک مرتبہ واسط کی جامع مسجد میں ایک شخص کے پاس لوگ جمع تھے، اور وہ ان سے سند کے ساتھ بیان کر رہا تھا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالےٰ قیامت کے دن معاویہ کو اپنے پاس بلاکر پہلو میں بٹھائے گا اور اپنے دستِ خاص سے ان کی نقاب کشائی کرکے خلقت کے سامنے عروسِ نو کی طرح جلوہ گر کرے گا، جب میں نے اس کو ٹوکا تو اس نے لوگوں سے کہا کہ اس رافضی کو پکڑو، اس کا یہ کہنا تھا کہ لوگ مجھ پر جھپٹ پڑے، مگر چند جان پہچان والوں نے درمیان میں پڑکر مجھ کو بچایا[1]

عراق کے علاوہ ایران میں بھی حضرت معاویہؓ کی شان میں غلو سے کام لینے والے موجود تھے، علامہ مقدسی بشاری ہی کا بیان ہے کہ :-

اصفہان میں مجھے ایک بڑے عابد و زاہد کا پتہ بتایا گیا، میں زیارت و

---

[1] احسن التقاسیم ص۱۲۶ طبع یورپ

برکت کی نیت سے اس کے پاس گیا، باتوں باتوں میں، میں نے کہا "صاحب" کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے اس نے لعنت بھیجی، اور کہا کہ اس نے ہمارے سامنے نیا مذہب پیش کیا ہے، صاحب کہتا ہے معاویہ رسول نہیں ہیں، میں نے کہا کہ کیا تم ان کو رسول کہتے ہو، اس نے کہا میں تو وہی کہتا ہوں جس کا اللہ نے حکم دیا ہے، لا نفرق بین احد من رسلہ ابوبکر رسول تھے، عمر رسول تھے عثمان و علی رسول تھے، اور معاویہ بھی رسول تھے، میں نے کہا ایسا نہ کہو خلفائے اربعہ تو خلیفہ تھے، اور معاویہ بادشاہ تھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، الخلافۃ بعدی الی ثلاثین سنۃ ثم تکون ملکا وہ شخص میری بات سن کر حضرت علی پر طعن و تشنیع کرنے لگا اور مجھے رافضی بتانے لگا، اگر میرے آدمی وہاں پر نہ پہونچ گئے ہوتے تو اس کے آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑتے، ان لوگوں کے متعلق اس طرح کے اور بہت سے واقعات مشہور ہیں[1]۔

یہ حضرت معاویہؓ کے بارے میں غلو کی مثال ہے، یزید کے بارے میں غلو نے مستقل کی صورت اختیار کرلی اور فرقہ یزیدیہ ایک مستقل فرقہ بن گیا ہے، اس کا مرکز موصل کے او جبال ہکاریہ ہے، اس کی تاریخ یہ ہے کہ اکراد ہکاریہ کے یہاں شیخ عدی (ولادت ۴۶۷ھ وفات ۵۵۵ھ) نامی ایک بزرگ آئے، جن کا دل شیعوں کے یزید پر الزامات وافترا سے آچکا تھا۔ انہوں نے ان کردوں کو بتلایا کہ یزید مسلمانوں کے ائمہ میں ہے، اس کے خلا جو باتیں کی جاتی ہیں ان کی کوئی صحت و سند نہیں ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنے رسالہ عدویہ میں لکھا ہے کہ شیخ عدی کا طریقہ پہلے اچھا طریقہ تھا مگر اس کے خلفاء میں شیخ حسن نامی ایک بزرگ کو شیعوں نے قتل کیا جس سے بڑا فتنہ برپا ہوا، اس کے نتیجہ میں ہکاری کردوں نے شیخ عدی اور شیخ حسن

[1] احسن التقاسیم ص۳۹۹، طبع یورپ۔

بارے میں حد درجہ غلو سے کام لیا، اور یزید کی نبوت تک کے قائل ہو گئے، یہ لوگ امام ابن تیمیہ کے زمانہ تک اسی حال پر تھے، آپ نے ان کی اصلاح کے لیے الرسالۃ العدویہ نامی کتاب لکھی جس میں بتلایا کہ شیخ عدی بن مسافر نیک آدمی تھے، اگر وہ زندہ ہوتے تو کردوں کو اپنے اور یزید کے بارے میں غلو کرنے سے منع کرتے، رسالہ عدویہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ یزید کی نبوت کے قائل ہونے کے بعد اسے خدا تک مانتے تھے، ان کو یزیدیہ کہتے ہیں، یہ لوگ شمالی عراق کے علاقہ سنجار اور داس کے علاقہ اروان میں بکثرت آباد ہیں، ان میں کچھ دمشق بغداد اور حلب کے اطراف میں بھی پائے جاتے ہیں[1]

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں پنجاب کے بعض مسلمان فوجی ان کے علاقہ میں گئے تھے اور ان کے بارے میں بعض اخبارات و رسائل میں معلومات دی تھیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مور کی شکل میں شیطان کی پرستش کرتے ہیں، اور بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں

آج کل ان کا مرکز جبال ہرکاریہ کا علاقہ جبل شیخان ہے، جہاں ان کا امام اور امیر رہتا ہے، حال ہی میں بعض عربی رسالوں میں ان کے بارے میں بعض لوگوں نے سوالات کیے تھے، اس کے جواب میں خود ان کے امام اور امیر یزید خاں بن اسماعیل بیگ نے عربی میں ایک رسالہ لکھا جو مجلۃ العربی کویت بابت ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ میں شائع ہوا ہے، اس مقالہ کے ساتھ فرقہ یزیدیہ کے شیوخ اور امیر کے گروپ کے فوٹو بھی ہیں ان کے لباس ڈھیلے اور پرانی وضع کے ہیں، جن سے مذہبی تقدس ظاہر ہوتا ہے، داڑھیاں بھی شاندار ہیں، فرقہ یزیدیہ کے کمسن امیر کے چہرہ پر داڑھی نہیں ہے صرف مونچھیں ہیں، اور لباس کی وضع قطع مغربی ہے، ذیل میں ہم اس کے مقالہ کا ملخص ترجمہ پیش کرتے ہیں، فرقہ یزیدیہ کے بارے میں یہ معلومات شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

فرقہ یزیدیہ کے امام و امیر یزید خاں اسمعیل بیگ کا بیان	بنی امیہ کے زوال کے بعد جب

[1] حاشیہ المنتقی ص ۲۷۹، ۲۸۰ طبع مصر۔

شام میں بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی تو عباسیوں نے ہر جگہ امویوں کو تلاش کر کے ختم کیا، اور شکست خوردہ اموی بری طرح تباہی اور انتشار کا شکار رہوئے، اور ان کی ٹولیاں مختلف ملکوں میں منتشر ہوگئیں، ان ہی میں شیخ عدی بن شیخ مسافر شامی اموی بھی تھے، جنہوں نے شمالی عراق میں پناہ لی اور جبل ہکار کو اپنا مستقر اور وادی لالش میں زاویہ بنا کر طریقہ عدویہ جاری کیا، جو بعد میں "یزیدیہ" کے نام سے مشہور ہوا، مختلف ملکوں اور شہروں کے عرب اور اکراد نے ان کی پیروی کی، شیخ عدی بن مسافر نے پوری زندگی زہد و ریاضت میں بسر کی اور ۵۵۸ھ میں وادی لالش میں انتقال کیا، اس وقت ان کی عمر تقریباً اسی سال تھی۔

چونکہ شیخ عدی نے شادی نہیں کی تھی، اور ان کے اولاد نہ تھی، اس لیے ان کے انتقال کے بعد ان کے بھتیجے شیخ عدی الثانی بن شیخ ابو البرکات خلیفہ ہوئے، شیخ عدی الثانی کے زمانہ میں طریقہ عدویہ حدود استنبول تک پھیل گیا، ان کے بعد ان کے لڑکے شیخ حسن جانشین ہوئے، انہوں نے اپنے حلقۂ دعوت و اثر کو وسیع اور منظم کر کے ہر منطقہ میں اپنے خاندان کے افراد کو والی اور عامل مقرر کیا، اور بہت بڑی فوجی طاقت جمع کر لی، جس میں تقریباً ا[illegible] ہزار سپاہی تھے، اس سے موصل کے امراء و حکام کو تشویش ہوئی اور عماد الدین زنگی ا[illegible] اس کے نائب بدر الدین لؤلؤ اور شیخ حسن کے درمیان بڑے خونیں معرکے ہوئے، ان معرکوں کا نتیجہ بدر الدین لؤلؤ کی فتح اور عدویہ کی شکست کی صورت میں ظاہر ہوا، اور شیخ حسن کا زمانہ جنگ و مقابلہ میں گزرا، اور فرقہ عدویہ طاقت کے ذریعہ آگے بڑھا۔

زمزم، کوثر، اور عرفات وغیرہ فرقہ یزیدیہ کے بانی شیخ عدی بن مسافر کی قبر موصل کے شمال میں جبل ہکار کی وادی لالش میں واقع ہے، یہیں پر ان کے آل و اصحاب کی قبریں بھی ہیں، اس لیے فرقہ یزیدیہ کے لوگ یہاں حج کے لیے آتے ہیں، اس وادی میں جبل ہکار سے نکلے ہوئے آب شیریں کے کئی چشمے ہیں، ان میں ایک چشمہ کا

زمزم ہے، یزیدیوں کا عقیدہ ہے کہ شیخ عدی بن مسافر نے ایک سخت پتھر پر اپنا عصا مار کر کہا کہ "زمزم زمزم تعالیٰ" جس سے کعبہ شریف سے آب وزمزم وادی لالش کی طرف پھر گیا، زمزم کی طرح اسی وادی میں جبل عرفات، جبل المشہد، حوض کوثر، عین البیضاء اور حجر اسود بھی ہو

طاؤس الملائکہ

طاؤس ملک یا طاؤس الملائکہ یزیدیوں کے نزدیک رئیس الملائکہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کا مقرب اول اور عالم ملکوت کا محافظ ہے، یہی طاؤس ملک یا طاؤس الملائکہ اللہ تعالیٰ کے امور ومعاملات کو اس کے وسیع ملک میں چلاتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے تمام ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم ؑ کو سجدہ کریں تو اس طاؤس الملائکہ کے سوا تمام ملائکہ نے آدم ؑ کو سجدہ کیا، اس نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اے رب! میں آدم کو کیسے سجدہ کروں؟ تو نے مجھے نور سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے[1]

طاؤس ملک زمین میں "سنجق" کے عہدہ پر فائز ہے، فرقہ یزیدیہ کے ہر منطقہ کے لیے ایک خاص سنجق ہوتا ہے جو ان کی خیرات فروض جمع کرتا ہے، اور ہر علاقہ کا سنجق سال میں ایک مرتبہ اپنے علاقہ میں مذہبی جلوس نکالتا ہے، جس میں مذہبی علماء شریک ہوتے ہیں، جن کو القوالین (قوال) کہتے ہیں، یہ لوگ جلوس میں مذہبی قصائد پڑھتے ہیں، اس جلوس کے موقع پر نذر ونیاز کی جاتی ہے اور یزیدی صدقہ وخیرات دیتے ہیں، جن کو سنجق جمع کرتا ہے، طاؤس ملک پوری دنیا کا سنجق تسلیم کیا جاتا ہے۔

فرقہ یزیدیہ کی مذہبی کتابیں

فرقہ یزیدیہ کے پاس دو مقدس کتابیں ہیں، ایک مصحف رش جو یزیدیوں کا دینی دستور ہے، مصحف رش ہرن کی کھال پر شیخ عدی کے قلم سے لکھا ہوا موجود ہے، دوسری کتاب "الجلوۃ" ہے یہ مصحف رش کی تفسیر ہے جو شیخ حسن بن عدی الثانی نے لکھی ہے۔

---

[1] مطلب یہ ہے کہ معلم الملائکہ جو بعد میں شیطان ہوا، وہی طاؤس کی شکل میں فرقہ یزیدیہ کے اعتقاد میں سب کچھ ہے۔

فرقہ یزیدیہ کے نزدیک لکھنا پڑھنا محرمات دین میں سے ہے، اسلئے مصحف رش طاق نسیاں میں پڑا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا ایک ماہر آثار قدیمہ یہاں آیا، اسے اس قدیم مخطوطہ کا پتہ چلا، تو اس نے اسے چرا لیا، فی الحال یہ کتاب جرمنی کے میوزیم میں موجود ہے، البتہ کتاب الجلوۃ کے دو نسخے پائے جاتے ہیں، ایک سنجار میں اور دوسرا یزیدی فرقہ کے مرکزی مقام شیخان میں موجود ہے۔

فرقہ یزیدیہ کے طبقات

یزیدی چار مذہبی طبقوں میں منقسم ہیں۔ اور انکے درمیان کسی حال میں مناکحت جائز نہیں ہے۔

(۱) طبقۃ الامیر، اس خاندان کے افراد عائلۃ امیر الشیخان کے لقب سے مشہور ہیں، یہ عدی الثانی کی اولاد سے ہیں، ان کا نسب اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان بن حکم تک پہونچتا ہے، طبقۃ الامیر انیسویں صدی کے اوائل میں قریب قریب ختم ہو گیا تھا، جب امیر شیخان علی بن حسن بک کو صوران قبائل نے قید کر کے قتل کر دیا، علی بک بن حسن بک کے تین بچے تھے۔ یزیدیوں نے پہاڑ کی چوٹیوں پر لے آکر ان کی پرورش کی، انھوں نے جوان ہو کر پھر اپنی قوم کی تنظیم کی، ان تینوں بھائیوں کے نام ہیں، حسین بک امیر تحسین کے دادا، عبدی بک اس مقالہ نویس کے دادا، اور سلیم بک مقالہ نگار کی والدہ کے دادا، اس خاندان کے افراد کی تعداد بہت ہی کم ہے، مگر جلیل بھی ہے۔ طائفۂ یزیدیہ کی نظر میں بڑی محترم ہے، یہی لوگ فرقہ یزیدیہ کے جملہ امور و معاملات کے ذمہ دار ہیں، عراق کے اندر باہر روحانی شیوخ مذہبی پیشواؤں کا عزل و نصب انہیں کے اختیار میں ہے، تحلیل و تحریم کے بھی وہ مجاز ہیں، اور تمام علاقوں کے سناجق کے ذریعہ خیرات اور عتبات مقدسہ کی جو آمدنی ہوتی ہے وہ بھی انہیں کے پاس جمع ہوتی ہے، جس یزیدی کے کوئی وارث نہیں ہوتا اس کی میراث بھی انہیں کو منتقل ہو جاتی ہے، دعاؤں اور مذہبی تقریبات میں ان کے نام لیے جاتے ہیں،

(۲) طبقۃ الشیوخ، یہ روحانی لوگوں کا طبقہ ہے، اس میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں

دانی اور قاتانی یعنی عدنانی اور قحطانی، یہ لوگ عام طور سے اپنے شیوخ کے مرید ہوتے ہیں، اور ان کے جملہ احکام کو مانتے ہیں، مریدوں پر فرض ہوتا ہے کہ اپنے شیوخ کی خدمت میں مالی نذرانہ اور زکوۃ پیش کریں، یعنی شیوخ اپنے مریدوں کے بارے میں فرقہ یزیدیہ کے امیر کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں۔

(۳) طبقۃ البیر (پیر) یہ طبقہ روحانی صفات کا حامل ہوتا ہے، اور مذہبی تقریبات، اور مراسم میں اسے امتیازی شان حاصل ہوتی ہے، کسی پیر کا نکاح اپنے خاندان کے علاوہ دوسرے خاندان میں جائز نہیں ہے۔

(۴) طبقۃ المریدین، یہ لوگ فرقہ یزیدیہ کے سواد اعظم ہیں، اور انہیں کی اکثریت ہے، یہ طبقہ شیوخ اور طبقہ پیر کے درمیان تقسیم ہوتے ہیں، ہر مرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شیخ یا پیر کا پوری طرح مطیع ہو، ویطیعھا طاعۃ عمیاء بدون قیود او شـــرط یعنی بغیر شرط و قید کے ان کی اندھی تقلید و اطاعت کرے، مرید ہر ممکن طریقہ سے اپنے شیخ اور پیر کو راضی رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اور ہر مرید اپنی آمدنی کا تہائی اور بعض اوقات نصف حصہ سالانہ شیخ پیر سنجق اور عتبات مقدسہ کو دیتا ہے۔

ان طبقات کے علاوہ دینی افراد کے دو اور طبقے ہیں جو اپنے اپنے حلقہ میں طبقہ مرید سے اونچے ہوتے ہیں، ایک طبقۃ القوال، دوسرا طبقۃ الفقیر،

ان کے نزدیک نماز اور روزہ: یزیدی موحد ہیں[1]، اللہ کی وحدانیت کا اعتقاد رکھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جس نے غیر کو سجدہ کیا اس نے غلط کام کیا، ان کے نزدیک عبادت فرض ہے، یزیدی آفتاب نکلنے سے پہلے اٹھتا ہے۔ اور غسل کر کے مشرق کی طرف متوجہ ہو کر جھکتا ہے، اور زمین کے اس حصہ کو بوسہ دیتا ہے جس پر سورج کی پہلی کرن

---

[1] فرقہ یزیدیہ کے امام و امیر کا یہ دعوی اسی کی تصریحات کی رو سے سراسر غلط ہے (مترجم)

پڑتی ہے، اس کے بعد صبح کی دعا پڑھتا ہے، جس میں اپنے رب سے مغفرت اور خیر طلب کرتا ہے اور شر سے دور رہنے کی دعا کرتا ہے، استقبال آفتاب کی حکمت یہ ہے کہ آفتاب خدائے عظیم کی مخلوق کا نور ہے جس کے ذریعہ انسان سیدھا راستہ پاتا ہے۔

یزیدیوں کے یہاں روزہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک ہوتا ہے، اور اس درمیان میں کھانے پینے اور ہر نفسیانی خواہش سے بچنا ضروری ہے، روزہ کے چند مخصوص دن ہیں، جس میں سب سے اہم صوم یزید ہے، یہ ہر سال کا نون ثانی (جنوری) میں تین دن رکھا جاتا ہے، انہیں دنوں کے روزے ہر یزیدی پر فرض ہیں، اور سفر میں بھی ساقط نہیں ہوتے، ان کے علاوہ بھی چند روزے ہیں جن کی مجموعی تعداد پندرہ ہے، ان میں صوم بحلخانہ سب سے اہم روزہ ہے، یہ چالیس دن کا ہوتا ہے، اور سردی اور گرمی کے خاتمہ پر ان کا وقت ہے، گویا یہ روزے فرض نہیں ہیں، مگر ان کے لیے شرط ہے کہ چالیس دن تک مسلسل رکھے جائیں بہت سے یزیدی یہ روزہ رکھتے ہیں۔

اخروی بھائی بندی اور تناسخ ہر یزیدی پر فرض ہے کہ طبقہ روحانیہ میں سے اپنے لئے ایک بھائی چنے جس سے آخرت میں مدد لے سکے، جب تک یزیدی زندہ رہتا ہے، اپنے اس روحانی بھائی کو رسوم مفروضہ ادا کرتا ہے، یزیدیوں کا عقیدہ تناسخ اور حلول ارواح پر بھی ہے، ان کے عقیدہ کی رو سے روح فنا نہیں ہوتی، بلکہ آسمان پر اس کے اعمال کا فیصلہ ہو جانے کے بعد اس کا دنیا میں واپس ہونا ضروری ہے، اگر اعمال نیک ہوتے ہیں تو بڑی شخصیت کے قالب میں اس کا ظہور ہوتا ہے ورنہ جانوروں مثلاً گدھے، کتے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، اسی طرح روح صعود و نزول اور تناسخ کے چکر میں رہا کرتی ہے۔

فرقۂ یزیدیہ کے محرمات فرقہ یزیدیہ کے نزدیک خس (ایک قسم کی ترکاری) سور کا گوشت خوشبودار مسالے، خوشبودار بخور وغیرہ اور نیلا رنگ حرام ہے

گو میں خود یزیدیوں کا امیر اور اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا ہوں، لیکن ان چیزوں کی تحریم کو میں دینی نقطۂ نظر سے اب تک نہیں سمجھ سکا۔ کیونکہ یہ روحانی علماء کے مخصوص علم و حکمت سے متعلق ہے۔ میں اس تحریم کو صحت کے اسباب و علل پر محمول کرتا ہوں، مثلاً خس گندی جگہ میں اگتی ہے اور نجاست میں رہنے کی وجہ سے اپنے اندر بہت سے جراثیم رکھتی ہے اس لیے اطباء بغیر صفائی کے اس کا استعمال منع کرتے ہیں، تھوک متعدی بیماری کا باعث ہوتا ہے، خوشبودار مسالے اور بخور وغیرہ بھی صحت کے لیے مضر ہیں، نیلا رنگ اکثر میل کچیل اور گرد و غبار کو جذب کرتا ہے، اور اس میں گندگی کے نشان ظاہر نہیں ہوتے، سور کی گندگی اور نجاست مشہور ہے، نیز اس میں مہلک بیماری کے جراثیم ہوتے ہیں۔

لکھنا پڑھنا حرام ہے

فرقہ یزیدیہ کے نزدیک لکھنا پڑھنا زمانہ قریب تک حرام تھا، صرف شیوخ کے خاندانوں کے لیے اس کا جواز اور رواج تھا، یہ لوگ شب قدر میں آیت الکرسی پڑھتے ہیں، لکھنے پڑھنے کی حرمت ان ہی روحانی شیوخ کی طرف سے تھی، تاکہ یزیدی قوم ہمیشہ ان کی غلامی میں رہے، مگر اب وہ یزیدی جو ان آگے بڑھ رہے ہیں، ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج ہونے لگا ہے۔

نکاح، طلاق، اور میراث

یزیدیوں کے یہاں شادی اسلامی طریقہ پر ہوتی ہے، فرق یہ ہے کہ منگنی کرنے والا شخص لڑکی کے خاندان کو ۲۰۰ سے ۳۰۰ تک دینار کی نقد رقم دیتا ہے، جو اس خاندان کی ملکیت ہو جاتی ہے، یزیدی کو تعدد ازدواج کا بھی حق ہے، البتہ اپنے بھائی یا چچا کی بیوی سے نکاح جائز نہیں ہے، زن و شوئی میں خیانت، بانجھ پن، اور تین سال تک شوہر کی غیبوبت سے طلاق کی صورت نکل آتی ہے، مطلقہ سے کسی حالت میں نکاح یا رجعت جائز نہیں ہے۔

صرف اولاد ذکور باپ کی وارث ہوتی ہے، لڑکیوں کو وراثت کا مطلق حق نہیں ہے اگر متوفی کے لڑکا نہ ہو تو اس کا ترکہ بھائی، یا چچا، یا چچا زاد بھائی پاتا ہے، اگر ان میں سے

بھی کوئی نہ ہو تو پھر یہ ترکہ امیر الشیخان کے خاندان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

ختنہ اور کریف الدم یزیدی فرقہ کے نزدیک ختنہ دینی فریضہ ہے، جب بچہ ایک سال کا ہو جاتا ہے تو محفل ختنہ دھوم دھام سے منعقد کی جاتی ہے اور اس میں کسی ایسے شخص کو دعوت دی جاتی ہے جس کی دوستی پر ان کو اعتماد ہوتا ہے، یہ شخص ختنہ کے وقت بچے کو گود میں لے کر بیٹھتا ہے اور جب خون کا قطرہ اس کے کپڑوں پر گرتا ہے تو وہ شخص کریف العائلہ ہو جاتا ہے، ایسے شخص کو کریف الدم بھی کہتے ہیں۔

اس رسم کے ذریعہ یزیدی اپنے خاندان اور دوسرے طبقہ کے خاندانوں سے روابط و تعلقات پیدا کرتے ہیں، کریف الدم کا غیر یزیدی مسلمان ہونا ضروری ہے، اور اگر یزیدی ہو تو پھر بچے کے طبقہ کے علاوہ دوسرے طبقہ سے اس کا تعلق ہونا چاہئے، تاکہ سات پشت تک دونوں خاندانوں میں رشتہ مناکحت قائم نہ ہو سکے کریف یزیدیوں کے نزدیک بہت ہی معزز و محترم شمار کیا جاتا ہے، وہ اسے اپنے خاندان کا فرد سمجھتے ہیں، جو اس کے مال و دولت اور گھر بار میں شریک ہوتا ہے، البتہ محرمات میں اس کا حصہ نہیں ہوتا۔

استدراک (مزید معلومات) معارف ستمبر ۱۹۶۱ء کے شمارے میں یہ مضمون شائع ہوا، اس کے بعد ہی اکتوبر ۱۹۶۱ء کے معارف میں جناب لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید صاحب (پاکستان) نے "فرقہ یزیدیہ" کے عنوان سے اس پر استدراک لکھا، وہ لکھتے ہیں کہ معارف ماہ ستمبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۲۳ پر تلخیص و تبصرہ کے تحت "فرقہ یزیدیہ اپنے امیر کے بیان کی روشنی میں" چند صفحات لکھے گئے ہیں، اور صفحہ ۲۲۵ کے وسطی پیرے میں لکھا ہے کہ "دوسری جنگ عظیم کے دوران میں پنجاب کے بعض مسلمان فوجی ان علاقوں میں گئے تھے، اور ان کے بارے میں بعض اخبار و رسائل میں معلومات دی تھیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مور کی شکل میں شیطان کی پرستش کرتے ہیں، اور بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں" خط کشیدہ جملہ میرے مضمون سے ہے جو بہ عنوان "ملک طاؤس" ۱۹ برس

ہوئے ندوۃ المصنفین کے مجلہ شہریہ برہان میں شائع ہوا تھا، اس مضمون کا ایک اقتباس جو چھٹے ہیں صدق جدید نے اسی سال دیا تھا، پھر میرا ایک مضمون یزیدیوں پر انگریزی زبان میں بھی تقسیم ملک کے بعد لاہور سے سول ملٹری اخبار میں شائع ہوا تھا، میرے علاوہ اس موضوع پر کسی اور نے نہیں لکھا، البتہ میرا حوالہ دے کر ایک مرتبہ مولانا ابو اعلیٰ چشتی (حاجی لق لق) نے اس مضمون کو اپنے اخبار میں نقل کیا تھا، میں نے تو ان تمام مقامات کی سیر کی تھی، اور چند روز شیخ عدی (مقام ہیڈکوارٹر یزیدیاں) میں رہا، اور جبل سنجار کی بھی سیر کی، میرے مضمون میں تمام چشم دید حالات بیان کئے گئے ہیں، یہاں تک کہ ملک طاؤس کے مجسمہ کا بھی بیان دیا گیا ہے۔ متذکرہ بالا تبصرہ میں فرقہ یزیدیہ لکھا گیا ہے، یہ غلط ہے، یہ فرقہ یزیدیہ نہیں بلکہ قوم یزیدی ہے اور اس کی مفصل تفصیل اور اس قوم کی تاریخ میں نے بیان کر دی ہے[1] یہ قوم شیطان پرست اور آتش پرست ہے، ان کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کا نام یزیدی کیونکر پڑا، اس کے متعلق بھی میں نے اپنی تحقیق لکھی ہے جو اس مقالے میں ملے گی

صفحہ ۲۲۵ آخری پیرے کے شروع میں لکھا ہے" آج کل ان کا مرکز جبال ہرکاریہ کا علاقہ جبل شیخان ہے" معلوم ہوتا ہے مصنف نے خود یہ علاقہ نہیں دیکھا ہے، جبل شیخان پہاڑ نہیں ہے بلکہ ایک قصبہ ہے جس کو" باشیخان" کہتے ہیں اور یہ مقام جبل مقلوب پر واقع ہے، جو کہ موصل سے ۱۸ میل کے فاصلہ پر شروع ہوتا ہے۔ نہ کہ جبال ہرکاریہ جیسا کہ لکھا گیا ہے، اور جبال کی ترکیب بھی سمجھ میں نہیں آئی۔

---

[1] یہ باتیں ہم نے المنتقیٰ کے حاشیہ کے حوالہ سے درج کی ہیں جسے شیخ محب الدین خطیب کے تحقیق کے بعد تحریر کیا ہے، شیخ محب الدین الخطیب مصر کے مشہور محقق و مقدمہ نگار اور حواشی نگار عالم ہیں، انھوں نے مکہ مکرمہ سے ہاشمی دور سلطنت میں "القبلہ" نامی اخبار جاری کیا تھا پھر مصر میں الفتح رسالہ جاری کیا اور بہت زیادہ علمی و تحقیقی کام کئے آخر شوال ۱۳۸۹ھ میں مصر ہی میں فوت ہوئے (رحمہ اللہ)

شیخ عدی بن مسافر کے متعلق غلط لکھا ہے کہ انہوں نے شمالی عراق میں پناہ لی اور فرقہ یزیدیہ کو جاری کر کے اس کا نام یزیدیہ رکھا، شیخ عدی تو وہاں کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ اور غالباً معاویہ کے زمانے کی بات ہے یہ، اس وقت ٹھیک یاد نہیں ہے، یہ یزیدی علاقہ کے گورنر تھے، اس وقت یزیدیوں کو بزداری کہا جاتا تھا، تفصیل کے لیے میرا مقالہ مطبوعہ برہان ملاحظہ ہو۔

آخری اور صحیح معلومات

اس سلسلہ کی سب سے زیادہ مستند و صحیح اور تفصیلی معلومات ایک مصری فاضل الاستاذ محمد سید گیلانی نے دی ہیں جو قاہرہ یونیورسٹی کے ماجسٹر ہیں، اور انھوں نے عبدالکریم شہرستانی کی کتاب الملل والنحل کو نئے انداز و اسلوب میں اڈٹ کر کے اس کے آخر میں ذیل الملل والنحل کے نام سے قدیم و جدید فرقوں کے بارے میں معلومات جمع کی ہیں اور ۱۹۶۷ء (۱۳۸۷ھ) میں کتاب کے آخر میں اسے چھاپ کر شائع کیا ہے، شہرستانی متوفی ۵۴۸ھ کے بعد جو مذاہب و فرق پیدا ہوئے ان میں سب سے پہلے یزیدیہ او عبدۃ الشیطان کے عنوان سے اس فرقہ کے بارے میں صفحہ ۳۳ سے صفحہ ۴۰ تک جو کچھ بیان کیا ہے ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، یہ اس فرقہ کے بارے میں سب سے آخری اور سب سے زیادہ محقق و مستند معلومات ہیں۔

فرقہ یزیدیہ کے مقامات اور ان کی تعداد

فرقہ یزیدیہ یا شیطان کے پجاری اکثر کرد قبائل سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان میں سے اکثر ان علاقوں میں آباد ہیں (۱) موصل کے شمال مشرق کے قضار الشیخان ہیں، یہ ان کا اہم ترین دینی و سیاسی مرکز ہے، یہیں باعدری ان کے امیر کا مقام اور شیخ عادی کی قبر ہے (۲) عراق کے شمال مغرب میں قضار سنجار میں یہ پہاڑی مقام عراق اور شام کی سرحد پر ہے۔ راستے دشوار گزار ہیں اور قلعہ جات ہیں، ہنگامے کے زمانہ میں یہ لوگ اسی علاقہ میں پناہ لیتے تھے (۳) دیار بکر میں، ماردین ہجبل طور، (۴) منطقہ حلب میں کلس اور عین تاب

کے آس پاس، (۵) آرمینیہ کے شہروں میں، جو روس اور ترکی کی سرحد پر واقع ہیں، خاص طور سے قرص اور ایراوان کے منطقے ہیں، اور بلاد توقاس کے شہر تفلیس کے قرب وجوار میں۔

(۶) ایران میں یزیدیہ فرقہ کے بعض افراد رہتے ہیں یہ لوگ اکثر دیہات وقریات میں بستے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں، بعض صحرائی اور بدوی زندگی بھی بسر کرتے ہیں، خاص طور سے کوچر نامی قبیلہ خانہ بدوش ہے، یزیدیوں کی مجموعی تعداد اسی ہزار کے قریب ہے۔

یزیدیہ کی وجہ تسمیہ ان کے یزیدی کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے، خود ان کا کہنا ہے کہ وہ خلیفہ اموی یزید بن معاویہ کی طرف نسبت کرتے ہیں، جس نے ان کے قدیم دین کو زندہ کیا ہے، ان کے امیر اسمٰعیل چول متوفی ۱۹۳۳ء نے اس سلسلہ میں نہایت جاہلانہ اور دیومالائی روایت بیان کی ہے، جو تاریخ سے نری جہالت پر مبنی ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ یزید الٰہ المقدس ہے، اس فرقہ کے لوگوں کو خود اپنے بارے میں معلومات نہیں ہیں، بعض لوگ ان کو یزید بن انیسہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جو خوارج میں سے تھا۔

بعضوں کا قول ہے کہ یہ شہر یزد یا مجوسیوں کے معبود یزدان کی طرف منسوب ہے ان کے اعتقادات میں مرورِ ایام اور جہالت کی وجہ سے قصص وخرافات اور نہایت احمقانہ باتیں داخل ہیں، وہ الٰہ اکبر پر ایمان رکھتے ہیں مگر اس طور سے کہ وہ بالکل معطل ہے، اس نے اپنے تمام کام ملک طاؤس کے حوالہ کر دیئے ہیں، جو یزیدیوں کے نزدیک مرتبہ الوہیت رکھتا ہے، یہ ملک طاؤس وہی سب سے بڑا فرشتہ ہے جس نے اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کی تو اس نے اس کو سزا دی جس پر وہ ستر ہزار سال تک روتا رہا اور سات گھڑے اس کے آنسوؤں سے بھر گئے اور ان کو جہنم میں ڈال دیا گیا جس کی وجہ سے اسکی آگ بجھ گئی، اسی لیے یزیدیوں کے نزدیک دوسرے مذاہب والے غلطی پر ہیں کہ وہ ملک اعظم یعنی شیطان پر لعنت کرتے ہیں، بلکہ ان کے نزدیک اس کی تسبیح کرنی چاہیئے اگر اس کی محبت سے نہیں تو اس کے غضب سے بچنے کے لیے ایسا کرنا چاہیئے، وہی اس عالم کا مدبر حقیقی ہے اور تمام انسانوں پر عذاب نازل کرنے پر قادر ہے

ان کے عقیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یزیدیوں کا شیطان دوسروں کے شیطان سے جدا ہے، اس کو ملک طاؤس کیوں کہتے ہیں؟ اس میں بھی اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ لفظ تموز کا محرف جو قدیم بابل والوں کا ایک معبود تھا، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی روایت والا طاؤس ہے جو شیطان اور سانپ کے درمیان واسطہ بنا تھا۔

ان کا نبی شیخ عادی یا شیخ عدی

ان کا نبی شیخ عادی ہے جس سے یزیدی فرقہ کے لوگ اپنی مذہبی خبریں اور روایتیں نقل کرتے ہیں، اسے مرتبۂ نبوت و رسالت سے زیادہ درجہ دے کر ملک طاؤس کے ساتھ الوہیت میں شریک مانتے ہیں، یہ روایات کسی درجہ میں ایک مسلمان بزرگ شیخ عدی بن مسافر پر جو شیخ عدیا کے لقب سے مشہور ہیں منطبق ہوتی ہیں، یہ بعلبک میں پیدا ہوئے، اور مشرقی موصل میں جا کر انہوں نے اپنی خانقاہ بنائی ان کے ساتھ ان کے تلامذہ و مریدین بھی وہاں رہے، اور ان کی شہرت ہوئی، وہ ۵۵۵ھ یا ۵۵۸ھ میں فوت ہوئے، اور اپنے زاویہ شیخان میں دفن کیے گئے، ابن خلکان نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

سار ذکرہ فی الآفاق وتبعہ خلق کثیر وجاز حسن اعتقادھم فیہ الحد حتی جعلوہ قبلتھم التی یصلون الیھا وذخیرتھم فی الآخرۃ التی یقومون علیھا۔	ان کا چرچا تمام دنیا میں پھیلا اور بہت بڑی خلقت ان کے تابع ہوئی، ان کا اعتقاد شیخ عدی کے بارے میں حد سے بڑھ گیا حتیٰ کہ لوگوں نے ان کو اپنا قبلہ قرار دے کر اس کی طرف نماز پڑھنی شروع کی اور ان کو اپنا ذخیرہ عقبیٰ سمجھ کر اسی عقیدہ پر چلنے لگے۔

مگر خود شیخ عدی بن مسافر کی کتابوں میں فرقۂ یزیدیہ کا کوئی رجحان نہیں پایا جاتا ہے اس لئے شیخ عادی کی شخصیت کو شیخ عدی بن مسافر کی شخصیت سے ملانا مشکل ہے اس کے باوجود یزیدی ان کو مقدس مانتے ہیں، اور شیخان میں ان کی قبر کا حج کرتے ہیں۔

عادات و تقالید

ان کے نزدیک یہ حضرات بہت مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ شیخ منصور حلاج

شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت حسن بصری اور ایک شیخ جو حسن بصری کی طرف منسوب ہے اور شیخ عادی کی قبر کا متولی محافظ ہے، اس کے حکم و فتویٰ کے بغیر یہ لوگ کوئی مذہبی کام نہیں کرتے ہیں، یہ لوگ سبزی ترکاری نہیں کھاتے ہیں، کیونکہ ان کی روایت کے مطابق شیخ عادی سبزی کے ایک کھیت سے گزرے اور اس کا سوال کیا تو مالک نے دینے سے انکار کر دیا، اسی وجہ سے انہوں نے اس کا استعمال حرام قرار دے دیا بلکہ اس کھیت کے پاس سے بھی نہیں گزرتے جس میں سبزی ہو، اسی طرح وہ ہرن کا گوشت نہیں کھاتے کیونکہ اس کی آنکھ شیخ عادی کی آنکھ کے مشابہ ہے، ان کے نزدیک نماز کا تعلق قلب سے ہے اور اسے پوشیدہ طور سے ادا کرنا چاہئے، اسی لئے نماز کا نہ کوئی انتظام ہے اور نہ اس کے اوقات ہیں، شراب ان کے یہاں حلال ہے، ایک مرتبہ حکومت عراق نے اس فرقہ کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کرنا چاہا تھا مگر انھوں نے اسے منظور نہیں کیا اور یہ وجوہات بتائیں (۱) ہر یزیدی پر فرض ہے کہ ۱۲ ستمبر کو شیخ عادی کی قبر کی زیارت کو جائے، ورنہ کافر ہو جائے گا اور ہر سال یہ فرض ہے، (۲) طلوع آفتاب کے وقت مشرق کی طرف رخ کر کے اس طرح نماز پڑھے کہ کوئی مسلمان نہ دیکھ سکے، ورنہ کافر ہو جائے گا (۳) خود یزیدی کسی مسلمان کو نماز پڑھتا ہوا نہ دیکھے ورنہ کافر ہو جائے گا کیونکہ اس میں یزیدی عقیدہ کے خلاف اعوذ باللہ پڑھ کر شیطان سے پناہ چاہی جاتی ہے، اس پر مسلمان کو قتل کر دینا چاہیے یا خود قتل ہو جانا چاہئے، یا پھر ایک ہفتہ کفارہ کا روزہ رکھ کر شیخ عادی کے نام کی قربانی کرنی چاہئے (۴) روزہ رکھنے کے لیے اپنا وطن ضروری ہے، دوسری جگہ رہ کر روزہ صحیح نہیں ہوگا ہر صبح کو اپنے شیخ کو بتانا چاہیے کہ وہ روزہ سے ہے اور ہر شام کو افطار سے پہلے اس کے ہاتھ سے مقدس شراب پینی چاہئے، ورنہ روزہ صحیح نہیں ہوگا اور وہ کافر ہو جائے گا۔ (۵) اگر کوئی یزیدی ایک سال یا اس سے زائد باہر رہے تو اس کی بیوی پر طلاق واقع ہو جاتی ہے اور وہ دوسری شادی نہیں کر سکتا، (۶) جو نیا کپڑا خریدا جائے ضروری ہے کہ اسے آبِ زمزم میں بھگو یا جائے، جو شیخ عادی کی قبر کے پاس ہے (۷) کپڑا

خوبصورتی کے لیے نہیں پہننا چاہیئے، اور مسلمانوں اور یہودیوں کی کنگھی سے بال درست نہیں کرنا چاہیئے۔ اور نہ ہی اُن کے اُسترے سے بال منڈوانا چاہئیں، اور اگر ایسا ہو گیا تو شیخ عادی کے پانی سے غسل کرنا ضروری ہے ورنہ کافر ہو جائے گا۔

عقائد اور مذہبی کتابیں یہ لوگ تناسخ اور حلول کا عقیدہ رکھتے ہیں، ان کی دو مذہبی کتابیں ہیں ایک کا نام جلوہ ہے جس میں وعدہ وعید اور ترغیب و ترہیب کی باتیں ہیں، دوسری کا نام مصحف رش ہے یعنی کتاب اسود، اس میں دنیا کی تخلیق کے قصے اور یزیدی عقائد اور حلال و حرام کا بیان ہے، ان کے یہاں مذہبی تہوار بھی ہیں جن میں ناچ گانا اور شراب حلال ہے، ایک تہوار عید خضر الیاس ہے جو ماہ فروری کے پہلے پنجشنبہ کو ہوتی ہے، اس کے لیے ایک یا تین روزے رکھے جاتے ہیں، یہ مسلمانوں کے تہوار عید الاضحیٰ کے مشابہ ہے، اس میں ہر یزیدی کے لیے قربانی کرنا واجب ہے، شب قدر کو ان کے یہاں بڑا جشن ہوتا ہے، رات بھر جاگتے ہیں اور عمدہ عمدہ کھاتے ایک دوسرے کے یہاں تحفہ اور ہدیہ کے طور پر بھیجتے ہیں اور اس کے بعد والی رات میں سوتے ہیں، شب قدر میں جاگنا ملک الموت کے احترام میں ہوتا ہے اور دوسری رات میں سونا ملک شمس کے احترام میں ہوتا ہے، ان کے یہاں علم حاصل کرنا حرام ہے، مگر شیخ اسماعیل چول نے اسے ختم کر کے سرکاری اسکولوں میں جانا مباح کر دیا ہے۔

(۲۳)

فرقہ صابئہ کی ایک شاخ

نمرودوں کی سرزمین بابل و نینوئی اپنی کلدانی تہذیب و فکر کے اعتبار سے بڑی سخت جان ثابت ہوئی، اور ان کے دورِ عروج کے کچھ آثار و علائم کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی اس سرزمین پر پائے جاتے ہیں، اور عراق و شام کے دور افتادہ علاقوں میں ایسی قومیں موجود ہیں جن کو ہم بابلی مکتبِ فکر کی بگڑی ہوئی شکل کہہ سکتے ہیں، فکر و نظر کے عجائبات کی اس سرزمین پر آج بھی یہ حقیقت کم دلچسپ نہیں ہے کہ ان اطراف میں مور کی شکل میں شیطان کی عبادت کرنے والا ایک پہاڑی فرقہ پایا جاتا ہے یہاں دروزی بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں اور ماندی فرقہ بھی اس علاقہ میں موجود ہے، ماندیوں کے متعلق ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں، اس لیے ان کے بارے میں جو کچھ معلومات مل سکی ہیں، پیش کی جاتی ہیں۔

ماندی فرقہ کی تاریخ

ماندی فرقہ دجلہ و فرات کے دو آبے میں آباد ہے، یہ فرقہ نہ مسلمان ہے۔ نہ عیسائی اور نہ یہودی، بلکہ ستاروں کی پوجا کرتا ہے، اور ساتھ ہی مسیحیت و یہودیت اور اسلام کی بعض تعلیمات پر بھی عمل کرتا ہے، کواکب پرست ہونے باوجود اس کا تعلق ان صائبہ سے نہیں ہے جن کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے، زیادہ سے زیادہ اسے صائبہ کی ایک شاخ کہا جا سکتا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی فرقہ ہے جس کا ذکر سفر ایوبؑ میں سبعیئن کے نام سے آیا ہے، بعض مسیحی مورخین اسے عیسائی ثابت کرنے کی کوشش کرتے

ہیں جو خلافِ واقعہ ہے، البتہ یہ لوگ اپنے کو یوحنا کا شاگرد بتاتے ہیں، اور اسی سے اپنے کو مشہور کرتے ہیں، چنانچہ لفظ ماندی ان کی زبان میں تلمیذ اور شاگرد کے معنی میں ہیں انکی زبان کا نام بھی ماندی ہے جو قدیم سامی زبانوں سے تعلق رکھتی ہے اور سریانی سے قریب ہے۔

ویسے تو یہ فرقہ بہت قدیم ہے، اور تاریخ کے قدیم دور سے دجلہ و فرات کے دوآبہ میں آباد ہے، مگر اس کے پاس کوئی خاص تاریخ و روایت اور علمی و فکری سرمایہ نہیں ہے، اب تک صرف اس کی ایک مذہبی کتاب اور بعض دوسری چھوٹی کتابوں کا پتہ چل سکا ہے۔

سترہویں صدی عیسوی میں ماندی فرقہ کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی، مگر اس وقت صرف تین ہزار رہ گئی ہے، ان کا قدیمی مرکز دجلہ و فرات کا دوآبہ ہے، لیکن ان میں سے بہت سے عراق کے جنوب میں واقع سوق الشیوخ نامی بستی میں آباد ہیں، اور کچھ بغداد میں ہیں، یہ لوگ ایسی جگہ آباد ہوتے ہیں جہاں پانی قریب ہوتا ہے، کیونکہ ان کی مذہبی تعلیم ہے کہ وہ پانی کے کنارے رہیں، ترکوں نے اپنے دور میں ان کو فوجی تعلیم دینی چاہی لیکن ان لوگوں نے اس سے اس لیے دامن بچایا کہ پانی سے دور رہنا پڑے گا جو ان کی دینی تعلیم کے خلاف ہے، روز بروز ان کے کم ہونے کی وجوہ مختلف ہیں، سب سے پہلی اور بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ قدیم وحشی قبائلی زندگی بسر کرتے ہیں، اور ان میں ہمیشہ خانہ جنگی برپا رہتی ہے، جس سے یہ لوگ خود بخود ختم ہوتے گئے، دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی عورتیں کثرت سے مسلمانوں سے شادی کر لیتی ہیں۔

اگرچہ ان کی قدیم مذہبی زبان ماندی ہے مگر یہ لوگ عربی زبان بھی بلا تکلف بولتے اور سمجھتے ہیں، یہ لوگ عام طور سے تین پیشے اختیار کرتے ہیں۔

(۱) کشتی سازی۔

(۲) دودھ کا کاروبار، اور

(۳) چاندی کے زیورات بنانا۔

یہ چاندی کے زیورات اور ظروف پر بہترین نقش و نگار بناتے ہیں، اور اس میں ان کو خاص شہرت حاصل ہے، ۱۸۵۶ء میں ایک جرمن مستشرق بیٹرمان نے دو سال تک سوق الشیوخ کے ماندیوں میں رہ کر ان کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کی تھیں۔

مذہبی کتاب سدرا ریا

ان کے یہاں بابل کی قدیم بت پرستی اور کواکب پرستی بھی ہے، یہودیت کی تطہیر اور قربانی بھی ہے، مسیحیت کے عقیدہ کے مطابق ہفتہ کے پہلے ان کا احترام اور یوحنا کی تعظیم بھی پائی جاتی ہے، اور اسلام کا قانون ازدواج بھی موجود ہے، ان کی مذہبی کتاب کا نام "سدرا ریا" ہے جس میں مذہبی تعلیم کے الگ الگ فقرے ہیں، اور ان میں کھلا ہوا تناقض ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کو مختلف مؤلفوں نے تالیف کیا ہے، غیر ماندی شخص کے لیے اس کتاب کا دیکھنا بہت ہی مشکل ہے، چند سال پہلے بعض سیاحوں نے اس کا ایک نسخہ چوری سے حاصل کیا تھا، مگر ماندی فرقہ نے برطانوی قنصل خانہ سے اتنا سخت احتجاج کیا کہ یہ نسخہ واپس کرنا پڑا، ایک سیاح و مورخ جارج خوری سمعان کا خیال ہے کہ برطانوی عجائب خانہ میں اس کتاب کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ۱۹۰۴ء میں اس فرقہ کے کاہن اعظم سے اس کا تعارف و تعلق ہو گیا۔ اس لیے اس نے ایک نسخہ بارہ لیرا انگریزی میں خریدا، دوسرے دن جب ان کے عوام کو اس کی خبر لگی تو انہوں نے بڑا سخت مظاہرہ کیا، مگر یہ نسخہ واپس نہ ہو سکا، اور امریکہ میں اس کا ترجمہ بھی کیا گیا۔

اس کتاب کی کتابت آدھی سیدھی اور آدھی الٹی ہوتی ہے، تاکہ اس کو بیک وقت دو طرف سے دو کاہن پڑھ سکیں، ان کے یہاں ایک اور مذہبی کتاب الارواح ہے، جس کے دو تہائی حصہ میں زندہ لوگوں کے لیے اور تہائی میں روحوں کے لیے دعا ہے، اس میں حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کا بیان بھی ہے، یہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کو سب سے بڑا نبی مانتے ہیں، اس کے علاوہ ان کے پاس کچھ اور بھی کتابیں ہیں، جن میں کاہنوں کی دعائیں، یوحنا کے حالات، نجوم، جادو، شعبدہ اور اسی قسم کے علوم کے تعویذ اور منتر ہیں۔

اس فرقہ کا عقیدہ ان کا عقیدہ ہے کہ زمین سب سے پہلے پہل سے بنائی گئی، اور اللہ نے زندگی کو پیدا کیا، زندگی نے اپنے دَور سے ایک دوسری زندگی پیدا کی، یہ یسوع مسیح ہے، مگر ان کے عقیدہ میں چونکہ یسوع مسیح نے پہلی زندگی کی قوت کو غصب کرنا چاہا، اس لیے ان کو مریخ ستارے میں رکھ دیا گیا، اور تمام سیارے صاف وشفاف پانی سے پیدا ہوئے ہیں، اور نہایت مصمت اور ٹھوس ہیں، حتیٰ کہ الماس بھی ان کو کاٹ نہیں سکتا، ان ہی سیاروں سے نظام شمسی جاری ہے اور زمین اسی نظام سے تعلق رکھتی ہے، زمین کے تین طرف پانی ہے اور چوتھی طرف فیروزی رنگ کا پہاڑ ہے، جس کے عکس سے آسمان کا رنگ نیلا ہے، اور ظلمت کی ملکہ نے آتش سے شادی کی جس سے چوبیس بچے پیدا ہوئے، سبعہ سیارے، سورج اور آسمانوں کے بارہ برج، یہ سب اس کے بچے ہیں اور پانچ بچوں کا حال معلوم نہیں، ان کے خیال میں سیارے انسان کی طرف شر پھیلاتے ہیں، اور قطبی ستارہ آسمانی قبہ پر رکھا ہوا ہے اس لیے وہ اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ صائبہ کی شاخ اور اس کے کاہن مسیحیوں کے عشاء ربانی کی طرح عشار (کھانا) کا بہت اہتمام کرتے ہیں ان کے معبدوں میں دو تین کاہن سے زیادہ نہیں رہتے، عبادت خانوں کے نیچے پانی کی نہریں جاری رہتی تھیں، اور کاہن اوپر سے دعائیں پڑھتے ہیں، عبادت خانے میں عورتیں نہیں ہوتیں، البتہ مردوں کی طرح عورتیں بھی کاہن ہوتی ہیں، بشرطیکہ وہ کسی کاہن سے شادی کرلیں، ان کے یہاں مذہبی پیشوائی اور کہانت کے کئی مراتب ہیں، پہلا مرتبہ شماس ہے دوسرا کاہن، تیسرا اسقف، اور چوتھا کاہن اعظم ہر کاہن کا جسمانی عیب سے پاک ہونا ضروری ہے، عیب دار آدمی کاہن نہیں ہو سکتا، اسی لیے ان کے مذہبی پیشوا بہت ہی وجیہ و شکیل ہوتے ہیں، یہ لوگ نہ سیاہ لباس استعمال کرتے ہیں اور نہ اپنے بال کترواتے یا منڈواتے ہیں۔

(۲۴)

خانوادۂ نائبین قضاۃ مبارکپور

شیراز ہند پورب کے قصبات میں مبارک پور (ضلع اعظم گڈھ) ایک مشہور اور قدیم اسلامی قصبہ ہے جسے عہد ہمایوں (۹۳۷ھ تا ۹۶۲ھ) میں راجہ سید مبارک مانک پوری نے دوبارہ بسایا اور اسی وقت ایک مانک پوری خاندان بھی یہاں آباد ہوا جس میں قصبہ اور ملحقات و متعلقات کے لیے نیابت قضاء کا عہدہ آخری دور تک باقی رہا، اسی خانوادۂ نیابتِ قضاء سے راقم کا نسبی و خاندانی تعلق ہے۔ آخری ایام میں اس خاندان کو زوال و انحطاط کا سامنا کرنا پڑا، اور خاندانی روایات تقریباً ختم ہو گئیں، پھر بھی کسی نہ کسی حد تک ان کے آثار و اثرات پائے جاتے تھے، بلکہ اب بھی کچھ خاندانی اقدار و روایات، کچھ سرکاری اسناد و توقیعات اور کچھ نیابتِ قضا کے امور و معمولات باقی رہ گئے ہیں اس لیے خیال ہوا کہ قصبہ ہذا کے اس قدیم ترین علمی و دینی خانوادہ کی بچی کھچی یادگار اور تاریخ کو مختصر طور سے محفوظ کر دیا جائے۔ تلاشِ بسیار کے بعد آخری دور کے چند بزرگوں کے نام اور ان سے متعلق اسناد و فرامین مل سکے ہیں ان ہی کو مرتب کر کے پیش کیا جا رہا ہے کہ کچھ نہ ہونے کے مقابلے میں یہی بہت کچھ ہے، افسوس کہ مغل دور اور نوابی اودھ کے دور کے بہت سے شاہی فرامین و اسناد انگریزی عملداری کے بعد عدالتوں میں طلب کیے گئے اور پھر واپس نہ مل سکے، جس سے اس قصبہ کے اسلامی محاسن و مفاخر کے بہت سے تابناک پہلو نظروں سے اوجھل ہو گئے اور آخری زمانہ کے چند کاغذات جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی نیست و نابود ہو رہے ہیں اس لیے شدید احساس ہوا کہ ان کو مرتب کر دینا چاہیے تاکہ اسلامی قدروں کے

یہ چند دھندلے نقوش باقی رہ سکیں۔

اس خانوادہ کی تاریخ

ساتویں صدی کے شروع میں سلطان شمس الدین التمش متوفی ۶۳۳ھ کے دور میں ترکستان کے شہر گردیز سے جو افغانستان میں غزنین کے مشرق میں واقع ہے، دو بھائیوں پر مشتمل ایک دینی و روحانی کارواں دہلی پہونچا ایک بھائی کا نام سید شمس الدین اور دوسرے کا نام سید شہاب الدین تھا، ان کا سلسلۂ نسب امام جعفر زکی النفسؒ تک پہنچتا ہے، کچھ دنوں کے بعد دونوں بھائیوں نے پھر دہلی سے رختِ سفر باندھا سید شمس الدین نے اپنی آخری منزل علاقۂ میوات کو قرار دیا اور سید شہاب الدین نے مشرق کی طرف بڑھ کر کڑا مانک پور میں اقامت اختیار کی، جو اُن دنوں دہلی کی مسلم سلطنت کا مشرقی دار الحکومت تھا[1]

اسی خانوادہ میں ایک مشہور بزرگ حضرت راجہ سید حامد شاہ مانک پوری رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں، جو قطبِ عالم حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ رحمۃ اللہ علیہ کے اجلِ خلفاء میں سے ہیں، راجہ حامد شاہ نے شیرازِ ہند پورب کو اپنا روحانی مرکز بنا کر سلاطین شرقیہ کے دور میں دہلی ثانی جون پور میں دین و دیانت اور خیر و برکت کی بزم سجائی، ان ہی کی اولاد میں ایک بزرگ حضرت راجہ سید مبارک شاہ بن راجہ سید احمد شاہ بن راجہ سید نور شاہ بن راجہ سید حامد شاہ مانک پوریؒ گذرے ہیں[2] جنھوں نے خاندانی روایات کے مطابق بلادِ پورب سے روحانی تعلق قائم رکھ کر یہاں پر دینی و روحانی فیوض و برکات جاری کیے اور دلوں کی تعمیر کے ساتھ ایک آبادی کی بھی تعمیر کی، یعنی دسویں صدی میں شہنشاہ ہمایوں کے دور میں (۹۳۷ھ تا ۹۶۳ھ) بلادِ پورب کے ایک قدیم اسلامی و دینی اور صنعتی قصبہ قاسم آباد کے کھنڈروں پر اپنے نام سے قصبہ مبارک پور کی طرحِ نو ڈالی[3]

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۴۔ [2] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۷۰ و آئینہ اودھ ص ۲۶۱۔
[3] اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء، ص ۲۶۱، و واقعات و حوادث مبارکپور قلمی ص ۹۱ و ص ۹۴

راجہ مبارک شاہ اپنے ہمراہ کڑا مانک پور سے ایک دینی وروحانی اور علمی خانوادہ یہاں لائے، بعد میں اس کو اپنا جانشین مقرر کر کے خود مانک پور تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا، ایک خاندانی روایت کی رو سے یہ خاندان بھی سید شہاب الدین کے ہمراہ دہلی سے آکر کڑا مانک پور میں آباد ہوا اور بعد میں راجہ مبارک شاہ کے ہمراہ مبارک پور آکر رہ بس گیا، یہ قصبہ ہذا کا پہلا گھرانا ہے جو آباد ہوا اور راجہ صاحب کے مانک پور چلے جانے کے بعد ان کا قائم مقام اور ان کی مسجد کا متولی بنا، اس کے بعد اطراف وجوانب سے مسلمان آکر آباد ہوئے اور ان کی دینی وعلمی سربراہی اسی خاندان میں رہی۔

یہ خانوادہ قصبہ ہذا اور اطراف وجوانب کی مسلم بستیوں میں شرعی امور ومعاملات کا معتمد ومتولی ہو کر نیابت قضاء کا عہدہ نہایت دیانتداری اور ذمہ داری کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ سنبھالتا رہا، حالانکہ بعد میں قصبہ کے اندر اور اطراف وجوانب میں ریاست وامارت اور علم وفضل کے کئی اور خانوادے آکر آباد ہو گئے تھے، خاص قصبہ میں شیخ محمود بائیسی قریشی اور فاروقی شیوخ لہرا میں حضرت شاہ ابو الغوث گرم دیوانؒ اور حضرت شاہ ابو اسحٰق صاحب مصطفےٰ آباد میں صدیقی شیوخ، اور املو میں پیرزادہ شیخ محمد ماہ کے خاندان موجود تھے، اس کے باوجود نیابت قضاء کا عہدہ مغل دور سے لے کر انگریزی دور تک اسی خانوادہ میں ہونا اس کے اسلاف میں ہر طرح کے استحقاق کو بتا رہا ہے اور اگر اسلام میں دینی واسلامی عہدوں پر فخر کرنا جائز ہوتا تو اس کا جواز قصبہ میں صرف اسی خاندان کے لیے مخصوص ہوتا۔

حضرت شیخ علی شہیدؒ حضرت شیخ علی مبارکپوریؒ سے پہلے اس خاندان کے کسی بزرگ کا نام نہیں ملتا ہے۔ آپ کے حالات وواقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس خاندان میں علمی وروحانی دولت کے ساتھ ساتھ دنیاوی دولت وثروت اور مالداری بھی قدیم زمانہ سے تھی، شیخ علی کی پیدائش ۱۱۳۰ھ اور ۱۱۴۰ھ کے درمیان ہوئی ہوگی آپ خاندانی خوشحالی، مالداری اور نیابت قضاء کے ساتھ پہلوانی اور شہ زوری میں بھی مشہور

زمانہ تھے، اور اطراف و جوانب میں اس فن کے استاذ زمانے جاتے تھے، ذکر و شغل اور زہد و تقویٰ میں بہت آگے تھے، اور اد و وظائف اور معمولات پر آخری وقت تک کاربند رہے، اسّی سال سے زائد کی عمر میں اکھاڑہ اور پہلوانی کی رقابت میں شہید کر دیئے گئے۔ آپ کی شہادت کا واقعہ مقامی اصطلاح میں "علی شاہی" کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ علی حسن بن شیخ غلام مرتضیٰ فاروقی مبارک پوری نے "واقعات و حوادث مبارک پور" میں یہاں کا چھٹا حادثہ شیخ علی کی شہادت کو بتایا ہے اور تفصیل سے اس کا تذکرہ کیا ہے، شیخ علی نے عبادت و ریاضت، نیابتِ قضا اور شہ زوری اور پہلوانی میں نہایت شاندار اور کامیاب زندگی بسر کی، نوابانِ اودھ کے بعد انگریزی عمل داری دیکھی، حضرت مولانا شاہ ابو الغوث گرم دیوان لہراوی (ولادت ۱۱۰۰ھ وفات ۱۱۷۸ھ) کے زمانہ میں تھے غالب گمان ہے کہ دونوں حضرات میں علمی و دینی تعلقات استوار تھے۔

ہم شیخ علی حسن بن شیخ غلام مرتضیٰ کے بیان کا خلاصہ درج کرتے ہیں جو آپ کے حالات زندگی پر مشتمل ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ مسمی میاں جی علی قصبہ مبارک پور کے رئیس قدیم، نائب قاضی اور اکھاڑہ قدم رسول محلہ پورہ رانی کے خلیفہ تھے، اسی برس کی عمر کے باوجود قویٰ از بس قوی تھے، جوان لوگ کشتی میں عہدہ برآ نہ ہوتے، ایسے کشتی باز کہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کے شاگرد ایسے ایسے نامی ہوئے ہیں کہ اکثر ہندوستانی ریاستوں میں ان کا نام مشہور ہے قصبہ ہذا میں پانچ اکھاڑے نامی تھے، مگر ان پانچوں میں قدم رسول کا اکھاڑہ ہمیشہ سے سب پر بالا رہا اور میاں جی علی کے باعث ان کے شاگردوں نے اس اکھاڑے کو اور بھی نامی و گرامی بنا دیا۔ ان کے صدہا شاگرد تھے، جن میں سے غوثی خلیفہ، اور حاجی خوش حال خلیفہ، اور دوست محمد خلیفہ، اور واحد خلیفہ اور ولی خلیفہ اور عالم خلیفہ، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ، ان لوگوں نے فن کشتی میں ایسا نام پیدا کیا کہ ان کی پشت کو حالتِ کشتی میں کسی نے نہ لگایا اور نہ ان کے مقابلہ میں کوئی جوان کھڑا ہوا۔

شہادت کی کیفیت

شیخ علی کے حادثہ کی کیفیت یہ ہوئی کہ وہ ایک روز اپنے مکان میں نماز عصر کے بعد بیٹھے ہوئے وظیفہ پڑھ رہے تھے، ان کے اسی مکان میں ایک کرایہ دار رہتا تھا اور اس کا داماد اپنی منکوحہ کو رخصت کرانے کے لیے آیا تھا، کرایہ دار کا منشاء یہ تھا کہ فی الحال رخصتی کا سامان نہیں ہے چند روز کے بعد رخصتی ہو جائے گی، اس کا داماد رخصتی نہ ہونے پر اپنے گھر واقع محلہ پورہ خواجہ میں گیا اور ایک شخص کو جو بنارس کا رہنے والا تھا اور لوگوں میں ناحق فساد کراتا تھا لیواکر اپنی سسرال آیا، نیز اس کے ساتھ چار پانچ مفسد اور بھی تیار ہو کر آئے اور حجت و تکرار کے بعد مار پیٹ شروع ہو گئی۔ جب کرایہ دار نے شور کیا تو میاں جی علی مرحوم وظیفہ سے اٹھ کر ان کمبختوں کو منع کرنے لگے، ان کو اسی بنا پر اس مفسد نے ایک طمانچہ مارا یہ بے چارے تو ضعیف تھے ہی آنکھ سے کم معلوم ہوتا تھا اس لیے وہاں سے ہٹ آئے اور جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ پورہ خواجہ کے بدمعاشوں نے میاں جی علی کو مارا ہے تو وہ شور و غوغا ہوا کہ الامان، ان کے شاگردوں نے یہ صلاح ٹھہرائی کہ ابھی چل کر پورہ خواجہ کو لوٹ لو۔ میاں جی نے ہر چند حیلہ حوالہ کیا کہ مجھ کو کسی نے نہیں مارا ہے، جانے دو عملداری انگریزی ہے سب کے سب لوگ تباہ و برباد ہو جائیں گے یہ وقت نماز مغرب کا تھا۔ آخر صلاح ٹھہری کہ کل علی الصباح پورہ خواجہ میں جا کر مفسدوں سے مقابلہ ہوگا بلکہ پورہ خواجہ کے لوگوں کو اس کی اطلاع بھی کر دی۔ صبح کے وقت شیخ علی کے جس قدر شاگرد پورہ رانی اور پورہ خضر کے تھے غریب شاہ کے باڑہ واقع پورہ خضر میں جمع ہوئے، حاصل کلام ٹھاکر دوارہ کے پورب ایک باغ تھا جس میں ایک قبرستان ہے وہیں دونوں جماعتوں میں مقابلہ ہوا، پورہ خواجہ کے ایک شخص غلام نامی نے بندوق چلائی، نیز معرکہ میں دو آدمی اور بھی پورہ خواجہ کے بندوقچیوں نے سر کی، جب میاں جی علی کی طرف کے لوگوں نے یہ دیکھا تو دو تین جوانوں کو آہنی ہتھیار اور تلوار لانے کے لیے بھیجا، اس معرکہ میں خوش حال حاجی، واحد خلیفہ، لالو اور کوئی حجام نے ایسی دادِ شجاعت دی اور ایسی جواں مردی سے لڑے کہ تلوار بندوق ہونے کے باوجود پورہ خواجہ کے سب لوگ بھاگ گئے، مگر ایک شخص غلام محمد جو بنارس کا رہنے والا تھا

اور چند روز سے اس محلہ میں رہتا تھا، میدان جنگ میں ثابت قدم رہا، اور آخر میں ایک تلوار لگنے سے وہیں مر گیا۔

اِدھر لوگ لڑنے میں مصروف تھے اور اس طرف یہ کیفیت ہوئی کہ میاںجی علی کو شاگردوں نے مکان میں بٹھا کر تاکید کر دی کہ آپ مکان سے ہرگز باہر نہ نکلیں مگر وہ آہستہ آہستہ پیچھے سے چلے آئے اور جب ٹھاکر دوارہ کے پاس والی سڑک کے قریب پہونچے تو ایک شخص واحد ولد درویش نے تنہا پا کر ایک گنڈاسہ سے ان کا کام تمام کر دیا اور دوسرے شخص نے تلوار ماری، اس حادثہ کے بعد جانبین میں جنگ اور تیز ہو گئی، بعد میں شیخ علی اور غلام محمد کی لاشیں اعظم گڈھ بغرض معائنہ گئیں اس کے بعد گورکھپور کے انگریز جج کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا، کیونکہ اس وقت اعظم گڈھ میں صرف کلکٹری تھی ججی نہیں تھی، اس مقدمہ میں شیخ علی کے چھ شاگرد اور پورہ خواجہ کے دو شخص سزا یافتہ ہو کر سات سات سال کے لیے قید ہوئے حاجی خوشحال خلیفہ اور دوست محمد خلیفہ ہزاری باغ کے جیل خانہ میں فوت ہوئے اور باقی لوگ سزا کی میعاد پوری کر کے گھر لوٹ آئے۔[1] ایک خیال ہے کہ مبارکپور کا مشرقی محلہ علی نگر آپ ہی کے نام پر آباد کیا گیا ہے۔

اس زمانہ میں مبارکپور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ضلع گورکھپور میں تھا، گورنر جنرل ولزلی اور نواب سعادت علی خاں - نواب اودھ کے درمیان ۱۰ر نومبر ۱۸۰۱ء (۱۲۱۶ھ) میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے اعظم گڈھ کے تمام علاقے نوابی اودھ سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت آگئے اور ۲۸ر دسمبر ۱۸۳۲ء (۱۲۴۸ھ) کو برطانوی حکومت نے اعظم گڈھ کو مستقل ضلع قرار دیا۔

حضرت قاضی شیخ علی کی شہادت ۱۲۲۸ھ کے بعد ہوئی اس زمانہ میں اس خانوادہ کا آبائی مکان راجہ صاحب کی مسجد کے پاس تھا اور وہیں شیخ علی رہتے تھے، آپ کی تدفین بھی آبائی قبرستان میں ہوئی جو قصبہ کے دکھن جانب شیوالہ اور پوکھرا کے پورب لب سڑک تھا اور

---

[1] واقعات و حوادث مبارکپور ص۳۴ تا ص۳۵ ملخص۔

اب اس پر مکانات بن رہے ہیں۔

شیخ امام بخش بن شیخ علیؒ آپ حضرت شیخ علی کے صاحبزادے اور ان کے سچے جانشین تھے، زہد و تقویٰ اوراد و وظائف، اور اشراق و تہجد کے پابند اور نیکی و شرافت میں مشہور زمانہ تھے، آپ کے بارے میں متعدد اسناد و فرامین اور کاغذات موجود ہیں جن سے دین و دیانت اور صلاحیت و تقویٰ کی شہادت ملتی ہے۔ حضرت مولانا شاہ ابو اسحاق صاحب لہراوی متوفی ۱۲۳۴ھ کے زمانہ میں نیابتِ قضا کے عہدے پر فائز تھے جامع مسجد راجہ صاحب کے مستقل امام تھے، ۱۲۳۳ھ میں سکٹی اور مبارک پور کے لیے جمعہ و عیدین کے مستقل امام بنائے گئے، اس کے بعد ۱۲۵۰ھ سے ۱۲۶۱ھ تک قصبہ کے ایک حلقہ کے قاضی رہے جبکہ اسی زمانہ میں آپ کے دو صاحبزادے قاضی شیخ محمد رضا اور قاضی شیخ حسام الدین دوسرے حلقوں کے قاضی تھے، نیز اسی درمیان میں اپنے پوتے قاضی شیخ حسام الدین دوسرے حلقوں کے قاضی تھے، نیز اسی درمیان میں اپنے پوتے قاضی شیخ محمد رحیب بن شیخ محمد رضا کے نام کو بھی بحیثیت قاضی کے سند قضا میں درج کرایا۔ آپ کے زمانہ میں دار القضاء محمد آباد میں تین قاضی گذرے ہیں۔ مولانا قاضی محمد رؤف صاحب، مولانا قاضی محمد سلیم صاحب اور مولانا قاضی محمد شاہ عالم صاحب ان سب حضرات نے شیخ امام بخش کو "دیانت آثار" قرار دیا، اور ان کے کارناموں کو پسند فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔

چند سندیں شیخ امام بخش صاحب کے متعلق سب سے پرانی سند وہ تحریر ہے جو ۱۸۱۷ء (۱۲۳۲ھ) میں سکٹی میں عیدین کی امامت کے سلسلے میں پائی گئی ہے۔ یہ دار القضاء کی طرف سے نہیں ہے بلکہ کوئی بزرگ سید ناصر علیؒ کی جانب سے ہے، غالباً یہ صاحب ان اطراف کے شرعی محتسب تھے۔ اس تحریر کی نقل حسب ذیل ہے:

(مہر) | سید ناصر علی ۱۲۰۰

"نور بافان، زمینداران وغیرہ ساکنانِ موضع سکٹی بدانند، چوں مسمی امام بخش

را بعہدہ خطبہ خوانی در عیدین ثابت مقرر و مفوض نمودہ شد، لازم کہ نام زدہ را معصوب و مستقیم دانستہ ہمراں ایشان بمسجد شریف حاضر شدہ نماز خطبہ گذارند، واُدا سازند کہ ایشاں دینداری ظاہر شود و مشارالیہ را نیز باید کہ مردماں را از حسنِ سلوک خود راضی شاکر دارد، و بکار مرجوعہ خود حاضر و مستعد باشد، درصورت اختلاف امور دینداری دیگرے مقرر نمودہ خواہد شد، دریں تاکید مزید بلیغ دانستہ حسب المسطور بعمل آرند ۔"

تحریر بتاریخ بست ہفتم ماہ رمضان المبارک ۱۲۴۲ھ فصلی ۔

اس تحریر کی پشت پر یہ عبارت ہے ۔" دوازدہ ماہ اگست ۱۸۱۷ء، کاغذ ہذا بدست شاہ محمد، ساکن مبارک پور ۔"

شیخ امام بخش صاحب کے ابتدائی زمانہ میں دارالقضار محمد آباد کے قاضی مولانا محمد روف صاحب تھے، ان کے بعد ۱۲۴۹ھ میں مولانا محمد سلیم مچھلی شہری قاضی ہوئے جن کا انتقال ۱۲۶۶ھ میں ہوا ۔ ان کے بعد قاضی محمد شاہ عالم صاحب دارالقضار کے قاضی ہوئے، افسوس کہ مولانا قاضی محمد رؤف صاحب کی طرف سے نیابت قضار کی سندیں جو شیخ امام بخش کو ملی تھیں ان میں سے خاندان میں کوئی محفوظ نہ رہی، البتہ قاضی محمد سلیم صاحب اور قاضی محمد شاہ عالم صاحب کی سندیں موجود ہیں ۔

شیخ صاحب کو قاضی محمد سلیم صاحب نے دو سندیں ۱۲۵۰ھ اور ۱۲۵۱ھ میں عطا کیں ۔ جو حسب ذیل ہیں ۔

"دیانت آثار شیخ امام بخش، ساکن مبارک پور، متعلقہ دار القضاء پرگنہ محمد آباد گہنہ بعافیت باشند۔

چونکہ ایشاں از عہد جناب قاضی مرحوم بکفالت عہدۂ نیابت قضاء مامور شدہ الی الیوم انجام آں باحسن وجوہ دادہ آمدہ اند کہ موجب خوشنودی ایں نیاز مند حضرت ایزد نیز متصور گردیدہ، وحالات دینداری وامانت گذاری ایشاں مکرر بسماعت و معائنہ رسیدہ، لہٰذا ایشاں را بدستور سابق برعہدۂ مذکورہ بحال داشتہ سند ہذا عنایت فرمودہ شد، باید کہ ہیچ دقیقہ از دقائق دیانت وامانت، وترویج رسوم دینداری، والتزام روش سید المرسلین صلعم، واقامت جمعہ وجماعات، وتحریض مردم بطاعات واقتدائے شرعیہ، وسلوک طریق سنت سنیہ، ونکاح مسلمین، واصلاح ذات البین وقت مخاصمت مومنین مہمل وغیر مرعی نگذارند، دریں باب تاکید دانند، المرقوم نوزدہم شہر ربیع الآخر ۱۲۵۰ھ ہجریۃ"

ہے موضع

پورہ خضر متعلقہ مبارک پور، پورہ شاہ محمد پور متعلقہ مبارک پور۔ پورہ صوفی متعلقہ ایضاً، پورہ دولہن متعلقہ ایضاً، حسین آباد، سکٹی، سرائے مبارک، مصطفیٰ آباد، سون پار، سونا بر، کجھرا، چاندی، تحریر بتاریخ ....

اس کے ایک سال بعد ۱۲۵۱ھ میں قاضی محمد سلیم صاحب نے دوسری سند عطا کی جس میں شیخ امام بخش کے پوتے شیخ رجب کا نام بھی درج ہے، یہ سند حسب ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(مہر) ۱۲۴۸ محمد سلیم احمدی

"دیانت آثار میانجی امام بخش ورجب نکاح خوانان مبارک پور اعلام آنکہ حال اکثر عوام...... بمفروضہ تکاسل میکنند وتاکید وترغیب آنہا بر ذمہ

عہدہ داران شریعت واجب، لہذا اعلام دادہ می شود باید کہ بطریق احسن مومنان
ساکنان علاقہ نکاح خوانی خود را تاکید اقامت صلوٰۃ نمایند، درصورتیکہ از طرف احدے
تعذر و عدم فہمید سخن حق واضح شود، خواہ در اعلاء کلمۃ اللہ و اجرائے شعار دین افساد و
برہم کارے بظہور رسد، اطلاع ایں معنی بقید نام شخص مذکور در دار القضاء نماکنند،
ازیں بعون اللہ و حولہ و قدرتہ و مشیتہ تعالیٰ و تقدس البتہ تدبیرے مناسب حال
آنکس بعمل خواہد آمد، دریں باب تاکید شدند، و قدغن بلیغ دانستہ کمال جانفشانی
بظہور رسانند، و غفلت یک لحظہ روا ندارند، و الا باز پرس حاکم ملک الحکم الحاکمین
جلت عظمتہ تصور رسانند، فقط، دوازدہم شہر مبارک ۱۲۵۱ سنہ ہجریۃ قدسیہ
علی صاحبہا السلام والصلوٰۃ والتحیۃ"

اس سند کی پشت پر یہ تحریر درج ہے۔ شیخ سعادت علی عفی عنہ، المرقوم پانزدہم۔
شہر صیام ۱۲۵۱ سنہ ہجریۃ، صلعم۔

اس کے دس سال بعد قاضی محمد شاہ عالم صاحب نے ۱۲۶۱ھ میں اپنی طرف سے سند
عنایت کی اور ان کی مہر میں بھی ۱۲۵۱ھ درج ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت مولانا محمد سلیم
صاحب کی جگہ یہ قاضی محمد شاہ عالم صاحب آگئے تھے۔ نیز ان کی مہر میں ضلع اعظم گڈھ درج ہے
اور سند میں محال و مواضعات کے وہی نام درج ہیں جو ۱۲۵۰ھ کی سند میں تھے، البتہ چند محلوں کے
علاقوں کی نشاندہی کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں تین مشہور و معزز لوگوں کے نام آئے ہیں نیز
اس سند سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ امام بخش قاضی محمد رؤف صاحب کے زمانہ سے اس عہدہ پر فائز
تھے، ان کی سند حسب ذیل ہے۔
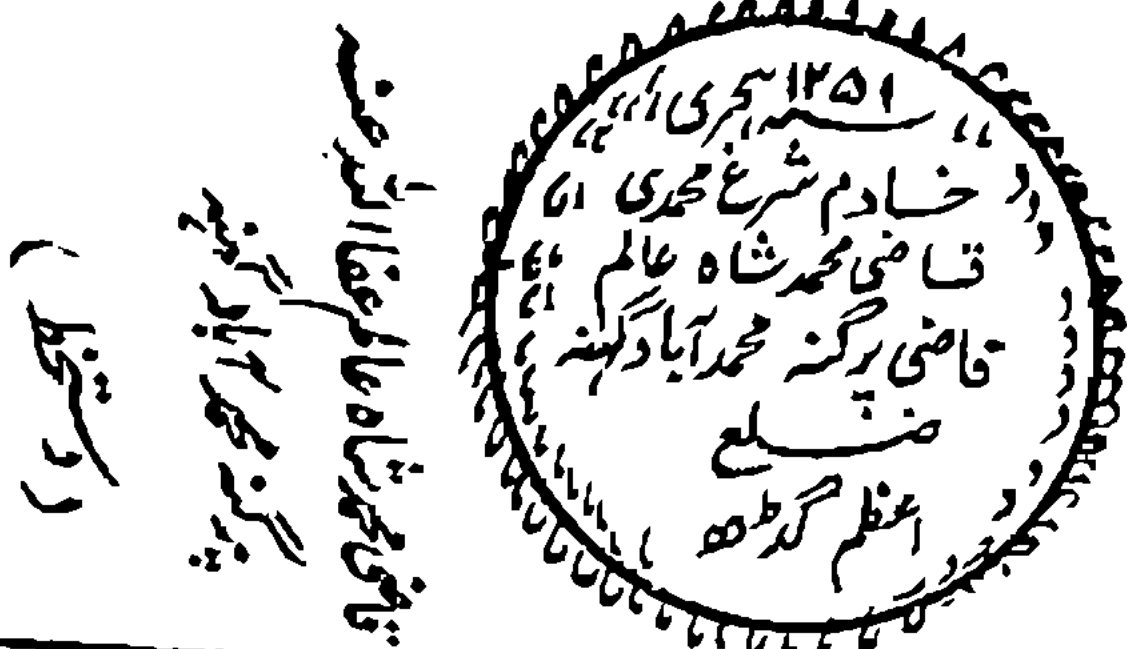
۱۲۵۱ ہجری
خادم شرع محمدی
قاضی محمد شاہ عالم
قاضی پرگنہ محمد آباد گوہنہ
ضلع
اعظم گڈھ

(مہر)

(دستخط)

دیانت آثار شیخ امام بخش ساکن مبارک پور، متعلقہ دار القضاء پرگنہ محمد آباد گہنہ

بعافیت باشند۔

"چوں ایشان از عہد جناب قاضی مولوی محمد رؤف صاحب مرحوم و مغفور،

و سر بعہدۂ جناب قاضی مولوی محمد سلیم صاحب بکفالت عہدۂ نیابت قضاء ما مور شدہ

الی الیوم۔ انجام آن باحسن وجوہ دادہ آمدہ اند، نظر برین ایشان را بدستور سابق

بر عہدہ مذکورہ بحال گذاشتہ سند ہذا عنایت فرمودہ شد، باید کہ ہیچ دقیقہ

از وفائق دیانت، و امانت، و ترویج رسوم دینداری، و التزام روش سید المرسلین صلعم

و اقامت جمعہ و جماعات و تحریص مردم لطاعات، و اقتدار آداب شرعیہ، و سلوک

طریق سنت سنیہ و نکاح مسلمین، و اصلاح ذات البین و فنت مخاصمت مومنین

مہمل و غیر مرعی نگذارند، دریں باب تاکید بلیغ دانند"

تفصیل دہات نیابت مذکور

پورہ خضر متعلقہ مبارک پور طرف محمد مہتر، پورہ شاہ محمد متعلقہ ایضاً، پورہ صوفی

متعلقہ سکٹی طرف خان محمد، پورہ دولھن متعلقہ ایضاً طرف ضیاء الدین، حسین آباد،

سکٹی، گجہڑا، سرائے مبارک، سون پار، پرانی لبستی، طرف ..... سونا بر، چانڈی۔

المرقوم بست و یکم ماہ ربیع الآخر ۱۲۶۱ھ ہجری۔

ان ہر چہار اسناد سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ قاضی شیخ امام بخش "دیانت آثار" بزرگ

تھے، نیابت قضاء کی جملہ ذمہ داریاں بوجوہ احسن انجام دیتے تھے، اسی لیے دو دو قاضی

القضاۃ نے ان کے حالات دین داری و امانت داری کو خود سن کر اور دیکھ کر ان کی صلاحیت

و قابلیت کی تحریری شہادت دی۔ اور اس عہدہ پر آئندہ ان ہی کو باقی و برقرار رکھا قصبہ اور

ملحقات کے ۱۲ مقامات میں قضاء کی نیابت فرماتے تھے جس میں نکاح خوانی کے علاوہ

ترویج رسوم دین داری، التزام سنت رسول، اقامت جمعہ و جماعات، وعظ و تذکیر

مآثر و معارف

مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ، زن وشوئی کے معاملات وقضایا کا حل، اور اس قسم کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دیگر کام انکے سپرد تھے جن کی ادائیگی میں یوں سعی بلیغ فرماتے تھے کہ دار القضاء پوری طرح مطمئن رہتا تھا۔

ایک حادثہ جس زمانہ میں شیخ امام بخش راجہ صاحب کی جامع مسجد میں جمعہ اور پنجوقتہ نمازوں کے امام تھے قصبہ ہذا میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا جس کا تعلق جامع مسجد سے ہے۔ شیخ علی حسن فاروقی نے اپنی کتاب "واقعات وحوادثِ مبارک پور" میں "سولھواں واقعہ فخر الدین شاہی" کے عنوان سے اس کی تفصیل درج کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فخر الدین نامی ایک مفسد آدمی موضع آستانہ بھیرا سے آکر اپنی سسرال مبارک پور میں رہتا تھا، اس نے اپنی ذاتی مصلحت کی بنا پر جامع مسجد کی سیڑھی پر سور کے بچّے کا سر کاٹ کر رکھا۔ یہ حرکت اس نے فجر کی نماز کے وقت کرنا چاہی، مگر ہمت نہیں پڑی نمازی فارغ ہوکر اپنے اپنے مکان چلے گئے اور میاں جی امام بخش کہ وہ اس مسجد کے نمازِ یومیہ کے امام تھے، ان کا معمول تھا کہ نماز صبح کے بعد درود ووظیفہ میں رہتے تھے، اور جب آفتاب طلوع ہوتا تھا تو نمازِ اشراق پڑھ کر مکان جاتے تھے چنانچہ وہ نماز صبح کے بعد مسجد میں اپنے معمولات میں مصروف تھے جب آفتاب طلوع ہوا اور انھوں نے نماز اشراق ادا کی تو کہیں کچھ نہیں تھا۔ جب وظیفہ سے فارغ ہوکر مکان کو چلے تو دیکھا کہ وہ مفسد فخر الدین مسجد کے دروازے پر ٹہل رہا ہے اور جب آپ اوٹ میں ہوئے تو وہ بچۂ خوک کو جلدی سے قدم بڑھا کر اور اس تختۂ سنگی کے نیچے رکھ کر چلدیا، جس پر نمازی وضو کرنے کے بعد پیر رکھ کر مسجد کے فرش پر جاتے تھے، دو گھڑی دن نکلنے تک کسی کو کچھ خبر نہیں لگ سکی تو خود اس نے دو چار شخصوں کو جمع کر کے شور مچایا، قصبہ میں ہنگامہ ہوا اور اعظم گڈھ سے گبن صاحب کلکٹر آیا، اور مسلمانوں کے جوش وخروش کو دیکھ کر بھاگ گیا، آخر اس مفسد کا پتہ چلا، اور تین سال کی سزا ہوئی[1]۔ یہ حادثہ حدود ۱۲۶۰ھ میں رونما ہوا اور اس کے بعد آپ نے

---

[1] واقعات وحوادث مبارک پور ص۶۶، ص۶۷ قلمی ملخص۔

انتقال کیا اور آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

شیخ محمد رضا ابن شیخ امام بخش اور ان کی سندیں

شیخ امام بخش کے دو صاحبزادے تھے، شیخ محمد رضا اور شیخ حسام الدین اور دونوں بھائی اپنے والد کی حیات ہی میں قصبہ اور ملحقاتِ قصبہ میں نیابت قضار کی خدمت انجام دیتے تھے، ابتدار میں یہ عہدہ شیخ حسام الدین کو سونپا گیا تھا، مگر بعض شرعی معاملات میں وہ دار القضار کے معیار پر پورے نہ اتر سکے تو ان کو ۱۲۴۷ھ میں معزول و موقوف کر کے ان کے بھائی شیخ محمد رضا صاحب کو یہ عہدہ دیدیا گیا اس زمانہ میں مولوی محمد رؤف صاحب قاضی تھے۔ موصوف نے شیخ محمد رضا صاحب کو نیابت قضا کی جو سند دی تھی یہ ہے۔
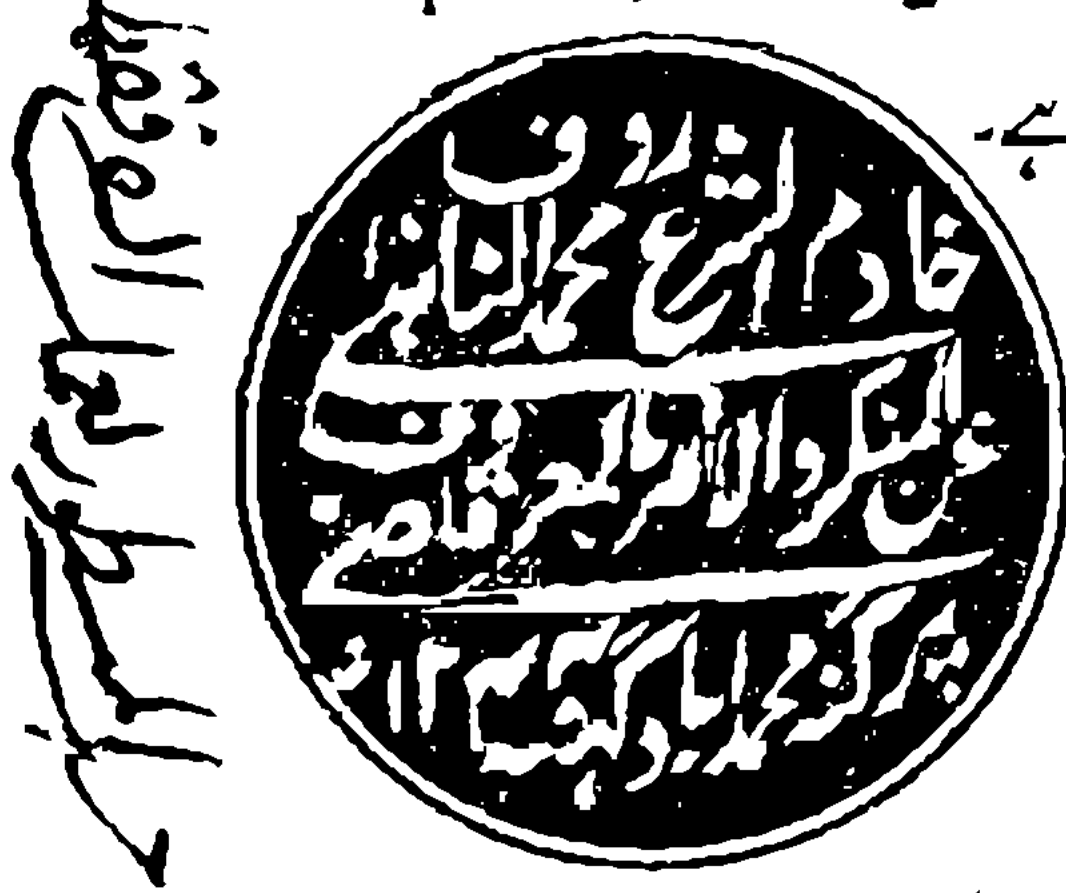
محمد رضا ساکن مبارک پور بعافیت باشند

"چوں سابق ازیں سند عہدۂ نکاح خوانی بنام حسام الدین شدہ بود، و حالاً بسبب قصورات چندکہ خلاف شرع بود، از عہدۂ مذکور نامزدہ را موقوف کردہ بجائے شاں ایشان را العہدۂ نکاح خوانی بفصلۂ ذیل مقرر نمودہ شد، باید کہ ایشاں مستعد بودہ نکاح خوانی وغیرہ بموجب شرع شریف می پرداختہ باشند، و در روزہ نماز مسلمانان را ترغیب و ہدایت ..... باشند و خلافِ شرع شریف کدام امر مکروہ باشند دریں باب تاکید کردہ شد، پورہ رانی، داؤد پور، ڈھکوا، اسادر، سٹھیاؤں۔

المرقوم ہشتم رمضان المبارک ۱۲۴۷ھ ہجری قدسی۔"

اس سند کی پشت پر یہ عبارت تحریر ہے "سند جدید دادہ شد المرقوم بستم ربیع الآخر

۱۸۳۴ء موافق ۱۲۵۰ھ ہجریہ، قاضی محمد سلیم منصف۔"

مولانا محمد سلیم صاحب ۱۲۴۹ھ میں قاضی القضاۃ بنائے گئے تھے، ان کی طرف سے جو سند جلیہ ۱۲۵۰ھ میں شیخ محمد رضا صاحب کو دی گئی اس کی نقل یہ ہے۔

(مہر) — خادم شرع الرسول الکریم عبدہ القاضی محمد سلیم قاضی پرگنہ محمد آباد گوہنہ — منظور شدہ
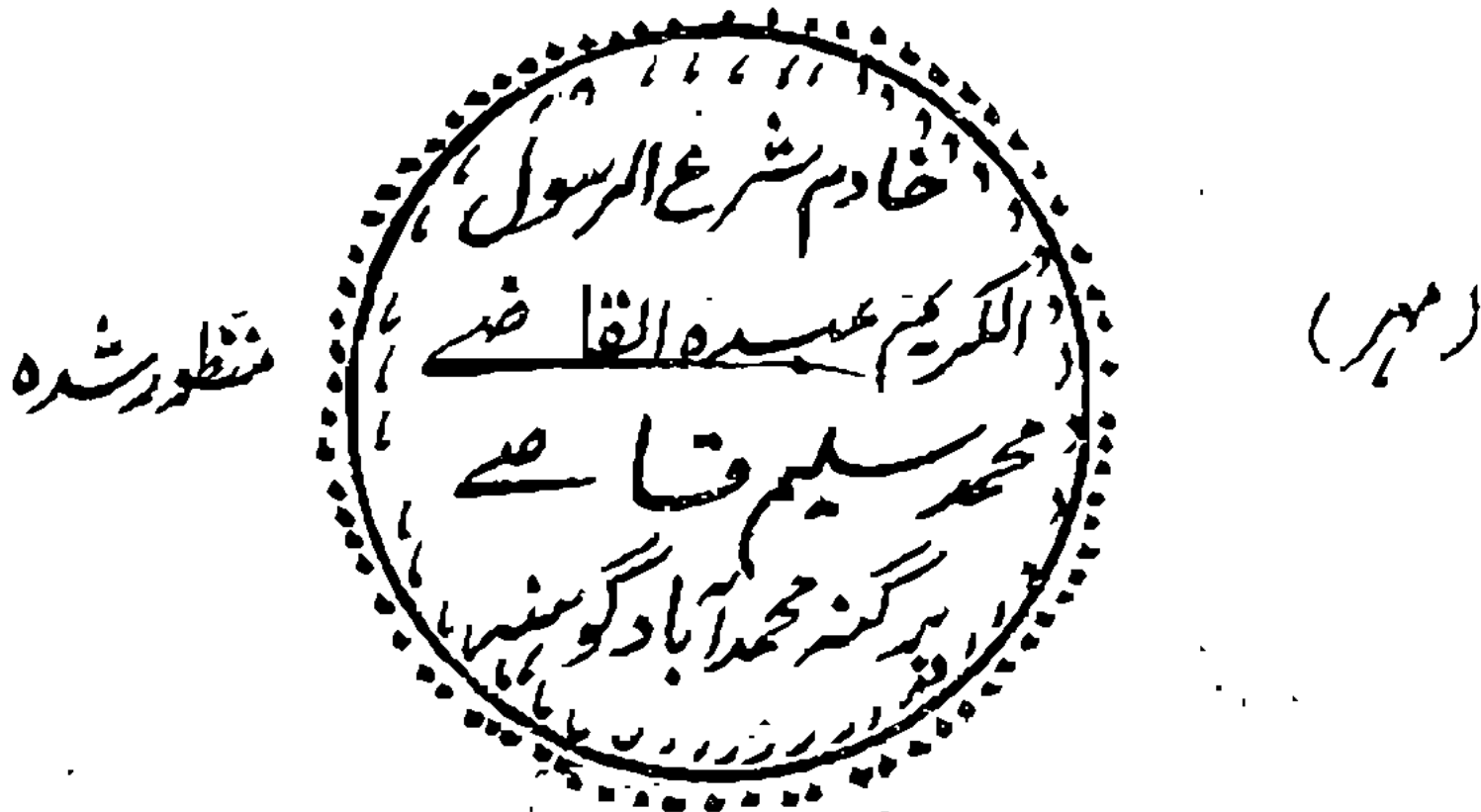
"دیانت آثار شیخ محمد رضا ساکن مبارک پور متعلقہ دار القضاء پرگنہ محمد آباد گوہنہ بعافیت باشند چونکہ ایشان از عہد جناب قاضی مرحوم بکفالت عہدۂ نیابت قضا مامور شدہ الی الیوم انجام آن باحسن وجوہ دادہ آمدہ اند کہ موجب خوشنودی این نیازمند حضرت ایزدی نیز منصور گردیدہ وحالات دین داری وامانت گذاری ایشان مکرر بسماعت ومعائنہ رسیدہ، لہٰذا ایشان را بدستور سابق برعہدۂ مذکور بحال داشتہ سند ہذا عنایت فرمودہ شد، باید کہ ہیچک دقیقہ از دقائق دیانت وامانت، ترویج رسومِ دین، والتزامِ روش سید المرسلین صلعم، واقامت جمعہ وجماعات وتحریص مردم بطاعاتِ و اقتداء آداب شرعیہ، وسلوک طریق سنت ونکاح مسلمین واصلاح ذات البین دقت مخاصمتِ مومنین مہمل وغیر مرعی نگذارند، دریں باب تاکید بلیغ دانند، المرقوم شہر ربیع الثانی ۱۲۵۰ھ
پورہ رانی، داؤد پور، ڈھکوا، اساور، سٹھیاؤں، تحریر بتاریخ ...... مکرر ارشاد:
مدار پور، سلار پور، چیونٹھی۔ بمہور، حاجی پور، پورانی بستی۔ اینٹھی، بنڈریا سکندر پور، گونجر پار، منظور است۔"

شیخ محمد رضا کی امانت گذاری اور دیانت داری کے مکرر سماع ومعائنہ کے بعد قاضی محمد سلیم صاحب

نے نہ صرف یہ کہ ان کو سندِ جدید دی، بلکہ ان کا حلقۂ نیابت وسیع کر دیا گیا، اور مکرر ارشاد کے ذریعہ ان کو مزید اعزاز بخشا گیا، اور بیندرہ مقامات میں ان کو نائب قاضی بنایا گیا، پورب میں پرانی بستی تک، دکھن میں ستھیاؤں تک، پچھم میں مہوراور حاجی پور تک، اور اتر میں کو نجریا اور ہنڈیا تک ان کی قضا کی حدود تھیں، اور وہی اس پورے علاقہ کے مسلمانوں کے جملہ شرعی امور و معاملات کے ذمہ دار تھے، جن میں نکاح خوانی سے لے کر امر بالمعروف نہی عن المنکر، اقامتِ جمعہ و جماعات اور ہر قسم کے جھگڑے اور مقدمات کے فیصلے شامل تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ محمد رضا صاحب کی علمی و دینی قابلیت و بصیرت کس قدر بلند تھی۔[۱]

---

[۱] مولانا قاضی شیخ محمد سلیم بن محمد عطار جعفری مچھلی شہری جون پوری ۱۲۲۲ھ میں مچھلی شہر میں پیدا ہوئے اور عربی کی تعلیم وہیں مفتی علی کبیر بن علی محمد مچھلی شہری متوفی ۱۲۶۹ھ سے حاصل کر کے مولانا قاضی محمد شکور صاحب مچھلی شہری متوفی ۱۳۰۰ھ سے اکثر کتب درسیہ پڑھیں، بعض کتابیں مولانا رحمت اللہ کابلی سے بھی پڑھیں، آپ علوم و فنون میں شخصیت بارزہ رکھتے تھے، فراغت کے بعد قسمت نے یاوری کی، اور قاضی بنائے گئے پھر ترقی کر کے صدارت قضا کے عہدہ کو پہونچے جو اس زمانہ میں اہل علم کے لیے سب سے اونچا عہدہ ہوتا تھا، ۱۲۵۰ھ میں دار القضا پرگنہ محمد آباد گوہنہ کے قاضی مقرر کیے گئے اس پرگنہ میں جتنے قصبات و مواضعات تھے سب میں آپ کے ماتحت قاضی مقرر تھے، اس زمانہ میں ان اطراف میں ہر طرف دینی و علمی فضا قائم تھی، آپ کے عطا کردہ اسنادِ قضا میں سے قاضی محمد رضا صاحب مبارک پوری اور مولانا محمد طاہر صاحب معروفی متوفی ۱۲۹۶ھ کی سندیں اب تک محفوظ ہیں۔ مولانا علی احمد صاحب بھیروی نواسۂ شاہ ابو اسحٰق صاحب نے آپ سے اکثر کتب درسیہ کی تعلیم حاصل کی تھی، آپ نے شبِ یکم جمادی الاول ۱۲۶۶ھ میں بمقام اعظم گڈھ انتقال کیا، اس وقت عمر ۴۴ سال کی تھی، مولانا محمد سلیم صاحب کی تصنیفات میں یہ کتابیں ہیں (۱) رقیۃ السلیم، حدیث میں (۲) حاشیہ شرح چغمینی ہیئت میں (باقی صفحہ آئندہ پر)

آپ نے یہ عہدہ نہایت ہوشیاری وہوش مندی اور ذمہ داری سے سنبھالا اور امور مفوضہ کو بوجوہ احسن انجام دیا جس کے نتیجہ میں دس^{۱۰} سال کے بعد قاضی القضاۃ مولانا محمد شاہ عالم نے اپنی طرف سے یہ سند عنایت فرمائی۔

خادم شرع محمدی
سنہ ۱۲۰۰ھ
قاضی محمد شاہ عالم
قاضی پرگنہ محمد آباد گوہنہ
ضلع
اعظم گڈھ
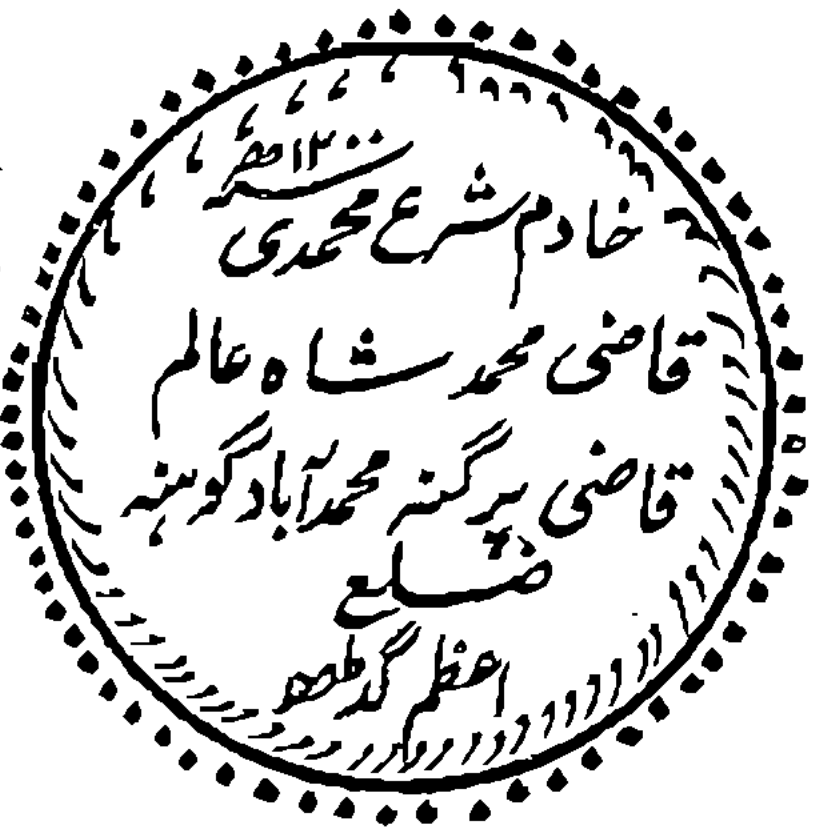
(مہر)

دیانت آثار شیخ محمد رضا ساکن مبارک پور خاص متعلقہ دار القضار پرگنہ محمد آباد گوہنہ بعافیت باشند۔

"چوں ایشان از عہد جناب قاضی مولوی محمد رؤف صاحب مرحوم ومغفور، وسر بعہد جناب قاضی محمد سلیم صاحب بکفالت عہدۂ نیابت قضار ماموربودہ انجام آن دادہ آمدہ اند' نظر بریں ایشاں را بدستور سابق بر عہدہ مذکور بحال داشتہ سند ہذا عنایت فرمودہ شد باید کہ ہیچ دقیقہ از دقائق دیانت وامانت، در ترویج رسوم دین داری، و پرہیز گاری، والتزام روش سید المرسلین صلعم واقامت جمعہ وجماعات، وتحریص مردم بطاعات، واقتدار

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (۳) ہفوات الامجاد، ادب عربی میں (۴) رسالہ جبر ومقابلہ، ریاضی میں (۵) میزان الوافی فی علم العروض والقوافی (۶) رسالہ تحقیق شہور (۷) جون پورنامہ، تاریخ میں (۸) دیوان اشعار فارسی جس میں عربی کے بھی بہت سے قصائد واشعار ہیں۔ لہ دلال گھاٹ اعظم گڈھ کی مسجد کے سامنے چہار دیواری میں آپ کی قبر اب تک موجود ہے۔ (تجلی نور ج ۲ ص ۱۳۲ و ص ۱۳۳ و تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۳۔

آدابِ شرعیہ، و نکاح مسلمین، و اصلاح ذات البین ہنگام تخاصم مومنین مہمل و غیر مرعی نگذارند، دریں باب تاکید، قدغن بلیغ داشتہ حسب المسطور بعمل آرند، المرقوم ہفتدہم ماہ ربیع الاول ۱۲۶۱ھ ہجریہ قدسیہ صلعم۔"

بفصل دہات متعلقہ نیابت مذکور

پورہ رانی، داؤدپور، ڈھکوا، اساور، سستھیاؤں، مدارپور، سلارپور، چیونٹھی، بہور، حاجی پور، انیٹھی۔ بنڈیا، سکندرپور، گوتھرپار، پیروپور، پورانی بستی۔

اس سند میں پیروپور کا اضافہ کیا گیا ہے، اس طرح کل سولہ مقامات و دیہات شیخ محمد رضا صاحب کے حلقۂ نیابت میں تھے، اور ان تمام بستیوں کے مسلمانوں کے جملہ اسلامی امور و معاملات کا تعلق آپ ہی سے تھا۔

شیخ حسام الدین شاہ بن شیخ امام بخش

شیخ حسام الدین شاہ بن شیخ امام بخش بن شیخ علی رحمۃ اللہ علیہ زہد و تقویٰ اور خدا ترسی و پارسائی میں بہت آگے تھے، اور ولیِ کامل سمجھے جاتے تھے، آپ کی بزرگی و ولایت کا شہرہ دور دور تک تھا، قاضی مولوی محمد رؤف صاحب کے دور میں مبارک پور کے حلقہ کے نائب قاضی تھے، مگر ۱۲۴۷ھ میں ان سے کچھ ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جو خلافِ شرع معلوم ہوتے تھے، اور باوجود تقویٰ و طہارت اور پارسائی و بزرگی کے آپ ان کی وجہ سے وہ شرعی امور و معاملات کے ذمہ دار اور نگراں نہیں بن سکتے تھے، اس لیے قاضی محمد رؤف صاحب نے شیخ حسام الدین صاحب کے بجائے ان کے بھائی شیخ محمد رضا صاحب کو نیابتِ قضا کا عہدہ سپرد فرمایا، چونکہ شیخ حسام الدین صاحب اس واقعہ کے بعد قانونی طور سے وعظ و ارشاد، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور دوسرے شرعی معاملات میں مجاز و ذمہ دار نہیں رہ گئے۔ حالانکہ ان کی زندگی ان ہی دینی کاموں میں گذر رہی تھی۔ اس لیے وہ نیابت قضا کے عہدے سے علیحدگی کے بعد درس و تدریس میں لگ گئے اور اسی علمی و دینی خدمت میں باقی زندگی گذار دی۔

خاندانی روایت کے مطابق شیخ حسام الدین شاہ صاحب جن کو لوگ حسامدی بابا کہتے تھے باہر کسی مقام پر مدرس تھے، وہیں سخت بیمار پڑے، اٹھا کر مبارک پور لائے گئے اور ۹ ریا ۱۰ رجمادی الاول ۱۲۹۷ھ کو انتقال فرمایا، مولانا عبدالعلیم صاحب رسول پوری نے اپنی ایک کتاب میں یادداشت کے طور پر آپ کی تاریخ وفات ان تاثرات و الفاظ میں درج کی ہے: " حسام الدین شاہ ازاولیاء کامل مبارک پوری انتقال کردہ بماہ جمادی الاول روز چہارشنبہ تاریخ ۹ و بقول بعضے ۱۰ ر کہ شش گھنٹہ روز باقی بود، ۱۲۹۷ھ "

شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضاؒ

شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش بن شیخ علی رحمہم اللہ اس خانوادۂ قضارت و مشیخت کے خاندانی عہدہ اور روایت کے آخری فرد تھے، جن پر صدیوں کی روایات کا خاتمہ ہو گیا۔ انگریزی حکومت نے اسلامی عدالتوں کو بند کر کے عام قانونی عدالتیں قائم کیں جس سے رہی سہی اسلامی روایت اور اس کے حاملین ختم ہو گئے۔ قاضی القضاۃ مولانا محمد سلیم صاحب نے ۱۵ ر رمضان ۱۲۵۱ھ کو شیخ امام بخش کو جو سندِ نیابت عطا کی تھی اس میں شیخ محمد رجب کا نام بھی سرنامہ میں شامل ہے، ان کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور امورِ شرعیہ میں ذمہ داری کے سلسلے میں خاندانی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زبردست عالم اور نہایت متقی و دیندار بزرگ تھے، ساتھ ہی اسلامی شان و شوکت کے مالک تھے، خاندانی رسم کے مطابق پالکی نشینی ان کے دور تک قائم رہی، جب ان کی پالکی نکلتی تھی تو اربابِ علم و فضل اس کے دائیں بائیں چلتے تھے، عموماً جمعہ کی نماز پڑھانے کے لیے پالکی ہی میں آتے جاتے تھے۔ ان کے پاس خاندانی مخطوطات و نوادرات اور کتابوں کا بیش بہا کتب خانہ بھی تھا جسے بعد میں لوگوں نے راجہ صاحب کی مسجد کے پاس والے کنویں میں ڈال دیا، البتہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک قرآن شریف اور تسبیح اور عصا خاندان میں موجود تھے، مگر بعد میں یہ تبرکات بھی ضائع ہو گئے، راقم کو ان کا مملوکہ مجموعۂ خطب مولانا اسمٰعیل شہیدؒ محلہ پرانی بستی کی ایک مسجد سے دستیاب ہوا ہے جو مطبوعہ ہے اور اس پر آپ کے ہاتھ کی تملیک کی تحریر اور دستخط موجود ہیں۔

پالکی

اور اس کے آخر میں آپ کے ہاتھ سے نہایت عمدہ عربی خط میں خطبہ ثانیہ لکھا ہوا ہے جس کے آخر میں ۱۲۹۲ھ درج ہے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید اور دوسرے مجاہدین حضرات کو مسلمانوں کا ایک طبقہ موردِ الزام ٹھہراتا تھا اور ان کی تکفیر و تفسیق کرتا تھا۔ ان کی کتابوں کو گھر میں رکھنا اور ان کو ہاتھ لگانا حرام سمجھتا تھا، اس زمانہ میں شیخ محمد رجب صاحب مولانا مرحوم کے خطبہ کو جمعہ اور عیدین میں پڑھتے تھے، ۱۲۵۱ھ میں مولانا محمد سلیم صاحب نے آپ کے دادا شیخ امام بخش صاحب کو جو سند قضا دی اس میں آپ کا نام بھی درج کیا مگر چونکہ اس وقت آپ نو عمر تھے اس لیے اس میں آپ کے نام کے ساتھ "شیخ" کا لفظ نہیں ہے۔

اولاد و احفاد

شیخ محمد رجب کے دو صاحبزادے تھے، میانجی حاجی لعل محمد اور میانجی ولی محمد میانجی ولی محمد کے دو لڑکے ہوئے میانجی محمد شفیع مرحوم اور میانجی حاجی محمد عمر جو ابھی حیات ہیں، میانجی حاجی لعل محمد صاحب زندگی بھر کسی نہ کسی درجہ میں خاندانی روایات کے حامل رہے، حج و زیارت کی دولت حاصل کی۔ ان کے چار صاحبزادے ہوئے، (۱) میانجی عبداللہ متوفی دوشنبہ ۱۵ رجب ۱۳۵۷ھ۔ (۲) میانجی حاجی اسداللہ متوفی شنبہ ۲۵ صفر ۱۳۸۲ھ (۳) میانجی حاجی محمد حسین متوفی ۲۵ رجب ۱۳۶۵ھ (۴) اور میانجی حاجی محمد حسن ۱۳۶۵ھ، میانجی عبداللہ سب بھائیوں میں بڑے تھے، بڑے قد و قامت رعب و داب اور سمجھ بوجھ کے آدمی تھے، میانجی شیخ علی مرحوم کی شہ زوری اور پہلوانی کی جھلک ان میں پائی جاتی تھی ان سے چھوٹے میانجی حاجی اسداللہ تھے، ان میں خاندانی روحانیت کا رنگ نمایاں تھا، اور صوفیاء و اہلِ دل کی صحبت میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے ان سے چھوٹے میانجی حاجی محمد حسین نیابت قضا کی رہی سہی روایت ذمہ داری کو سنبھالتے تھے، نکاح خوانی، جمعہ و عیدین کی امامت وغیرہ کرتے رہے مگر حج کے بعد جب بیمار رہنے لگے تو صرف قصبہ تک اپنے کام کو باقی رکھا اور دیہاتوں کے لیے دوسروں کو مقرر کر دیا اور میانجی حاجی محمد حسن صاحب اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے اور راقم کے والد ماجد ہیں اور الحمد للہ کہ ابھی حیات ہیں۔

(۲۵)

لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ

ہندوستان کے علمی و تحقیقی مفاخر میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی اور مجلس علمی ڈابھیل عالمی مقام رکھتے ہیں، ان کے علاوہ بعض دوسرے خالص علمی و تحقیقی ادارے بھی ہیں، جن کی خدمت ان اداروں سے کم نہیں ہے، ان ہی میں لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد بھی ہے مگر افسوس کہ ہندوستان کے اہل علم اس ادارے سے بہت کم واقف ہیں اور ارباب علم و تحقیق کے حلقہ کے علاوہ اس کا عام تعارف نہیں ہے، اس کی بڑی وجہ اس ادارہ کے مخلص ارباب نظم و نسق کی بے نیازی اور عام اہل علم کی بے پروائی ہے۔

۱۳۴۸ھ میں تاسیس

۱۳۴۸ھ میں حضرت مولانا ابوالوفا صاحب افغانی مدظلہ کی سرپرستی میں دس۱۰ مخلصوں نے مل کر اپنے طور پر ائمہ احناف کی امہات کتب شایع کرنے کے لیے لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ کے نام سے اس ادارہ کو قائم کیا اور متاخرین علمائے احناف کی جنایت کا کفارہ ادا کیا تھا، انھوں نے امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد اور دوسرے قدیم ائمہ احناف رحمہم اللہ کی تصنیفات کے مقابلہ میں علمائے متاخرین خصوصاً علماء ماوراء النہر کی کتابوں کو زیادہ اہمیت دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ائمۂ احناف کی امہات کتب کا رواج ہی نہیں بلکہ ان کا وجود بھی ختم ہونے لگا تھا، چنانچہ بہت سی قدیم اہم کتابیں عالم اسلام سے نیست و نابود ہوگئیں، جو باقی رہ گئیں، ان کے نادر و نایاب نسخے ایشیا اور یورپ کے کتب خانوں کی زینت بنے رہے، حالانکہ ان کے مقابلہ میں بہت کم درجہ کی کتابیں ہمارے علماء کی توجہ کا مرکز بنی رہیں،

۲۳ وہ داخلِ نصاب کی گئیں، ان کے شروح و حواشی لکھے گئے، اور ان کو وہ اہمیت دی گئی جس کی وہ کسی حال میں مستحق نہیں تھیں، اس صورتِ حال نے مولانا ابوالوفا صاحب افغانی اور ان کے چند رفقا ر کو آمادہ کیا کہ وہ صرف اخلاص اور علمی و دینی خدمت کے لیے خدا کے بھروسے پر یہ کام شروع کریں، چنانچہ انھوں نے اتنی خاموشی اور بے نیازی سے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا کہ ہندوستان کے اہلِ علم اس کی پوری قدر نہ کر سکے، اور نہ ائمہ فقہ و حدیث کی جو نادر و نایاب اور اہم کتابیں شایع ہوئیں ان سے دلچسپی لے سکے، کیونکہ عام مذاق کے مطابق احیار المعارف النعمانیہ کے کارکنوں نے اخبارات و رسائل اور دوسرے ذرایع سے پروپیگنڈا نہیں کیا، بلکہ کام میں لگے رہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس خالص علمی ادارہ سے ہم اس قدر بے خبر اور بے نیاز رہیں کہ اس کی مطبوعہ کتابوں تک سے نابلد ہوں، ہندوستان کے علمار اور خاص طور سے علمائے احناف کی یہ ناقدردانی بڑی افسوسناک ہے۔

البتہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے احیار المعارف النعمانیہ کا تذکرہ نہایت فاضلانہ انداز میں قدردانی اور ہمت افزائی کے طور پر کیا ہے خود اس کے بانی و صدر مولانا ابوالوفا صاحب افغانی نے راقم کے نام متعدد خطوط میں تحریر فرمایا ہے کہ "سید صاحب ہمارے کام کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اور جہاں کوئی نئی کتاب یہاں سے شایع ہوتی اور ان کی خدمت میں روانہ کی جاتی تو فوراً نہایت انشراح و انبساط کے ساتھ معارف میں اس کا ذکر فرماتے اور ہماری ہمت افزائی فرماتے۔"

پچھلے دنوں راقم نے اس ادارہ کی دو ایک کتابوں کا تفصیلی تعارف معارف میں کرایا ہے، جی چاہتا ہے کہ سید صاحبؒ کے معارف ہی میں اس ادارہ کی تمام مطبوعات کا سرسری تعارف کرایا جائے تاکہ اہلِ علم کو اس ادارہ کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکے اور وہ ملک کے دوسرے علمی و تحقیقی اداروں کی طرح اس مخلص اور خاموش ادارہ کی طرف بھی اپنی توجہ منعطف کریں۔

۱۳۴۹ھ میں اس ادارہ نے پہلی کتاب "کتاب العالم والمتعلم" شائع کی، اس کے آخر میں عربی اور اردو میں مجلسِ احیاء المعارف النعمانیہ کا تعارف بعنوان بشارت یوں درج ہے :-

اس کا منشور و منشاء

"عامۂ اہلِ اسلام کو عموماً اور علمائے احناف کو خوش خبری دی جاتی ہے کہ حضرت امام الائمہ سراج الامہ امام اعظم رضی اللہ عنہ اور آپ کے اصحاب اور اصحابِ اصحاب کی تصانیفِ مہمہ جواب تک طبع نہیں ہوئیں اور بالکل نایاب ہیں، ان کی طباعت و اشاعت کی غرض سے مجلس احیاء المعارف النعمانیہ قائم کی گئی ہے، جو چند باخیر علماء اور باخیر اصحاب کی ہمتوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے للہ الحمد کہ سب سے پہلے جس کتاب کی اشاعت کی سعادت مجلس ہذا کے حصہ میں آئی وہ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کی تصنیف منیف کتاب العالم والمتعلم ہے، اس کے بعد انشاء اللہ کتاب النفقات للخصاف کی شرح للصدر الشہید شائع ہو گی، نیز کتاب ادب القاضی للخصاف کی شرح للصدر الشہید، جامع کبیر للامام محمد اور مبسوط للامام محمد بہ روایت ابی سلیمان جوزجانی کی طباعت بھی پیش نظر ہے، امید کہ اہلِ علم اور ارباب کرم مجلس ہذا کی اعانت فرمائیں گے، کتاب العالم والمتعلم مقامات مندرجہ ذیل سے طلب کی جا سکتی ہے۔

(الف) دفتر مجلس احیاء المعارف النعمانیہ (شفاخانہ محمودیہ) جلال کوچہ حیدرآباد۔

(ب) جناب مولوی ابوالوفا صاحب رکن مجلس احیاء المعارف النعمانیہ مدرسہ نظامیہ حیدرآباد۔ (ج) محمد اکبر علی معتمد مجلس احیاء المعارف النعمانیہ بازار گھانسی حیدرآباد۔"

یہ اشتہار محمد اکبر علی صاحب معتمد مجلس کی طرف سے ۱۳۴۹ھ میں شایع ہوا ہے اور مجلس کی فہرست میں ۱۳۴۸ھ درج ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۳۴۸ھ میں یہ مجلس مولانا ابوالوفا صاحب افغانی مدرس مدرسہ نظامیہ اور محمد اکبر علی صاحب معتمد مجلس وغیرہ دس ارکان کی کوشش سے قائم کی گئی جس کا بنیادی مقصد ائمہ احناف کی امہات کتب کی اشاعت تھا اور مندرجہ اشتہار کتابیں اس کے ابتدائی اشاعتی نظام میں رکھی گئی تھیں۔

اس کی مطبوعات کا مختصر تعارف

سنہ ۱۳۴۸ھ سے سنہ ۱۳۸۵ھ تک (۳۷ سال کی مدت میں) اس مجلس نے مندرجہ ذیل کتابیں شایع کیں، ہم سلسلہ وار ہر کتاب کا سرسری تعارف مختصر الفاظ میں کراتے ہیں، تفصیلی تعارف مقصود نہیں۔

۱۔ **کتاب العالم والمتعلم**:۔ امام ابوحنیفہؒ کی تالیف ہے، کشف الظنون میں اس کا تعارف اس طرح درج ہے،

یہ کتاب متعلم کے سوال اور عالم کے جواب کے طریقے پر لکھی گئی ہے، جو عقائد و نصائح پر مشتمل ہے، اس کتاب کو ابو مقاتل نے امام صاحب سے روایت کیا ہے، مجلس کے علم میں اس کا ایک قلمی نسخہ رامپور کے شاہی کتب خانہ میں تھا، جو اغلاط سے پُر تھا، مگر اس وقت اس کے دوسرے نسخہ کا پتہ نہیں تھا اسی لیے اس کو اصل قرار دے کر حاشیہ میں جگہ جگہ عبارت کی تصحیح کی گئی۔ بعد میں اس کا ایک نسخہ اور ملا، مگر کتاب چھپ چکی تھی اس لیے دوسری اشاعت میں اس سے استفادہ کا وعدہ کیا گیا غالباً اس کے مصحح و محشی مولانا ابوالوفا صاحب افغانی تھے، یہ کتاب مطبع چشتی حیدرآباد میں ربیع الاول سنہ ۱۳۴۹ھ میں چھپی۔ کل صفحات ۳۱ تھے، تعداد طبع ایک ہزار تھی، کتابت، طباعت اور کاغذ معمولی تھا، جو مجلس کی بے سروسامانی اور مالی دشواری کا نتیجہ تھا۔

۲۔ **شرح کتاب النفقات**:۔ امام ابوبکر احمد بن عمرو بن مہیر الخصاف الشیبانیؒ متوفی سنہ ۲۶۱ھ کی کتاب النفقات کی شرح ہے اور امام ابو محمد حسام الدین عمر بن عبد العزیز بخاریؒ متوفی سنہ ۵۳۶ھ المشہور بالصدر الشہید کی تصنیف ہے، اس کتاب کے دو قلمی نسخے کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ میں تھے، وہاں سے ایک کی نقل دوسرے سے مقابلہ کے بعد منگائی گئی، مگر یہ نسخہ اغلاط سے پُر تھا اس لیے مولانا ابوالوفا افغانی، مولوی سید عبداللہ بن احمد بن شیخ علوی حضرمی اور مولوی رحیم الدین ارکان مجلس نے اس کی تصحیح کی، چونکہ شرح النفقات کی اکثر عبارتیں محیط برہانی سے منقول ہیں اس لیے تصحیح میں اس کتاب سے بڑی مدد ملی، یہ کتاب ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۹ھ میں مطبع دکن لاء رپورٹ حیدرآباد میں چھپی، کل صفحات ۵۶ ہیں، اس میں کتابت طباعت اور کاغذ معمولی ہے،

اس پر حاشیہ مولانا افغانی نے لکھا ہے،

۳ - کتاب الآثار، للامام القاضی ابی یوسف :- یہ کتاب درحقیقت مسند الامام الاعظم ہے، جسے امام ابو یوسف نے امام صاحب سے روایت اور بعض مقامات پر اپنی مرویات، و آرا کا اضافہ کیا ہے۔ اس کو مسند ابی یوسف بھی کہتے ہیں، اس کی روایت امام ابو یوسفؒ کے صاحبزادے ابو محمد یوسف بن یعقوبؒ نے کی ہے، ہندوستان، ترکی، شام اور مصر کے کتب خانوں میں تلاشِ بسیار کے باوجود اس کتاب کا کوئی نسخہ نہ مل سکا، صرف دارالکتب المصریہ میں ایک سقیم وناقص نسخہ ملا، اس میں سقوط اور تقدیم وتاخیر بھی تھی، درمیان کے بعض اوراق غائب تھے۔ کتاب النکاح، کتاب الایمان، کتاب الحدود اور کتاب الشہادت ناقص تھے۔ تقدیم وتاخیر کی وجہ سے کتاب الطہارت میں کتاب الصلوٰۃ کے آثار، کتاب النکاح میں کتاب الطلاق کے آثار اور مختلف الواب وکتب میں ادھر کے آثار ادھر تھے، مولانا ابوالوفا صاحب نے بڑی دقتِ نظر اور محنت شاقہ سے حتی الامکان ان اسقام کی تصحیح کی اس کی روایات وآثار کے دوسری کتبِ حدیث سے حوالے لکھے۔ رواۃ کے ذکر حل لغات اور فقہی تفریعات میں کوشش کی، کہنا چاہیے کہ اس کتاب کی اشاعت ہی سے مجلس کا کام اعلیٰ پیمانہ پر جاری ہوا، ۱۳۵۵ھ میں مصر کے مطبع الاستقامہ میں نہایت اہتمام سے چھپی، کاغذ نہایت عمدہ اور عربی ٹائپ بہترین ہے، قاہرہ میں مجلس کے وکیل رضوان محمد رضوان نے اپنی نگرانی میں چھپوایا۔

کتاب الآثار کے بارے میں ابتدا میں چھ صفحات کا مقدمہ ہے فٹ نوٹ میں باریک ٹائپ میں حواشی ہیں اور آثار پر ترتیب وار نمبر درج ہے اصل کتاب کے صفحات ۲۴۲ ہیں، اس کے بعد ۲۶ صفحات میں فہرس الابواب، فہرس موضوعات اور فہرس اسماء رواۃ ہیں، کل کتاب ۲۶۸ صفحات میں ہے۔

۴ - الجامع الکبیر، للامام محمد بن حسن الشیبانی :- جامع کبیر امام محمدؒ کی وہی

معرکۃ الآرا کتاب ہے جس کے بارے میں امام محمد بن شجاع ثلجی نے فرمایا ہے کہ اسلام میں فقہ کے موضوع پر امام محمد کی جامع کبیر جیسی دوسری کتاب نہیں لکھی گئی، امام محمد کی مثال جامع کبیر میں ایسی ہے کہ کسی آدمی نے ایک محل بنایا، جوں جوں وہ اونچا ہوتا گیا، سیڑھیاں بڑھتی گئیں، یہاں تک کہ جب محل مکمل ہو گیا تو تمام سیڑھیاں گرادیں اور لوگوں سے کہا کہ اب تم اس کے بام و در پر چڑھو، اس عظیم کتاب کی اشاعت کے لیے مجلس نے اسنبول اور مصر کے کتب خانوں کو کھنگالا، استنبول میں ایک کامل نسخہ اور دارالکتب المصریہ میں ایک ناقص نسخہ مل سکا، پھر ہندوستان میں اس کی تلاش کے لیے ٹونک، دہلی، پشاور اور جبال افاغنہ کے کتب خانوں کی خاک چھانی، ٹونک کے کتب خانہ صاحبزادہ عبدالرحیم میں ایک کامل و مکمل نسخہ ملا، مولانا افغانی نے کتب خانہ میں بیٹھ کر اسے نقل کیا، ترکی کے مخطوطہ کی نقل منگوائی اور مصر سے ناقص نسخہ کا فوٹو حاصل کیا، شیخ محمد راغب الطباخ نے حلب سے شرح الجامع الکبیر للعتابی کی نقل روانہ کی، اس طرح جامعہ کبیر محنت شاقہ کے بعد قابل اشاعت ہوئی اور ۱۳۵۶ھ میں مطبعۃ الاستقامہ مصر سے نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین ٹائپ میں چھپ کر شایع ہوئی، طباعت و تصحیح کے نگراں و ذمہ دار مجلس کے مصری وکیل شیخ رضوان محمد رضوان تھے، اس کے کل صفحات ۳۷۶ ہیں۔

۵- کتاب الرد علی سیر الاوزاعی:- یہ امام قاضی ابو یوسف کی تصنیف ہے، امام اوزاعی نے جب امام محمدؒ کی کتاب السیر الصغیر دیکھی تو فرمایا کہ اہل عراق کو سیر و مغازی کے فن سے کیا تعلق، صحابہ تو حجاز و شام میں تھے، عراق نیا شہر ہے، امام اوزاعی نے بھی کتاب السیر لکھی تھی، ان کی اس تنقید کے بعد امام محمد نے اپنی کتاب السیر الکبیر لکھی، جس میں امام اوزاعی کی کتاب السیر کے بعض بعض مقامات کا ضمناً رد لکھا۔ اور امام ابو یوسف نے یہ مستقل رد لکھا، چونکہ امام محمد اور امام ابو یوسف نے سیر المغازی کا فن براہ راست امام ابو حنیفہ سے حاصل کیا تھا، اس لیے انھوں نے امام اوزاعی کی تنقید کو امام صاحب پر طعن قرار دیا اور دونوں حضرات نے اس کا جواب لکھا، اس کتاب کا صرف ایک نسخہ ہندوستان میں مل سکا، اسی کو تصحیح و تعلیق کے بعد شایع کیا گیا، یہ خدمت مولانا افغانی نے انجام دی، ۱۳۵۷ھ

سیر و مغازی اور امام ابو حنیفہ

ہیں مصر میں مجلس کے وکیل رضوان محمد رضوان کی زیر نگرانی شاندار کاغذ، روشن ٹائپ میں چھپی ہے، اور فٹ نوٹ میں مولانا افغانی کے علمی و تحقیقی حواشی ہیں، کل صفحات ۱۳۵ ہیں، اس کے بعد سات صفحات میں فہرست مضامین ہے۔

۶۔ اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ للقاضی الامام ابی یوسف:۔ ابتدا میں امام ابو یوسف امام ابن ابی لیلیٰ سے تعلیم حاصل کرتے تھے، پھر امام ابوحنیفہ کے یہاں پہونچے اور بعد میں اپنے دونوں اساتذہ کے درمیان مختلف فیہ فقہی مسائل کو اس کتاب میں جمع کیا چونکہ امام ابو یوسف نے اس کتاب میں احادیث وآثار مرفوعہ وموقوفہ اور مسندۃ، منقطعہ بلاغات کو بکثرت جمع کیا ہے: اس لیے اس کی بڑی اہمیت ہے، اس کا صرف ایک قلمی نسخہ ہندوستان میں مل سکا اسی کو تعلیق وتصحیح کے بعد شائع کیا گیا، ۱۳۵۸ھ میں مطبعۃ الوفا مصر میں نہایت اچھے انداز میں زیر اشراف رضوان محمد رضوان وکیل مجلس چھپی، ابتدا میں ۸ صفحات کا مقدمہ ہے فہرست کے علاوہ کل صفحات ۲۲۶ ہیں

۷۔ مناقب الامام ابی حنیفہ وصاحبیہ ابی یوسف ومحمد بن الحسن:۔ یہ امام ذہبی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے حالات ومناقب درج کیے ہیں، امام ابوحنیفہ کے مناقب والا حصہ مولانا مفتی محمد سعید شافعی حیدر آبادی کے کتب خانہ سے ملا اور صاحبین کے حالات ومناقب کا حصہ مصر میں علامہ زاہد کوثری کے پاس تھا، مناقب الامام ابی حنیفہ والا حصہ اغلاط سے پر تھا اسی لیے اسے بھی علامہ زاہد کوثری کے پاس بھیج دیا گیا، انہوں نے ہر سہ حصہ کی تعلیق وتصحیح کر کے مجلس کو بھیجدیا، پھر مولانا افغانی نے اس پر حاشیہ لکھا، اسطرح دونوں محققوں کی تعلیق کے ساتھ یہ کتاب ۱۳۶۶ھ میں دار الکتب العربی مصر کے مطبع میں چھپی، امام ابوحنیفہ کا تذکرہ صفحہ ۳۳ تک، اس کے بعد امام یوسف کا حال ۳۷ سے ۴۹ تک اور امام محمد بن حسن کا تذکرہ ۵۰ سے ۶۰ تک ہے، کتاب کے کل صفحات ۹۲ ہیں، رضوان محمد رضوان وکیل مجلس مشرف ہیں، اس کا کاغذ معمولی ہے۔

۸۔ مختصر الطحاوی:۔ یہ مشہور حنفی امام ابوجعفر طحاوی متوفی ۳۲۱ھ کا فقہ پر مختصر مگر نہایت جامع متن ہے، کشف الظنون میں ہے کہ مختصر الطحاوی فی فروع الحنفیہ کو امام طحاوی نے کبیر وصغیر دو کتابوں میں لکھا

اور اس کو امام مزنی شافعی کی کتاب مختصر المزنی کی ترتیب پر مرتب کیا ہے، جامع ازہر مصر کے کتب خانہ میں اس کے دو قلمی نسخے تھے، تیسرا نسخہ آستانہ میں شیخ الاسلام علامہ فیض اللہ کے کتب خانہ میں تھا، مصری نسخہ کو نقل کر کے اسی کو اصل قرار دیا گیا، اور ترکی والے نسخہ کا فوٹو منگا کر مقابلہ کیا گیا، تصحیح و مقابلہ اور تعلیق مولانا افغانی نے کی، یہ کتاب ۱۳۷۰ھ میں مطبعہ دار الکتب العربی مصر میں عمدہ طباعت کے ساتھ چھپی ہے، کل صفحات ۴۰۷ ہیں، اگر مختصر القدوری کی جگہ ہمارے مدارس میں اسے رواج دیا جاتے تو بہت فائدہ ہو، اس میں بہت سے مسائل و فروع نادر ہیں اور طرز بیان اور ترتیب بھی بہت اچھی ہے۔

۹۔ اصول السرخسیؒ دو حصے: یہ امام ابوبکر محمد بن احمد بن ابی سہل سرخسیؒ متوفی ۴۹۰ھ کی اصولِ فقہ پر اہم ترین کتاب ہے، ابتداء میں پتہ چلا کہ حلب کے مدرسہ عثمانیہ اور کتب خانہ احمدیہ میں اس کے دو نسخے موجود ہیں، علامہ محمد راغب الطباخ نے نقل اور مقابلہ کر کے ایک نسخہ روانہ فرمایا، پھر تیسرا نسخہ حیدر آباد میں مولانا محمد سعید صاحب کے کتب خانہ میں ملا، کتاب کی طباعت کے آخری ایام میں دوسرے متعدد نسخوں کا بھی پتہ چلا، اصول السرخی اصولِ فقہ پر نہایت جامع و ضخیم کتاب ہے۔ مولانا افغانی کی مختصر تعلیق و تصحیح کے بعد مطبعہ دار الکتب العربی مصر میں ۱۳۷۲ھ میں رضوان محمد رضوان کی زیر نگرانی دو حصوں میں چھپی، حصہ اول کے صفحات ۳۴۶ اور حصہ دوم کے ۳۸۷ ہیں۔ حسامی اور نور الانوار کی جگہ اس کتاب کا رواج بہت مفید ہو سکتا ہے۔

۱۰۔ النکت للسرخسی شرح لزیادات للامام محمدؒ۔

۱۱۔ و شرح الزیادات للعتابی:۔

امام محمدؒ نے جامع کبیر کی تصنیف کے بعد چند ایسے فروع کو جن کا ذکر اس میں نہیں تھا زیادات کے نام سے یکجا کیا، اس کے بعد اسی قسم کے کچھ مزید فروع کو زیادات الزیادات کے نام سے مدون کیا، النکت زیادات الزیادات کی شرح ہے، جسے امام سرخسی نے لکھا ہے، اور دوسری شرح زیادات کی ہے، جو امام زین الدین ابو نصر احمد بن محمد بخاری عتابیؒ متوفی ۵۸۶ھ کی تصنیف ہے، شرح سرخسی کے قلمی نسخے ترکی کے کتب خانہ شیخ الاسلام فیض اللہ، کتب خانہ سلطان محمد فاتح اور کتب خانہ شیخ الاسلام

ولی الدین میں تھے، ان کے فوٹو منگائے گئے، اور تینوں سے مقابلہ کے بعد نسخہ مکمل کیا گیا، شرح عتابی کا نسخہ ترکی کے کتب خانہ جورلیلی اور کتب خانہ شہید علی پاشا میں تھا، اس کا عکس منگایا گیا، اور دونوں شرحوں کو ایک ساتھ اس طرح چھاپا گیا کہ ایک صفحہ پر پہلے شرح سرخسی اور اس کے حواشی کو رکھا گیا۔ پھر شرح عتابی اور اس کے حواشی درج کئے گئے، اس مجموعہ کی طباعت ۱۳۷۳ھ میں حیدرآباد میں نہایت عمدہ عربی ٹائپ میں ہوئی، کیونکہ مشکلات کی وجہ سے مصر میں مجلس کی کتابوں کی طباعت کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا، کل صفحات ۴۸۰ ہیں، اس کے بعد ۲۵ صفحات میں مختلف فہرستیں اور چار صفحات میں صحت نامہ ہے

۱۲۔ کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ یہ امام محمد کی بڑی معرکہ کی کتاب ہے، اس پر راقم کا تفصیلی تبصرہ گزر چکا ہے، امام محمد نے اس کتاب میں امام مالک اور دوسرے علمائے مدینہ منورہ کے اور امام ابوحنیفہ اور علمائے عراق کے فقہی اختلافات میں اہل مدینہ کے مقابلہ میں اہل عراق کا اقرب الی الاحادیث والآثار ہونا ثابت کیا ہے، اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ حنفی فقہ اہل الرائے نہیں بلکہ فقہ اہل الحدیث ہے کتب خانہ مدینہ منورہ میں اس کا ایک نسخہ ملا جو ناقص وسقیم تھا، اس میں تقدیم وتاخیر بھی تھی، اور تحریفات وبیاضات بھی تھے، پھر ترکی کے کتب خانہ نور عثمانیہ میں ایک نسخہ کا پتہ چلا، مگر وہ مدینہ منورہ والے نسخہ کی نقل تھا، اور خود حیدرآباد میں مولانا انوار اللہ صاحب کے کتب خانہ میں ایک نسخہ تھا جو زیادہ صحیح تھا، اسی کو اصل قرار دے کر اصل نسخہ مرتب کیا گیا، اس کتاب کی تصحیح وتعلیق مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری نے کی ہے، حاشیہ کیا ہے، بہترین مکمل شرح ہے، ۱۳۸۵ھ میں اس کا پہلا حصہ حیدرآباد میں عربی ٹائپ میں چھپا ہے، کل صفحات ۵۹۰ ہیں، تین چار جلدوں میں یہ کتاب مکمل ہوگی، (اس کی دوسری اور تیسری جلد بھی چھپ گئی ہے اور چوتھی جلد باقی رہ گئی ہے)

مجلس احیاء المعارف کی مطبوعات میں یہ آخری کتاب ہے تقریباً ۴ سال کی قلیل مدت میں اس مجلس نے ائمہ احناف کی امہات کتب کے ۴۳ سو سے زائد صفحات دنیائے اسلام کے سامنے پیش کئے ہیں، مولانا افغانی اس مجلس کے جزوکل ہیں، سادات ومشائخ افاغنہ کے اس بزرگ کا عہد پیری مجلس

کے لیے عہدِ شباب کی باتیں کرتا ہے، ضرورت ہے کہ اہلِ علم مجلس کے ان دینی و علمی اور فقہی نوادر کی قدر کریں اور اس کی مطبوعات و منشورات سے فائدہ اٹھائیں، سرمایہ کی کمی اور ہماری ناقدری کی وجہ سے اس کے بہت بڑے کام رکے ہوئے ہیں۔

اپنوں کی ناقدری اور غیروں کی قدردانی

آخر میں اپنوں کی ناقدری اور غیروں کی قدر دانی کے دو عبرت انگیز واقعات سنیے، مولانا افغانی نے ان کو خود راقم سے بیان کیا ہے، ۱۳۷۰ھ میں مختصر الطحاوی چھپی، جس کی قیمت دس روپئے تھی، مگر دو سال کے بعد پندرہ روپئے ہوگئی، ایک مرتبہ مولانا بمبئی تشریف لائے، تو راقم نے معمول کے خلاف اس کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ دریافت کی، مولانا نے فرمایا، بات یہ ہوئی کہ ہمارے مصری وکیل شیخ رضوان محمد رضوان نے مختصر الطحاوی کے کچھ نسخے نمونہ کے طور پر امریکہ کی یونیورسٹیوں اور کتب فروشوں کے یہاں بھیجے، چند دنوں کے بعد وہاں سے اس کی مانگ بہت زیادہ بڑھ گئی کیونکہ اب یورپ اور امریکہ کے تعلیم یافتہ اور مشرقیات سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ علم کا عام رجحان یہ ہو گیا ہے کہ اسلام کو اس کے اصلی خدوخال میں سمجھنے کے لیے قدیم ائمہ اسلام کی کتابوں کو دیکھنا چاہتے ہیں، جن کا ذہن و مزاج خالص اسلامی تھا اور جو اسلامی علوم و فنون کو سیدھے سادے انداز میں الفاظ و عبارات اور فرق و ملل کے خارجی اثر و رجحان کے بغیر کتابیں لکھتے تھے، اسلام کی سچی تصویر ان ہی کی کتابوں میں مل سکتی ہے، اسی لیے اب وہاں قدیم سے قدیم تر اسلامی ماخذوں کی تلاش ہو رہی ہے، چنانچہ اسلامی فقہ اور تشریعی قوانین کی تحقیق کے سلسلے میں مختصر الطحاوی بھی ان کی خصوصی توجہ کا مرکز بن رہی ہے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ لجنۃ احیاء المعارف کی ایک کتاب مولانا نے بڑی عقیدت سے قدردانی کی امید پر حیدرآباد کے ایک بہت بڑے عالم کو پیش کی اور اپنے قلم سے اس پر ہدیہ کی عقیدتمندانہ عبارت بھی، چند دنوں کے بعد بمبئی کے ایک تاجر کتب حیدرآباد پرانی کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں گئے، اور ایک دکان سے پرانی کتابوں کا ایک ڈھیر خرید کر لائے، اتفاق سے وہ مولانا ہی کے یہاں ٹھہرے تھے، جب انہوں نے ان کتابوں کی چھان بین کی تو ان میں وہ کتاب بھی تھی جس کے اوراق بھی ابھی کاٹے نہیں گئے تھے، انہوں نے فوراً یہ کتاب لے جا کر مولانا کے سامنے پیش کر دی، اور مولانا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

تمام شد